

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ

» انسان نے کیا سوچا؟ کا دوسرا حصہ

خُدا نے کیا کہا؟

يَعْنُوكَ

اسلام کیا ہے؟

جو خدا کی طرف سے نوعِ انسان کے لئے بطورِ نظامِ زندگی عطا ہوا تھا اور جس سے کاروانِ انسانیت نے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنا تھا

پرویز

شائع کردہ

طلوعِ اسلام پبلسٹس، بی۔گنگ۔۲، لاہور

جملہ حقوق محفوظ

اسلام کیا ہے؟	_____	نام کتاب
پرویز	_____	مصنف
طلوع اسلام ٹرسٹ	_____	شائع کردہ
25-B گلبرگ 2 لاہور-54660	_____	
email: trust@toluislam.com	_____	
web: www.toluislam.com	_____	
1964ء	_____	ایڈیشن اول
اپریل 2002ء	_____	ایڈیشن ہفتم
دوست ایسوسی ایٹس	_____	طابع
عالمین پریس لاہور	_____	مطبع

ISBN 969-8164-03-0

طلوع اسلام ٹرسٹ کی کتب سے حاصل شدہ جملہ
آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے

فہرست ابواب

اسلام کیا ہے؟

۱ دین کی بنیاد

۲ انسانی ذات

۳ سرچشمہ ہدایت

۴ عقل اور دین

۵ قانون کی کار فرمائی

۶ مکافاتِ عمل

۷ نجات

۸ حیاتِ جاوداں

۹ انسانی ذات کی نشوونما کا اصول

۱۰ نظامِ ربوبیت

۱۱ نظامِ ربوبیت کے عقلی دلائل

۱۲ دین - بحیثیت سیاسی نظام

۱۳ قوموں کے عروج و زوال کے ابدی قوانین (تقدیرِ اُمم)

۱۴ انسان اور خارجی کائنات

۱۵ مستقل اقدارِ حیات

۱۶ عورت

وَ اٰخِرُ دَعْوَانَا اِنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

پیش لفظ

(پہلا ایڈیشن)

کچھ عرصہ ہوا، اسلام کو اس کے صحیح رنگ میں پیش کرنے کے لئے میں نے ایک تصنیفی اسکیم سوچی تھی۔ اور وہ یہ کہ پہلے نہایت غیر جانبدارانہ طور پر بتایا جائے کہ زندگی کے اہم مسائل کا حل تلاش کرنے میں تنہا عقل انسانی نے (وحی کی مدد کے بغیر) آج تک کیا کچھ کیا ہے اور کیا وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکی ہے؟ اگر اس نے ان مسائل حیات کا اطمینان بخش حل دریافت کر لیا ہو تو پھر کسی اور (فوق العقل) ذریعہ علم کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ لیکن اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئی ہو تو پھر یہ دیکھنا چاہیے کہ فوق العقل سرچشمہ علم (یعنی وحی خداوندی) نے، جو اب اپنی حقیقی شکل میں شہ آں کریم کے اندر محفوظ ہے، ان مسائل کا حل کیا بتایا ہے۔ چنانچہ اس اسکیم کے تحت اس سلسلہ کی پہلی کڑی ”انسان نے کیا سوچا“ کے نام سے، ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی جس میں حکمائے یونان سے لے کر عصر حاضر کے مفکرین، مؤرخین اور سائنس دانوں کی تحقیقات پیش کر کے، یہ دکھایا گیا تھا کہ اس قدر کد و کاوش کے باوجود وہ کس طرح اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ زندگی کے اہم مسائل کا حل دریافت کر لینا تنہا عقل انسانی کے بس کی بات نہیں۔ اس کے بعد اس سلسلہ کی اگلی کڑی سامنے آئی تھی جس کا نام —

”خدا نے کیا کہا“ تجویز کیا گیا تھا۔ اس دوران میں اکثر احباب کی طرف سے کہا گیا کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک خود مکتفی کتاب میں یہ بتایا جائے کہ اسلام ہے کیا، کیونکہ اس باب میں متعین طور پر کہیں سے کچھ نہیں ملتا اور (غیر مسلم تو ایک طرف) خود مسلمانوں کے سامنے بھی دین کا واضح تصور نہیں ہے۔ اس قسم کی کتاب کا خود مجھے بھی شدت سے

احساس تھا اور میرا خیال تھا کہ اس سلسلہ سے فارغ ہونے کے بعد اس جدید کتاب کی طرف توجہ دوں گا لیکن جب میں نے "خدا نے کیا کہا" کو ترتیب دینا شروع کیا تو میں نے محسوس کیا کہ اگر اس میں تھوڑی سی تبدیلی کر دی جائے تو یہ وہی تصنیف بن سکتی ہے جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ میں نے اس کتاب کی ترتیب پر از سر نو غور کیا اور اسے اس انداز سے لکھنا شروع کیا جس سے یہ ایک طرف "انسان نے کیا سوچا" کی دوسری کڑی قرار پا جائے اور دوسری طرف خود مکتفی کتاب بن جائے جسے یہ کہہ کر پیش کیا جاسکے کہ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ _____ اسلام کیا ہے۔ چنانچہ یہ کتاب پیش خدمت ہے۔ اس میں بعض مقامات پر مغربی مفکرین کے ان اقوال کا پیش کرنا ضروری سمجھا گیا جنہیں "انسان نے کیا سوچا" میں درج کیا گیا ہے۔ ان مقامات پر بجائے اس کے کہ یہ کہہ دیا جاتا کہ ان اقتباسات کو اس کتاب میں دیکھا جائے انہیں پورے کا پورا درج کر دیا گیا ہے تاکہ زیر نظر موضوع فی ذاتہ مکمل ہو جائے۔

ہمارا یہ دعوئے ہے (اور یہ دعوئے ہمارے ایمان پر مبنی ہے) کہ اسلام، خدا کی طرف سے عطا شدہ، آخری اور مکمل دین ہے جو نوع انسان کی تمام مشکلات، یعنی زندگی کے تمام بنیادی مسائل کا حل اپنے اندر رکھتا ہے لیکن جب ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہوں کہ اسلام کیا ہے، تو اس کے جواب میں مختلف گوشوں سے مختلف آوازیں آنی شروع ہو جاتی ہیں اور جب ان آوازوں کو یکجا کیا جائے تو ان کا حاصل نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کے مسائل سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ اب ظاہر ہے کہ جس اسلام کا تصور صرف اس قدر ہو وہ (تمام نوع انسان کی مشکلات تو ایک طرف خود) مسلمانوں کی مشکلات کا حل بھی پیش نہیں کر سکتا۔ اسلام ایک نظام زندگی ہے جس کی بنیادیں چند محکم اور غیر متبادل تصورات پر قائم ہیں۔ جب تک یہ بنیادی تصورات، واضح، غیر مبہم اور متعین طور پر سامنے نہ آئیں، یہ سمجھ میں نہیں آسکتا کہ وہ نظام زندگی ہے کیا جسے اسلام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جو زندگی کے اہم مسائل کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ زیر نظر کتاب میں، میں نے انہی تصورات کو پیش کیا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ ان تصورات کی جنہیں اسلام کی بنیاد کہہ کر پیش کیا گیا ہے، سند کیا ہے؟ اس سوال کا جواب آسان ہے۔ قرآن کریم، اسلام کا ضابطہ قوانین ہے۔ دین اُس کے اندر مکمل اور محفوظ کر دیا گیا ہے۔ لہذا اسلامی تصورات وہ ہیں جن کی سند قرآن کریم سے مل جائے۔ میں نے ان تصورات کو اپنی بصیرت کے مطابق قرآن ہی سے اخذ کیا ہے اور انہیں قرآنی سند کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ ہو سکتا

ہے کہ قرآن کریم کے کسی مفہوم کو صحیح طور پر سمجھنے میں میری بصیرت غلطی کر گئی ہو، (اس لئے کہ یہ بہر حال ایک انسانی کوشش ہے جس میں سہو و خطا کا امکان ہے) لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ میں نے کسی غیر قرآنی تصور کو دانستہ قرآنی کہہ کر پیش کر دیا ہو۔ ایسا کرنا میرے نزدیک شرک ہے جس سے بڑا جرم خدا کی عدالت میں اور کوئی نہیں۔

جیسا کہ میں ایک عرصہ سے کہتا چلا آ رہا ہوں 'اسلام' دین ہے۔ مذہب نہیں۔ اور دین اور مذہب میں جو بنیادی فرق ہے اسے میں نے مختلف مواقع پر بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے۔ اس مقام پر اس قدر سمجھ لینا کافی ہوگا کہ خدا کے رسول، دین کو اس کی اصلی شکل میں وحی کے ذریعے پیش کرتے تھے۔ ان کے بعد ان کے نام لیوا، اس دین میں تخریف کر دیتے تھے۔ اکثر اپنی مفاد پرستیوں کے لئے 'دیدہ دانستہ' لیکن بعض نادانستہ طور پر بھی۔ دین کی اس محرف صورت کو مذہب کہا جاتا ہے۔ انبیائے سابقہ کی طرف سے پیش کردہ دین کی طرح اسلام کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا اور اسے بھی اس کے نام لیواؤں نے رفتہ رفتہ دین کی بلند سطح سے نیچے اتار کر مذہب بنا دیا۔ مذہب بن کر 'اسلام' ایک جیتے جاگتے، متحرک، اور کاروانِ انسانیت کو اس کی منزل مقصود کی طرف لے جانے والے نظامِ حیات کے بجائے چند بے جان عقائد اور بے روح رسومات کا مجموعہ بن کر رہ گیا۔ اس کا نتیجہ یہی نہیں ہوا کہ اس مذہب کی پرستار قوم، زندگی کی تمام خوشگوار یوں سے محروم ہو گئی، بلکہ خود انسانیت کا کارواں صحیح راستے پر نہ چل سکا (جب دین کی مشعل ہی اس کے سامنے نہ آئی تو وہ صحیح راستے پر چل کیسے سکتا تھا)۔ یہ وجہ ہے کہ آج تمام اقوامِ عالم، اضطراب انگیز اور سکون سونے جہنم کے عذاب میں مبتلا ہیں جس سے نکلنے کا کوئی راستہ انہیں نظر نہیں آتا۔

اگرچہ اسلام کو اس کے نام لیواؤں نے (دانستہ یا نادانستہ) مذہب میں تبدیل کر دیا لیکن اس میں اور مذہب عالم میں ایک بنیادی فرق ہے۔ اور یہی وہ فرق ہے جس سے کاروانِ انسانیت کو صحیح راستے مل جانے کی امید ہو سکتی ہے۔ بلکہ یقینی ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ دین اسلام کا ضابطہ قوانین قرآن کریم۔ اپنی اصلی اور غیر محرف شکل میں انسان کے پاس موجود ہے۔ لہذا یہ جب چاہیں اس مذہب کو پھر سے دین میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ میری حقیر سی کوشش یہی رہی ہے (جس میں 'میں' گزشتہ پچیس تیس برس سے مسلسل مصروف ہوں) کہ دین خداوندی سے غیر قرآنی عناصر کو الگ کر کے اسے پھر اس کی حقیقی اور منزه شکل میں دنیا کے سامنے پیش کر سکوں، تاکہ اس سے خود امت مسلمہ اپنا کھویا ہوا مقام از سر نو حاصل کر سکے اور کاروانِ انسانیت زندگی کے صحیح راستے پر گامزن ہو سکے۔ زیر نظر کتاب بھی میری اسی کوشش نامتام کی ایک کڑی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس کتاب کو ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ (مذہب گزیدہ) طبقہ کے ہاتھوں میں دے دیا جائے تو وہ 'دل اور دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ' علی وجہ بصیرت

اسلام کے گردیدہ ہو سکتے ہیں۔ نیز اگر اسے غیر مسلموں تک پہنچا دیا جائے تو اسلام کے متعلق ان کی غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں۔ جہاں تک ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا تعلق ہے، انہیں ہم ایک طرف، آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت، ہیگل کا فلسفہ تاریخ، فرائد کا علم النفس اور دہانت بیڈ کی فلاسفی پڑھاتے ہیں، اور دوسری طرف، اسلامیات میں انہیں وہی تو ہم پرستی پر مبنی پارینڈا ستائیں، بے مقصد رسوم اور بے روح عقائد کی تعلیم دے کر سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے انہیں دین کی حقانیت کا قائل کر دیا اور یہ بچے مسلمان بن جائیں گے۔ اس سے وہ ”بچے مسلمان“ تو بننے سے رہے، البتہ اسلام کے متعلق ان کے شکوک و شبہات ضرور پکے ہو جاتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کو عصر حاضر کے علوم کی روشنی میں پیش کر کے انہیں بتایا جائے کہ جس مقام تک پہنچ کر انسانی فکر رک جاتی ہے، دین انہیں اس مقام سے کس طرح آگے لے جاتا ہے۔

جہاں تک غیر مسلموں کا تعلق ہے، اسلام کے متعلق ان کا علم، ہماری ان قدیم کتابوں پر مبنی ہوتا ہے جن میں ہر قسم کی رطب و یابس روایات اور بعید از علم و عقل خرافات درج ہوتی ہیں۔ چونکہ ہم نے ان کتابوں کو تقدیس کا درجہ دے رکھا ہے اس لئے وہ اسلام کے لئے سند قرار پا چکی ہیں۔ ان کتابوں سے حاصل شدہ اسلام یقیناً ایسا ہوگا جس سے ہر صاحب فکر سلیم دور بھاگے۔ ان لوگوں کے سامنے، قرآن کریم کا عطا کردہ اسلام پیش کیجئے اور پھر دیکھئے وہ کس طرح اس کے سامنے سر جھکا دینے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ میں نے اس کا تجربہ کر کے دیکھا ہے۔

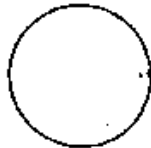
مجھے امید ہے کہ میری یہ کوشش اس مقصد کو پورا کرنے میں کامیاب ثابت ہوگی۔ آخر میں میں ان الفاظ کو پھر دہرا دینا چاہتا ہوں جو میں نے — ”انسان نے کیا سوچا“ — کے اخیر میں لکھے تھے کہ

اگر میری ان کوششوں سے چند نفوس بھی ایسے پیدا ہو گئے جن کے دل میں قرآن کی راہ نمائی کا یقین علیٰ وجہ البصیرت ابھر آیا تو میں سمجھوں گا کہ مجھے پیری دیدہ ریزیوں اور جگر سوزیوں کا صلہ مل گیا۔

پرورینہ

۲۵، بنی گلبرگ ۲، لاہور۔

(ستمبر ۱۹۶۴ء)



دین کی بنیاد

آپ تاریخ انسانی کے کسی دور سے گزریئے اور دنیا کے کسی خطہ پر نگاہ ڈالئے، ایک چیز آپ کو ہر مقام ہر قوم اور ہر زمانے میں بطور قدر مشترک ملے گی۔ یعنی لوگوں نے کوئی نہ کوئی ہستی (کوئی محسوس چیز یا غیر مرئی و غیر محسوس تصوراتی قوت) ایسی تجویز کر رکھی ہوگی جس کے سامنے وہ جھکتے ہوں۔ جس کی پرستش کرتے ہوں۔ جس کے غصے اور ناراضگی سے ڈرتے ہوں اور جس کی خوشنودی کو اپنے لئے وجہ برکت و سعادت سمجھتے ہوں۔ متمدن اقوام اور مہذب ممالک تو ایک طرف اگر آپ کسی ایسے جزیرے میں چلے جائیں جہاں اس سے پہلے (تاریخ کی یادداشت میں) کسی باہر کے آدمی نے قدم تک نہ رکھا ہو، تو وہاں کی آبادی دیگر امور میں خواہ دوسرے انسانوں سے کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہو، اس قدر مشترک میں وہ بھی مذہب کی عالمگیریت | ان کی برابر کی شریک ہوگی۔ مشہور یونانی مؤرخ پلوٹارک (م ۱۰۰ء) نے بالکل صحیح کہا ہے کہ

زمین پر چلتے پھرتے تم ایسے شہر بھی دیکھو گے جن کی دیواریں نہیں ہیں۔ ایسے بھی جن میں سانس کی کوئی علامت دکھائی نہیں دیتی۔ ایسے بھی جہاں حکمران کوئی نہیں۔ ایسے بھی جہاں نہ محلات ہیں نہ خزانے۔ نہ ورزش گاہیں ہیں نہ تھیٹر۔ لیکن تم کوئی ایسا شہر نہیں پاؤ گے جہاں دیوتاؤں کے مندر نہ ہوں۔ جہاں دعائیں نہ مانگی جاتی ہوں۔ جہاں منتیں نہ مانی جاتی ہوں۔ جہاں پیشگوئیاں نہ کی جاتی ہوں۔ ایسا شہر نہ آج تک کسی انسان نے دیکھا ہے نہ کبھی دیکھنے میں آئے گا۔

انسان کی اسی ذہنیت یا روش کو جس میں اس نے اپنے لئے کسی "شے" (یا قوت) کو پرستیدہ (OBJECT OF

(WORSHIP) کی حیثیت دے رکھی ہو، عام طور پر مذہب کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

لیکن مذہبی جذبہ یا تصور کی اس عالمگیریت کے باوجود یہ حقیقت کچھ کم تعجب خیز نہیں کہ آج تک یہ متعین نہیں ہو سکا کہ مذہب کسے کہتے ہیں۔ عوام تو درکنار دنیا کے بڑے بڑے مفکرین، مورخین اور مصنفین نے مذہب کی تعریف (DEFINITION) متعین کرنے میں بڑی کدوکاوش سے کام لیا ہے، لیکن ان میں سے کسی کی بیان کردہ تعریف نہ تو

کسی دوسرے کی تعریف سے ملتی ہے اور نہ ہی کوئی ایسی جامع تعریف وضع کی جاسکتی ہے جو مذہب کے تمام متنوع تصورات کو پوری طرح محیط ہو۔ مثلاً کانٹ کے نزدیک ”ہر فریضہ کو خدائی حکم سمجھنا“

مذہب کی تعریف

مذہب ہے FRIEDRICH SCHIELER MAEHER کے خیال میں ”ہر انفرادی شے کو ایک عظیم کل کا جزو سمجھنا اور ہر محدود شے کو لامحدود کا نمایندہ قرار دینا“ مذہب ہے۔ (HOFFDING) کے

ز نزدیک مذہب ”اقدار کی مداومت“ کا نام ہے۔ ولیم جیمز کہتا ہے کہ انفرادی اشخاص کے عالم تنہائی کے وہ جذبات، اعمال اور تجربات جن کی بابت وہ سمجھیں کہ ان کا رشتہ اس شے سے ہے جسے وہ اپنی دانست میں خدا کہتے ہیں، مذہب کہلاتے ہیں۔

لیا ہے کہ اس کے زور سے وہ کائنات کو مسخر کر لے گا۔“ پروفیسر وائٹ ہیڈ A.N. WHITEHEAD نے مذہب کے متعلق مختلف مقامات پر مختلف تصریحات کی ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے کہ ”انسان جو کچھ اپنی ذات کی تنہائی سے کرتا ہے مذہب ہے“ دوسری جگہ کہتا ہے کہ ”مذہب عقیدہ کی اس قوت کا نام ہے جس سے انسان کو اندرونی پاکیزگی حاصل ہو جاتی ہے“ ایک

اور مقام پر کہتا ہے کہ ”مذہب عالمگیر وفا شعاری WORLD-LOYALTY کا نام ہے“ وہ اپنی تصنیف (SCIENCE AND THE MODERN WORLD) میں مذہب سے متعلق تصور کو زیادہ وضاحت سے بیان کرتا ہے جہاں وہ

لکھتا ہے کہ

مذہب اُس شے کا تصور ہے جو انسان کے آگے پیچھے اور اس کے اندر ہے۔ وہ شے جو ہر سامنے کی چیز میں گزر رہی ہے۔ وہ شے جو حقیقت ہے لیکن حقیقت بننے کے لئے منتظر بھی ہے۔ وہ شے جو ایک بعید سا امکان ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہمارے پیش نظر حقائق میں سب سے عظیم حقیقت بھی۔ وہ شے جو ہر چیز میں مفہوم پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہ اس کا احاطہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ وہ شے جس کا پالینا زندگی کا آخری مقصود ہے لیکن جسے ہر کوئی پانہیں سکتا۔ وہ شے جو آخری مطلع نگاہ ہے لیکن اس کے ساتھ ہی کوشش ناکام بھی۔

ڈاکٹر گیڈوے (GEORGE GALLOWAY) اپنی کتاب (THE PHILOSOPHY OF RELIGION) میں لکھتا ہے۔

جب ہم مذہبی شعور کے نفسیاتی عناصر اور جس انداز سے وہ عمل پیرا ہوتے ہیں، اس کو ہمیشہ نظر رکھتے ہیں، تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ”مذہب“ کی بعض تعریفیں ناقص بھی ہیں اور ایک طرفہ بھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب کے کسی ایک درجہ پر تو ان کا اطلاق ہو سکتا ہے لیکن دیگر مدارج پر نہیں ہو سکتا۔ یا یہ کہ وہ مذہب کے بعض اہم گوشوں کو نظر انداز کر دیتی ہیں۔ میکس ملرنے مذہب کے متعلق کہا ہے کہ ”یہ ایک ایسی ذہنی صلاحیت ہے جس سے انسان غیر محدود (قوت) کا ادراک کر سکتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ مذہب کی یہ تعریف قدیم زمانے کے مذاہب پر راست نہیں آئے گی۔ دوسری طرف، نشوونما یافتہ مذاہب کی کتنی ہی باتیں ہیں جن کو یہ محیط نہیں۔ پروفیسر ٹیلرنے مذہب کی تعریف ان مختصر الفاظ میں بیان کی ہے۔ یعنی ”روحانی ہستیوں پر ایمان“۔ یہ تعریف اگرچہ مذہب کے بہت سے گوشوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ لیکن پھر بھی بہت کچھ اس دائرہ باہر رہ جاتا ہے۔ پروفیسر مینزیز کی تعریف اس سے زیادہ جامع ہے۔ یعنی ”احتیاج کے احساس سے روحانی ہستیوں کی پرستش“۔ اس کے برعکس جب ہانڈنگ کہتا ہے کہ مذہب سے مراد ”اقدار کے تحفظ و ارتکاز پر ایمان“ ہے، تو اس سے مذہب کی غایت کے متعلق ایک فلسفیانہ تصور سامنے آتا ہے۔ عملی زندگی سے اس کا کیا تعلق ہے اس کی بابت کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ (صفحہ ۱۸۰)

اس کے بعد وہ اپنی (DEFINITION) ان الفاظ میں پیش کرتا ہے۔

”انسان کا ایک ایسی قوت پر ایمان جو اس سے خارج میں اپنا وجود رکھتی ہے۔ اس کے ذریعے وہ اپنے جذباتی تقاضوں کی تسکین اور زندگی کا استحکام چاہتا ہے۔ اور وہ اپنے اس ایمان کا مظاہرہ پرستش وغیرہ کی رو سے کرتا ہے۔“

ان چند مثالوں سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ نہ صرف یہ کہ مذہب کے متعلق مختلف تعریفیں ایک دوسرے نہیں ملتیں، کوئی ایک تعریف بھی نہ ایسی جامع ہے جو اس ضمن میں مختلف تصورات اپنے آغوش میں لئے ہو اور نہ ایسی واضح کہ جس سے بات سمجھ میں آسکے۔ یہی وجہ ہے کہ مشہور روسی مفکر اوپنسکی (P.D. OUSPENSKY) نے اپنے استاد روس کے صوفی، گرجیف (G. GURDJIEFF) کی زبان سے کہا ہے کہ

مذہب ایک انسانی تصور ہے۔ جس قسم کی انسان کی اپنی سطح ہو گی اسی قسم کا اس کا مذہب ہو گا۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی کا مذہب دوسرے آدمی کے لئے قطعاً موزوں نہ ہو۔

مذہب کے متعلق ان مختلف تصورات کو یکجا کیا جائے تو بہ ہیئت مجموعی ان میں ایک ایسا تصور نکل آئے گا جسے قدر مشترک قرار دیا جاسکے۔ یعنی کسی مافوق الفطرت ہستی یا قوت کا تصور (جسے عام طور پر "خدا" کہا جاتا ہے) اگرچہ ایسے مذاہب بھی ہیں جو خدا کے بھی قائل نہیں۔

قدر مشترک

لیکن جو دشواری مذہب کی تعریف کے متعلق پیش آتی ہے اس سے کہیں زیادہ دشواری خدا کی تعریف (DEFINITION) کے سلسلے میں سامنے آتی ہے۔ اس باب میں بھی کسی مفکر کا تصور دوسرے سے نہیں ملتا۔ مثلاً کائنات

کے نزدیک "خدا وہ ہے جو انسانوں کو اخلاقی ضابطہ دیتا ہے" ولیم جیمز خدا کو "کائنات کا حصہ اعلیٰ" قرار دیتا ہے۔ میٹھیو آرنلڈ کہتا ہے کہ "خدا اس قوت کا نام ہے جو خیر کا سبب ہے"۔ سز جیمس جیننز کے نزدیک "خدا سب سے بڑا ریاضی دان ہے"۔ برگسٹن کے نزدیک (اس کے ابتدائی ایام میں) خدا سے مفہوم "تخلیقی توانائی" تھا۔ لیکن آخر میں اس پر باطنیت

(MYSTICISM) غالب آگئی تو اس نے کہا کہ "خدا محبت ہے اور محبوب"۔ ان چند مثالوں سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی کہ (مذہب کی طرح) "خدا" کے صحیح تصور کے متعلق بھی مفکرین کسی ایک

خدا کا تصور

نتیجے پر نہیں پہنچے۔ ان میں سے ہر ایک کا تصور الگ اور تعریف (DEFINITION) جداگانہ ہے۔ یہ اس لئے کہ جب یہ لوگ خدا کے متعلق بات کرتے ہیں تو یہ بات خدا کے متعلق نہیں ہوتی بلکہ اس تصور کے متعلق ہوتی ہے جو یہ خدا کے متعلق اپنے ذہن میں رکھتے ہیں۔ اور چونکہ ہر فرد کے ذہن کا تراشیدہ تصور الگ ہوتا ہے اس لئے ایک کا تصور دوسرے سے نہیں مل سکتا۔ شیخ کے الفاظ میں "ایک فرد اور دوسرے فرد کا خدا جداگانہ ہوگا۔ حتیٰ کہ ایک فرد کے احساسات و جذبات کی مختلف حالتوں میں بھی اس کا خدا مختلف ہوگا۔ ہر انسان اپنے جذبات کے تعمیر کردہ مندر کا پجاری ہے"۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ انسان کے ذہن میں خدا (یعنی کسی مافوق الفطرت ہستی یا قوت) کا خیال پیدا کیسے ہوا، مغرب کے علمائے عمرانیات کا (آج سے کچھ عرصہ پہلے تک) یہ خیال تھا (اور اب بھی وہاں اس خیال کے مؤید لوگ ملتے ہیں کہ) جب ابتدائی دور کے انسان نے (جب اس کا شعور ہنوز عہد طفولیت میں تھا) یہ دیکھا کہ بعض حوادث ایسے آتے ہیں جن کے علل و اسباب کا اسے کوئی پتہ نہیں چلتا (مثلاً بجلی کی گڑک، بادلوں کی گرج، طوفانِ باد و باراں، زلزلے، وبائی امراض وغیرہ) تو اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہونہ ہوا ان حوادث کے پیچھے کوئی بڑی بڑی قوتیں ہیں جو دکھائی نہیں دیتیں۔ اس سے اس کے ذہن میں "خدا" (دیوی، دیوتاؤں) کا تصور پیدا ہوا۔ یہ تصور مختلف ممالک کے احوال و ظروف اور مختلف

اقبال کے احوال و کوائف کے ماتحت مختلف تھا۔ اس کے بعد جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا اور انسانی ذہن میں پختگی آتی گئی، اس تصور میں بھی جلا اور لطافت پیدا ہوتی گئی۔ اس طرح بتدریج "خدا"

ارتقائی خدا

کا وہ تصور وجود میں آ گیا جو دنیا کے بلند مذاہب کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس نظریہ کو خدا کا ارتقائی تصور کہا جاتا ہے۔ تفصیل (مثلاً) گرانٹ ایلن (GRANT ALLEN) کی کتاب THE EVOLUTION OF THE IDEA OF GOD

یا فریزر (SIR JAMES GEORGE FRAZER) کی (GOLDEN BOUGH) وغیرہ میں ملے گی۔

اس مقام پر اتنا واضح کر دینا غیر محل نہیں ہو گا کہ بعد کے محققین نے اس نظریہ کی تردید کر دی ہے اور کہا ہے کہ خدا کا جو تصور بلند مذاہب میں پایا جاتا ہے وہ ارتقائی طریق سے BY PROCESS OF EVOLUTION اس مقام تک نہیں پہنچا، وہ شروع سے ایسا ہی تھا۔ چنانچہ عصر حاضر کا مشہور مورخ ڈاکٹر آرنلڈ ٹوئن بی (DR. ARNOLD TOYNBEE) اس بارے میں لکھتا ہے:

پروفیسر شمٹ کی تحقیق یہ ہے کہ خدا کی پرستش کا جو تصور بلند مذاہب نے پیش کیا ہے یہ کوئی نیا تصور نہیں جسے

انہوں نے ایجاد کیا ہو۔ نوع انسانی کا قدیم ترین مذہب ہی تھا جس کا احیاء بلند مذاہب نے کیا ہے۔

پروفیسر پوری شمٹ SCHMIDT کی جس کتاب سے ڈاکٹر ٹوئن بی نے مذکورہ صدر نتیجہ پیش کیا ہے وہ اس موضوع پر مستند تصنیف مانی جاتی ہے۔ اس میں اُس نے واضح الفاظ میں بیان کیا ہے کہ انسان کے ابتدائی تمدن میں جس بلند ہستی کا تصور پایا جاتا ہے وہ وہی تصور تھا جو توحید کے علمبردار مذاہب کی طرف سے پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ نسل انسانی کے قدیم ترین قبائل میں سے اکثر کی نسبت یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ خدا کے متعلق ان کا یہی تصور تھا۔ لہذا ارتقائی مذہب کا تصور اب عمرانیات کے میدان میں دیوالیہ ہو چکا ہے۔

بہر حال یہ ایک ضمنی بات تھی۔ ہم کہہ رہے تھے کہ (علمائے عمرانیات کے خیال کے مطابق) ذہن انسانی میں "خدا" کا خیال ان وقائع و حوادث کی بنا پر پیدا ہوا جن کی کوئی علت یا سبب ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس دور کے انسان کو ان واقعات و حوادث کی تباہ انگیزیوں کا اکثر و بیشتر سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اور (چونکہ ابھی اس نے اشیائے فطرت کی تسخیر کا علم حاصل نہیں کیا تھا اس لئے) وہ ان حوادث کے سامنے اپنے آپ کو مجبور اور بے بس پاتا تھا۔ ان کے نقصانات سے بچنے کے لئے اس کے ذہن میں اس کے سوا کچھ آ نہیں سکتا تھا کہ وہ ان کے حضور گڑ گڑائے۔ ان کے سامنے جھکے۔ انہیں سجدہ کرے اور یوں ان کے غصے کو خوشنودی سے بدلنے کی کوشش کرے۔ اسی کو "پرستش" کہتے ہیں۔ چنانچہ **عہد پرستش** یہ پہلا دور (ان علماء کے خیال کے مطابق) عہد پرستش AGE OF WORSHIP تھا۔ اس کے

لے جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ خدا کا جو تصور وحی کی رُو سے دیا گیا تھا وہ شروع سے اخیر تک ایک ہی تھا۔ جب وحی میں انسانی خیالات کی آمیزش ہو گئی تو خدا کے تصور میں بھی تبدیلی آئی۔ اب خدا کا صحیح تصور صرف وہاں سے مل سکے گا جہاں وحی میں انسانی خیالات کی آمیزش ہوئی ہو یعنی قرآن

بعد جب ان میں کچھ "سیانے" پیدا ہو گئے (انہی سے پیشوائیت یا INSTITUTION کی PRIESTCRAFT کا آغاز ہوتا ہے)، تو انہوں نے کہا کہ ان بھڑی ہوتوں کے جوش غضب سے بچنے کا طریق ان کے سامنے ٹھکانا اور گڑگڑانا نہیں۔ ہم تمہیں ایسے "عمل" بتاتے ہیں جن سے یہ قوتیں مجبور ہو کر تمہارے حسبِ منشا کام کرنے لگ جائیں چنانچہ اس طرح ان منتروں جنتروں کا وجود عمل میں آیا جنہیں سحر یا جادو کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہ علماء اس دور کو AGE OF MAGIC کہتے ہیں۔

عہد سحر

اس سے آگے بڑھے تو انسانی تمدن نے بادشاہت کا ادارہ وضع کیا۔ اس کی رُو سے ایک شخص اتنی بڑی قوتوں کا مالک بن جاتا (یا اسے ایسی قوتوں کا حامل سمجھ لیا جاتا) کہ اس کا ہر حکم اٹل اور ہر فیصلہ ناطق قرار پاتا۔ وہ غصے میں آتا تو بستیوں کی بستیاں تباہ و برباد کر دیتا۔ خوش ہوتا تو گاؤں کے گاؤں انعام بخش دیتا۔ نہ اس کے خوش ہونے کے لئے کوئی قاعدہ اور قانون مقرر تھا۔ نہ ناراض ہونے کے لئے کوئی سبب اور علت سعدی کے الفاظ میں بادشاہوں کی کیفیت یہ تھی کہ "گاہ بہ سلامے بر بخند و گاہ بہ دشنامے خلعت بہ بخشند" انہیں خوش کرنے (اور خوش رکھنے) کے لئے ان کی شان میں قصبے پڑھے جلتے۔ ان کے حضور سجدے کئے جاتے۔ نذرانے پیش کئے جاتے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صاحبِ قوت و جبروت مستی تک ہر شخص کی رسائی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی بارگاہ تک پہنچنے کی راہ میں سینکڑوں حاجب و دربان ایستادہ رہتے۔ لہذا عوام ان تک اپنی درخواست پہنچانے کے لئے وسیلے تلاش کرتے اور سفارشیں ڈھونڈتے۔ اس کے لئے کبھی ان کے دربانوں کی منتیں کرنی پڑتیں۔ کبھی ان کے مقربین کو رشوتیں دے کر آمادہ کیا جاتا کہ وہ کسی مناسب موقع پر (جب بادشاہ سلامت کا مزاج MOOD اچھا ہو) ان کی درخواست ان کے حضور پیش کر دیں۔ بادشاہ کی ان بے پناہ قوتوں کے پیش نظر بعض لوگ خود سے ہی "خدا" تسلیم کر لیتے۔ لیکن بعض کہتے کہ خدا ان تمام تضمینات و لوازمات کے ساتھ اسی ہیئت میں آسمانوں کے اوپر بیٹھا ہے۔ اور بادشاہ زمین پر اس کا سایہ ہے۔ اس طرح ذہن انسانی میں خدا کا تصور ایک مطلق العنان، مستبد حاکم (راجہ یا سلطان یا بادشاہ) کے تصور کے مطابق قائم ہو گیا۔ مارکس وغیرہ کا خیال ہے کہ عوام کے ذہن میں خدا کا یہ تصور از خود قائم ہو گیا بلکہ اس طبقے نے جس نے دولت اور اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا پیشوائیت کی مدد سے اس تصور کو عوام کے ذہن میں خاص

مارکس کا نظریہ

لے دیکھے FRAZER کی کتاب MAGIC AND RELIGION جو GOLDEN BOUGH کا ایک حصہ ہے۔

۲ے اس دور کا انسان ابھی قانون LAWS کے تصور سے آشنا نہیں تھا۔ نہ اسے کائناتی قوانین کا علم تھا نہ انسانی دنیا میں قانون کا تصور اس کے ذہن میں آ سکتا تھا۔

طور پر راسخ کیا تاکہ ان کی مفاد پرستیوں VESTED INTERESTS کو الوہیاتی سند DIVINE

AUTHORITY حاصل ہو جائے۔ اور اس طرح محنت کش طبقہ ان کے چنگل سے نکلنے نہ پائے۔ بہر حال حقیقت یہ ہو یا وہ۔ یہ واقعہ ہے کہ ذہن انسانی اُس وقت سے اس وقت تک خدا کے تصور کے متعلق اس قسم کی بھول بھلیتوں میں کھویا ہوا ہے جن سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ اس کے سامنے نہیں آتا۔ واضح رہے کہ اس وقت تک خدا کی پرستش کے متعلق ہم نے جو گفتگو کی ہے وہ اس کے اس تصور کے متعلق ہے جو ذہن انسانی کا پیدا کردہ ہے۔ ممکن ہے کہ اس مقام پر کہہ دیا جائے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے بلند مذاہب میں بھی (جن کا دعوئے ہے کہ ان کی تعلیم ذہن انسانی کی تخلیق نہیں بلکہ وحی پر مبنی ہے) خدا کا تصور کچھ اسی قسم کا پایا جاتا ہے۔ لیکن مختلف مذاہب عالم میں وحی کی تعلیم میں انسانی خیالات، تصورات، نظریات اور معتقدات کی آمیزش اس حد تک ہو چکی ہے کہ ان کے ہاں اصلی اور وضعی کی تمیز ہی باقی نہیں رہی۔ نہ ہی ان کے پاس اب کوئی ایسا معیار ہے جس کی رُو سے وہ خالص وحی کی تعلیم کو انسانی تصورات سے الگ کر سکیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف خود ان مذاہب کے علماء اور پیشواؤں کی طرف سے کھلے بندوں کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ان میں سے آج کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کرتا (نہ کر سکتا ہے) کہ جس کتاب کو وہ اپنی آسمانی کتاب کہتے ہیں وہ لفظاً لفظاً وہی ہے جو ان کے پیغمبر کو ملی تھی۔ یہ وجہ ہے کہ ان کتابوں میں خدا کا جو تصور سامنے آتا ہے وہ اس تصور سے ملتا جلتا ہے جو ذہن انسانی نے وضع کیا تھا۔

اسلام میں خدا کا تصور | اس تمہید کے بعد ہم اسلام کی طرف آتے ہیں۔ واضح رہے کہ جب ہم اسلام کے متعلق بات کریں گے تو اس کے لئے ہماری سند قرآن مجید ہوگی۔ اور قرآن کے متعلق یہ

حقیقت اپنوں اور بیگانوں سب کے نزدیک مسلم ہے کہ یہ حرفاً حرفاً وہی ہے جسے نبی اکرم (صلعم) نے (خدا سے بذریعہ وحی پاکر) اُمت کو دیا تھا۔

قرآن خدا کے متعلق بات کرنے سے پہلے انسان کے متعلق بات کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی زندگی کے دو تصور ہیں۔ ایک وہ جسے مادی تصور حیات (MATERIALISTIC CONCEPT OF LIFE) کہا جاتا ہے۔ اس تصور کی رُو سے یہ مانا جاتا ہے کہ انسان عبارت ہے اس کے طبعی جسم PHYSICAL BODY سے جو طبعی قوانین کے مطابق وجود میں آتا ہے۔ انہی قوانین کے مطابق سرگرم عمل رہتا ہے اور انہی کے مطابق آخر الامر ختم ہو جاتا ہے۔ اس طرح انسانی جسم کے انتشار DISINTEGRATION سے انسانی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تصور حیات کی رُو سے

لہ اس اجمال کی تفصیل میری کتاب "مذاہب عالم کی مینہ آسمانی کتابیں" میں ملے گی۔

مادی تصویحیات

انسان کو نہ خدا کے بلنے کی ضرورت پڑتی ہے نہ کسی خارجی رہنمائی کی احتیاج۔ انفرادی طور پر جسم کی پرورش طبیعی قوانین کے مطابق ہوتی ہے۔ جو شخص ان قوانین کا اتباع کرتا ہے اس کی صحت اور توانائی اچھی رہتی ہے۔ جو ان کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ بیمار اور کمزور ہو جاتا ہے۔ ان امراض کا ازالہ بھی قوانین طبیعی کی رو سے کیا جاسکتا ہے۔ جب اس کے قومی مضمحل ہو جاتے ہیں (یا کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے) تو اسے موت آجاتی ہے۔ اور معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ باقی رہی اس کی اجتماعی زندگی۔ سو اس کے لئے عقل اور تجربہ کی روشنی میں ایسے قواعد و ضوابط مرتب کئے جاسکتے ہیں جن کے مطابق (مختلف افراد پر مشتمل) قوم کی پرورش ہوتی رہے۔ اس کے مفاد محفوظ رہیں اس کی توانائیاں نہ صرف قائم رہیں بلکہ ان میں اضافہ ہوتا چلا جائے (تاکہ وہ ان امباب و حوادث کا مقابلہ کر سکے جو اس کے درپے تخریب ہوں) ایسے قوانین کے وضع اور مرتب کرنے میں ان کے پیش نظر صرف ایک معیار ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ان کے ذریعے ان کی اجتماعی قوت و سطوت برقرار رہے، اور ان کے غلبہ و تسلط میں اضافہ ہوتا چلا جائے۔ انسانی قوانین کی تشکیل میں بھی قومی مصلحت، بنیادی جذبہ ہوگا اور ان میں تغیر و تبدل بھی اسی نقطہ کے مطابق عمل میں آتا رہے گا۔ اس کے لئے نہ خدا کی ضرورت ہے نہ اس کی طرف سے کسی رہنمائی کی حاجت۔ قرآن کریم اس زندگی کو حیوانی سطح ANIMAL LIFE کی زندگی قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ

وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ (۲۴/۱۲)

جو لوگ (زندگی کی بلند حقیقت سے) انکار کرتے ہیں وہ حیوانوں کی طرح متاعِ حیات سے فائدہ اٹھاتے اور کھاتے پیتے ہیں۔

وہ دوسرے مقام پر کہتا ہے کہ ان لوگوں کا مطمح نگاہ اور مقصدِ حیات صرف اپنی مفاوہ پرستیوں کے جذبات کا اتباع ہوتا ہے۔ ان کی عقل و فکر بھی صحیح کام دینے کے بجائے ان کے جذبات کی لونڈی اور ان کے مقاصد کے برفے کارلانے کا آلہ کار بن کر رہ جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے۔

أَمْ أَعْيَتْ مِنَ اتِّخَاذِ الْهَوَىٰ هَوَاهُ ط أَفَأَنْتَ تَكُونُ عَلَيْهِ وَكِيلًا ط أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ
أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ ط إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا (۲۵/۲۳-۲۴)

یاد رہے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا معبود بنا لیا۔ تو ایسے شخص کی نگرانی کیسے کر سکتا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ اپنی عقل و فکر سے کام لیتے ہیں؟ (بالکل نہیں) یہ لوگ (انسان نہیں) حیوان ہوتے ہیں؛ بلکہ ان سے زیادہ راہ گم کردہ۔

یہ لوگ اگر اس حقیقت کا اقرار بھی کریں کہ خارجی کائنات کا عظیم سلسلہ خدا کے قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے تو بھی قرآن اسے خدا پر ایمان تسلیم نہیں کرتا۔ انہی کے متعلق وہ کہتا ہے کہ

وَلَا يَنْسَأَلُهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَصَحَّحَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لِيَقُولَنَّ
اللَّهُ جَ فَإِنِّي يُؤْفَكُونَ ۝ (۲۹/۴۱)

اگر تو ان سے پوچھے کہ کائنات کی بلندیوں اور بستियों کو کس نے پیدا کیا اور چاند اور سورج کس کے قوانین کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں تو یہ کہہ دیں گے کہ اللہ کے قوانین کی۔

ان سے پوچھو کہ جب تم خارجی کائنات میں خدا کے قوانین کی کار فرمائی کا اقرار کرتے ہو تو انسانی دنیا میں اس سے کیوں انکار کرتے ہو (تمہارے ذہن میں وہ کون سا مقام آجاتا ہے) جہاں تم اٹے پھر جاتے ہو۔

یہ وہ لوگ ہیں جو

قَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ ۝ (۲۵/۲۴)

کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے ہم (طبعی قوانین کے مطابق) مرتے اور زندہ رہتے ہیں اور مردہ زمانہ ہمیں ہلاک کر دیتا ہے۔

یہ ہے ایک تصویر حیات جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ یہ محض ظن و قیاس پر مبنی ہے۔ علم و حقیقت پر نہیں (۲۵/۲۴)۔
دوسرا تصویر حیات وہ ہے جس کی رُو سے مانا جاتا ہے کہ انسان صرف طبعی جسم سے عبارت نہیں جسم کے علاوہ ایک اور

چیز بھی ہے جسے انسانی ذات PERSONALITY نفس SELF انا یا خودی

قرآنی تصویر حیات (۱) کہتے ہیں۔ (قرآن میں اس کے لئے نفس کا لفظ آیا ہے اور اسے روح خداوندی سے تعبیر کیا گیا ہے)۔ قرآن میں انسان کی پیدائش کے سلسلے میں کہا گیا ہے۔ بَدَا خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ۔ خدا نے انسانی تخلیق کے سلسلے کی ابتداء بے جان مادے سے کی۔ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ مَاءٍ مَهِينٍ ۝ پھر اسے مختلف ارتقائی منازل سے گزارتے ہوئے اس مقام میں لے آیا جہاں اس کی نسل کی افزائش بسلسلہ تولید ہوتی تھی۔ اس مقام تک انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ثُمَّ سَوَّاهُ ۝ پھر اس نے اس میں سے حشو و زوائد کو الگ کر کے اس میں خاص اعتدال و تناسب پیدا کیا۔ وَ نَفَخَ فِيهِ مِنْ رُوْحِهِ ۝ اور اس میں اپنی توانائی کا ایک شمع ڈال دیا۔ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْبَصَارَ وَ الْأَفْئِدَةَ ۝ اور (اس طرح) تمہیں سماعت و بصارت اور قلب عطا کر کے اس قابل بنایا کہ تم مختلف علوم حاصل کر سکو۔ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ۝ (۳۲/۹) لیکن تم میں سے بہت تھوڑے ہیں جو ان قوتوں اور صلاحیتوں کا صحیح

استعمال کرتے ہیں۔

اس مقام پر قرآن نے بتایا ہے کہ سلسلہ ارتقاء ORGANIC EVOLUTION کی سابقہ کڑیوں میں انسان بھی دیگر حیوانات کی سطح پر تھا۔ جب یہ آگے بڑھا تو اس میں ایک امتیازی خصوصیت پیدا ہوئی جس سے یہ الگ قسم کی مخلوق بن گیا۔ یہ امتیازی خصوصیت وہ ہے جسے قرآن نے ”روح خداوندی یا الوہیاتی توانائی DIVINE ENERGY سے تعبیر کیا ہے۔

واضح رہے کہ قرآن میں رُوح کا لفظ ان معنوں میں نہیں آیا جن معنوں میں اسے مادہ MATTER کے مقابلہ میں استعمال کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ SPIRIT یا SOUL کے معنوں میں نہیں آیا۔ یہ وہ الوہیاتی توانائی ہے جسے انسانی ذات (یا نفس) کہا جاتا ہے۔ سماعت و بصارت SENSES اور قلب MIND وہ ذرائع ہیں جو انسانی ذات کو معلوماً بہم پہنچاتے اور ان میں تمیز و تفریق پیدا کرتے ہیں۔ یہ ذات اس علم کی روشنی میں اپنے اختیار و ارادہ سے معاملات کے فیصلے کرتی ہے اور اپنے ذرائع یا یوں کہتے کہ جسم اور اس کی قوتوں کو اپنے فیصلوں کو بروئے کار لانے کا ذریعہ بناتی ہے۔ یہ بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا سے یہ مطلب نہیں کہ خدا نے اپنی ذات میں سے ایک حصہ انسان کو دے دیا۔ ذات PERSONALITY ایک ناقابل تقسیم وحدت

روح خداوندی

INDIVISIBLE WHOLE ہوتی ہے جو حصوں میں تقسیم نہیں ہو سکتی۔ لہذا یہ تصور غلط ہے کہ انسانی ذات خدا کی ذات کا ایک جزو ہے جو اپنی اصل سے جدا ہو کر مادی آلائشوں میں پھنس گئی ہے اور اس کی تگ و تاز کا منتہی یہ ہے کہ یہ جزو پھر اپنے گل میں جانے جس طرح قطرہ دریا میں جا ملتا ہے۔ یہ نظریہ قرآن کے خلاف ہے۔ خدا کی ذات اپنی جگہ مکمل ہے اور انسانی ذات (جو اگرچہ خدا کی ودیعت کردہ ہے) اپنے مقام پر مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ انسانی زندگی کا یہ تصور (کہ انسان صرف جسم کا نام نہیں بلکہ اس میں جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے اس کی ذات کہتے ہیں) وہ بنیاد ہے جس پر دین کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ اگر اسے مان لیا جائے تو دین کی بات آگے چلتی ہے۔ اگر اسے تسلیم نہ کیا جائے تو دین کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسے تسلیم کر لینے سے جو بات آگے چلتی ہے اس کی چند اہم کڑیاں یہ ہیں۔

انسانی ذات

(۱) ذات جہاں بھی ہو اس کے بنیادی خصائص BASIC CHARACTERISTICS وہی ہوں گے۔

(۲) انسان کو ذات بنی بنائی نشوونما یافتہ DEVELOPED FORM میں نہیں ملتی۔ یہ اسے بطور ممکنات

زندگی REALISEABLE POSSIBILITIES یا مضمر LATENT یا مستتر POTENT یا خوابیدہ DORMENT شکل میں ملتی ہے۔ اس کا مشہود MANIFEST یا بارز ACTUALIZE کرنا انسانی زندگی کا مقصود

ہے۔ اسے انسانی ذات کی نشوونما (DEVELOPMENT) کہتے ہیں۔

(۳) ایک غیر تربیت یافتہ ذات UN-DEVELOPED PERSONALITY کے لئے ضروری ہے کہ کوئی نشوونما یافتہ ذات DEVELOPED PERSONALITY بطور خارجی معیار OBJECTIVE STANDARD اس کے سامنے رہے۔ اگر انسان کے سامنے اس قسم کا کوئی خارجی معیار نہ ہو تو وہ کبھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس کی نشوونما ہو رہی ہے۔ اور اگر ہو رہی ہے تو کس حد تک۔

(۴) اس کائنات میں ذات یا تو خدا کی ہے یا اس سے نیچے اتر کر انسان کی۔ خدا کی ذات مکمل ترین، بلند ترین اور کامل نشوونما یافتہ ہے اس لئے وہی ذات انسانی ذات کے لئے خارجی معیار بن سکتی ہے۔

خدا اور انسان

(دواضح رہے کہ خدا کی ذات، انسانی ذات کی طرح، رفتہ رفتہ نشوونما پا کر مکمل یا نشوونما یافتہ نہیں ہوتی تھی۔ وہ فی ذاتہ مکمل اور نشوونما یافتہ تھی اور ہے۔)

(۵) ہم خدا کی ذات کی کنہ و حقیقت اور ماہیت و کیفیت کے متعلق کچھ نہیں جان سکتے۔ (خدا کی ذات تو ایک طرف ہم اپنی ذات کی کنہ و حقیقت کے متعلق بھی کچھ نہیں جان سکتے۔) ذات اپنی صفات سے پہچانی جاتی ہے۔ یہی صفات میں جنہیں ہم نے اوپر بنیادی خصائص (BASIC CHARACTERISTICS) سے تعبیر کیا ہے۔ یہ صفات و خصائص درحقیقت ذات کے مختلف شتون (FACETS) ہوتے ہیں۔

(۶) ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ ذات جہاں بھی ہوگی اس کے بنیادی خصائص (یا صفات) ایک ہی ہوں گی۔ لہذا انسانی ذات اور ذاتِ خداوندی کے صفات ایک ہی ہیں بجز ان صفات کے جو ذاتِ خداوندی کے لئے مختص ہیں، مثلاً ازلیت، ابدیت (ہو الا دل والاخر) لامتناہیت وغیرہ۔ پھر چونکہ خدا کی ذات مکمل ترین، بلند ترین اور لامحدود (INFINITE) ہے اس لئے اس کی صفات بھی مکمل ترین، بلند ترین اور لامحدود ہیں۔ اس کے مقابلے میں انسانی ذات میں یہ صفات حدود بشری کے اندر سمٹی ہوئی ہیں۔ صفاتِ خداوندی اور انسانی ذات کی صفات میں یہ فرق ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیئے۔

(۷) قرآن نے صفاتِ خداوندی کو اس تفصیل، وضاحت اور حسن و خوبی سے بیان کیا ہے کہ انسان کے لئے ان کے معیار بننے میں کسی قسم کا شک و شبہ یا ابہام و التباس نہیں رہ سکتا۔

(۸) قرآن نے وہ ضابطہ بھی دیا ہے جس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسانی ذات کی ان مضمرا اور خوابیدہ صفات کی نمود ہوتی جاتی ہے۔ یا بالفاظِ دیگر انسانی ذات کی نشوونما ہوتی جاتی ہے۔ وہ خدا کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ اُسے "قربِ خداوندی" حاصل ہو جاتا ہے۔ اس ضابطہ یا نظام کو اللہ تعالیٰ کہتے ہیں۔

(۹) اس ضابطہ یا نظام کی رُو سے انسانی ذات کی نشوونما معاشرہ کے اندر رہتے ہوئے ہوتی ہے۔ تجربہ و گاموں اور خلوت گاہوں میں نہیں ہو سکتی۔ لہذا جس معاشرہ میں اللہ بین عملی شکل اختیار کرتا ہے اس میں ہر فرد کی ذات کی نشوونما ہوتی جاتی ہے اور تمام افراد معاشرہ سرفرازیوں اور سر بلندیوں اور خوشگوار یوں اور شادابیوں کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

(۱۰) انسان کے ہر کام، بلکہ آرزو، ارادہ اور دل میں گزرنے والے خیالات تک کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ اسے قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ ہر وہ کام جو اس کی ذات کی نشوونما میں مدد و معاون ہو عمل خیر کہلاتا ہے۔ اس کے برعکس جو کام اس کی ذات کے ضعف و اضمحلال کا موجب بنے عمل شر ہے۔ بالفاظِ دیگر، جس طرح جسم انسانی کی نشوونما اور ضعف و ہلاکت کے لئے قوانین مقرر ہیں اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما اور تباہی و بربادی کے لئے قوانین متعین ہیں۔ اگر انسانی ذات کی نشوونما ہوتی رہے تو انسانی جسم سے متعلق حوادثِ حسی کہ اس کی موت کا بھی، اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یعنی ایک نشوونما یافتہ ذات حیاتِ جاوید حاصل کر لیتی ہے۔ اسے آخرت کی زندگی کہتے ہیں۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ قرآن کی رُو سے:-

(ا) خدا اس مکمل ترین، بلند ترین اور نشوونما یافتہ ذات کا نام ہے جس کی صفات انسانی ذات کے نشوونما کے لئے بطور خارجی معیار کام دیتی ہیں۔ ان صفاتِ خداوندی (اسماء الحسنی) کو اپنے سامنے بطور معیار رکھ لینا اور اپنی ذات میں (علیٰ حدِ بشریت) ان کی نمود کو زندگی کا نصب العین قرار دے لینا ایمان باللہ (خدا پر ایمان) کہلاتا ہے۔

(ب) دین اس عملی ضابطہ زندگی یا نظامِ حیات کا نام ہے جس کے مطابق معاشرہ متشکل کرنے سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ اس نظام کے قوانین کا مجموعہ قرآن ہے۔ (واضح رہے کہ "مذہب" کا لفظ قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ وہ صرف دین کے متعلق بات کرتا ہے۔ یعنی ایک عملی نظامِ حیات کے متعلق۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ دین، آدمی کو حیوانی سطح

لے انگریزی زبان میں چونکہ "دین" کے لئے کوئی الگ لفظ نہیں تھا اس لئے انہوں نے باقی مذاہب کی طرح، اسلام کو بھی ایک (RELIGION) قرار دے لیا، حالانکہ RELIGION کی جس قدر (DEFINITIONS) پہلے دی جا چکی ہیں، یا اس کا جو عام تصور ہے،

ان میں سے کسی بات کا بھی اسلام پر اطلاق نہیں ہوتا۔ اسلام دین ہے، مذہب نہیں، اور دین کے معنی ہیں وہ طریق زندگی انسانوں کی وہ ہیئتِ اجتماعیہ جو خدا کی طرف سے عطا کردہ مستقل اقدار کے خطوط پر متشکل ہو۔ اس سے "مذہب" اور "دین" کا بنیادی فرق سامنے

آجاتا ہے۔ "مذہب" کا حاصل، ایک ذاتی، داخلی تجربہ INTER PERSONAL EXPERIENCE بتایا جاتا ہے، جو یکسر انفرادی چیز ہے، لیکن دین، نظام زندگی کا نام ہے جو سراسر اجتماعی ہے۔

سے ابھار کر انسانی سطح پر زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے جس سے ایک فرد اس دنیا میں بھی سرفرازیوں اور سر بلندیوں کی زندگی بسر کرتا ہے اور اس کے بعد کی دنیا (آخرت) میں مزید ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس مقام پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر دین کا مقصود افراد کی ذات کی نشوونما ہے تو یہ وہی انفرادی تصور ہے جسے خانقاہیت کا منسک ویدانت

قرآنی تصور اور تصوف میں فرق

تصوف (MYSTICISM) اپنے طریق پر پیش کرتا ہے۔ ان دونوں میں کیا فرق ہے اور کائنات یا انسانی ہیئت اجتماعیہ پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے؟ یہ سوال اہم ہے اور اسے غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

کائنات کی ہر شے میں خدا کا عمل تخلیق اور نظام ربوبیت اس کے قوانین کے مطابق جاری و ساری ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے ضمناً یہ دیکھ لینا بھی ضروری ہے کہ تخلیق اور نظام ربوبیت سے کیا مراد ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ ایک نظام وہ ہے جس میں مختلف اشیائے کائنات کا اولیں میوٹی، عدم (NON-EXISTENCE) سے وجود (EXISTENCE) میں آیا ہے۔ یہ کس طرح ہوتا ہے اس کے متعلق ہم کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ اسے قرآن نے امر سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی وہ گوشہ جس میں خدا

تخلیق کا ارادہ اور فیصلہ اس انداز سے عملی شکل اختیار کرتا ہے کہ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (۳۶/۸۲) ”جب وہ کسی بات کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اسے کہہ دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔“

اس اولیں میوٹی کے وجود میں آجانے کے بعد مختلف عناصر میں نئی نئی ترکیب سے نئی نئی چیزیں وجود میں آتی چلی جاتی ہیں۔ اسے تخلیق کہتے ہیں۔ خلق کے معنی ہی صحیح توازن و تناسب (PROPORTION) کے ساتھ پیدا کرنا ہیں۔ اس طرح کائنات میں تخلیقی اضافے ہوتے رہتے ہیں۔ مَبْرُؤًا فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ (۲۵/۱)

یہ رہا خدا کا عمل تخلیق۔ اس کے بعد اس کا نظام ربوبیت شروع ہوتا ہے۔ ربوبیت کے معنی ہیں کسی شے کو اس کے نقطہ آغاز سے آہستہ آہستہ بتدریج اس کے نقطہ تکمیل تک پہنچا دینا جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔

ربوبیت خدا کا یہ عمل تخلیق و ربوبیت کائنات کے ہر گوشے میں جاری و ساری ہے لیکن (ہماری اندازوں کے مطابق) اس کی رفتار بڑی سُست ہے۔ فطرت کی اسکیپس اپنی تکمیل تک پہنچنے کے لئے ایسے مراحل میں سے گزرتی ہیں جن کا ایک ایک مرحلہ (PERIOD) ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔ سورہ سجدہ میں ہے۔

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ (۳۲/۵)

اللہ اپنی سکیم کو عالم امر کی بلندیوں میں ترتیب دے کر اس کا آغاز پست ترین نقطہ (ارض) سے کرتا ہے۔

پھر وہ اسکیم اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی اس (کی مقرر کردہ منزل) کی طرف بلند ہوتی چلی جاتی ہے ایک یوم میں جو تمہارے حساب و شمار سے ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔

دوسرے مقام پر ان ارتقائی منازل کو پچاس پچاس ہزار سال کا بھی بتایا گیا ہے (۶/۴)۔ ان مراحل کے سلسلہ دراز کے متعلق کچھ سمجھنا ہو تو نظریہ ارتقار (THEORY OF ORGANIC EVOLUTION) کے ماہرین سے پوچھئے۔ وہ بتائیں گے کہ ایک نوع میں ذرا سی تبدیلی کے لئے کس طرح لاکھوں برس کی مدت درکار ہوتی ہے۔ کائنات میں جب خدا کی اسکیم (تنہا) کار فرما ہوتی ہے تو مختلف اشیاء اپنے ارتقائی مراحل اس سست رفتاری سے طے کرتی ہیں۔ لیکن اگر انسان خدا کے اس تخلیقی پروگرام میں اس کا رفیق بن جائے تو نہ صرف یہ کہ یہ طویل و طویل مدت سمٹ کر دنوں اور مہینوں میں محدود ہو جاتی ہے، مخلوقات میں نئے نئے اضافے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

انسانی رفاقت

اقبالؒ نے (انسان اور خدا کے درمیان مکالمہ کی شکل میں) انسان کی زبان سے کہا ہے کہ

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار درآغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم

من آمم کہ از سنگ آئینہ سازم

(پیام مشرق)

من آمم کہ از زہر نوشینہ سازم

یہی وہ خدا کے تخلیقی پروگرام میں اس کے رفیق بننے والے انسان میں جنہیں قرآن "خالق" کہہ کر پکارتا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ خدا احسن الخالقین (۲۳/۴) ہے۔ یعنی جس کی تخلیق میں حسن و توازن اپنی انتہا تک پہنچا ہوا ہوتا ہے۔

خدا کے تخلیقی پروگرام میں انسان کی رفاقت بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی۔ لیکن اس کی حقیقی اہمیت اس مقام میں سامنے آتی ہے جہاں یہ اس کے قانون مکافات میں اس کا رفیق بنتا ہے۔ جس طرح خارجی کائنات میں خدا کا قانون مکافات ہر سبب سے ایک نتیجہ EFFECT پیدا کرتا ہے اسی طرح انسانی دنیا میں بھی ہر عمل اپنا نتیجہ مرتب کرتا ہے۔ اور مرتب کر کے رہتا ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ اس کے قانون کے مطابق جس کام کا نتیجہ خوشگوا

انسانی دنیا میں رفاقت

وشادابی ہے اس سے زندگی میں شادابی و خوشگواوری پیدا نہ ہو۔ اور جس کام کا

لے "نوع" میں تبدیلی تو ایک طرف۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ پچاس ہزار سال کی مدت میں دن رات (یعنی چوبیس گھنٹے) میں ایک سیکنڈ کا اضافہ ہو جاتا ہے کیونکہ زمین کی حرکت کی رفتار سست ہو رہی ہے۔

نتیجہ تباہی و بربادی ہے اس سے قومیں تباہ و برباد نہ ہوں۔ لیکن کائناتی نظام کی طرح اس گوشے میں بھی خدا کے قانونِ مکافات کی رفتار بڑی سست ہوتی ہے۔ وہی ہزار ہزار سال کا ایک دن (۲۲/۴۷)۔ خارجی کائنات میں قانونِ خداوندی کی سست روی انسان کو کچھ زیادہ متاثر نہیں کرتی لیکن انسانی معاشرہ میں اس کی یہ رفتار دلوں میں شکوک و شبہات کی چھین اور غلش و اضطراب کی پھانس پیدا کر دیتی ہے۔ مثلاً اس کا قانون ہے کہ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ (۶/۲۱) ظالموں کی کھیتی کبھی پنپ نہیں سکتی۔ یہ خدا کا غیر متبدل قانون ہے۔ لیکن ہم دیکھتے یہ ہیں کہ ظالم نپتے چلے جاتے ہیں اور مظلوم پستے رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ خدا کے قانونِ مکافات کو نہیں مانتے وہ دھڑلے سے کہتے ہیں کہ اگر خدا کا قانون کچھ حقیقت رکھتا تو ظالموں کی کھیتیاں پنپتی کیوں چلی جاتیں؟ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دنیا کا چلن یہی ہے کہ جس کی لالچی اُس کی بھینس۔ ظالم جب تک صاف وقت ہے اسے پوچھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے کہ

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَلَكِنْ يَخْتَلِفُ اللَّهُ وَعْدًا وَإِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ (۲۲/۴۷)

یہ لوگ تجھ سے (مے رسول) کہتے ہیں کہ تم جو کہتے ہو کہ ہماری غلط روش کا نتیجہ تباہی و بربادی ہوگا تو وہ تباہی اور بربادی کہاں ہے؟ وہ آتی کیوں نہیں؟ اگر تم سچے ہو تو اسے جلدی سے لاؤ۔

بات یہ ہے کہ خدا کا قانون بالکل برحق ہے لیکن خدا کا ایک ایک دن تمہارے حساب و شمار سے ایک ہزار سال کا ہوتا ہے۔ لیکن مظلوم کا اس سے اطمینان نہیں ہو سکتا کہ ظالم کی تباہی ہزار یا پانچ سو سال بعد ہوگی۔ اس سے جب کہا جاتا ہے کہ۔ آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک۔ تو وہ اس کے جواب میں ٹھنڈی سانس بھر کر کہہ دیتا ہے کہ۔ کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک۔ جب اس سے کہا جاتا ہے کہ خدا کے وعدے بالکل سچے ہیں تو وہ کہہ دیتا ہے کہ مجھے بھی معلوم ہے لیکن بات یہ ہے کہ

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

اس کے جواب میں قرآن کہتا ہے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ خدا کا قانونِ مکافات تمہارے حساب و شمار سے نتیجہ نیک ہو۔ تو تم اس کے پروردگار میں اس کے رفیق بن جاؤ۔ چنانچہ یہی وہ مقام ہے جہاں نبی اکرم (صلعم) سے کہا گیا ہے کہ

قُلْ يَقَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۗ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ۚ لَا مَن شَكَّوْنَ لَهُ
عَاقِبَةُ الدَّارِ ۗ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ۝ (۶/۱۳۶)

تم ان (ظالموں) سے کہہ دو کہ تم اپنی جگہ اپنے پروگرام پر عمل پیرا ہو اور مجھے اپنے پروگرام کے مطابق عمل کرنے دو۔ نتیجہ بتادے گا کہ آخر الامر کامیابی کس کے حصے میں آتی ہے۔ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے کہ خدا کا یہ قانون کس طرح برحق ہے کہ ظالموں کی کھیتی پنہا نہیں کرتی۔

خارجی دنیا میں خدا کے تخلیقی پروگرام میں تو ہر قوم حصے لے سکتی ہے (طبعی سائنس کا مقصد ہی یہ ہے) لیکن خدا کے قانون کو انسانی معاشرہ میں نتیجہ خیز بنانے کے لئے وہی جماعت خدا کی رفیق بن سکتی ہے جو اس قانون کی محکمت پر یقین رکھے اور جن افراد پر یہ جماعت مشتمل ہو ان کی ذات میں صفاتِ خداوندی کی نمود ہو۔ یہ وہ افراد ہیں کہ ان کے ہاتھوں جو کچھ (خدا کی رفاقت کے سلسلے میں) سرزد ہوتا ہے، خدا سے خود اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ چنانچہ جب یہ جماعت (ظالموں کو یہ دکھانے کے لئے کہ ان کی کھیتی پروان نہیں چڑھ سکتی) نبی اکرم کے زمانے میں سرکف اور کفن بدوش بدر کے میدان میں آگئی اور مخالفین کو مقتول مغلوب کرنے کے بعد فاتح و منصور ہوئی (اس ضمن میں) خدا نے کہا کہ

فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ (۸/۱۷)

ان (ظالمین) کو تم قتل نہیں کرے تھے خود اللہ قتل کر رہا تھا۔ تم ان پر تیر نہیں چلائے تھے۔ خود خدا چلا رہا تھا۔

یہ حصہ خدا کے قانونِ مکافات میں انسانی رفاقت سے متعلق تھا۔

اس سے آگے بڑھتے تو خدا کا نظامِ ربوبیت سامنے آتا ہے۔ خارجی کائنات میں یہ نظام کس طرح کار فرما ہے، یہیں سرِ دست اس سے بحث نہیں۔ انسانی دنیا کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ

مَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶)

کوئی زمین پر چلنے والا (یا کوئی متنفس) ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں اکھوں انسان ایسے ہیں جنہیں دو وقت پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا۔ اس لئے اعتراض کرنے والے کہتے ہیں کہ خدا کی یہ ذمہ داری کیسی ہے جس میں انسان بھوکے مرتے ہیں؟ یہ خیال ان لوگوں کے دل میں پیدا ہوتا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ خدا اپنی اس قسم کی ذمہ داریوں کو براہِ راست پورا کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ ذمہ داری ان افراد کے ہاتھوں پوری ہوتی ہے جن کی ذات میں خدا کی صفتِ رب العالمین کی نمود ہوتی ہے۔ یہ افراد ایسا نظام قائم کرتے ہیں جس میں رزق (سامانِ نیست) ذخیروں میں بند نہیں رہتا۔ نوعِ انسانی کی نشوونما کے لئے کھلا رہتا ہے۔ چنانچہ سورہ یسین میں ہے کہ

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ قَالُوا الَّذِينَ كَفَرُوا بِاللَّذِينَ آمَنُوا أَنْطَعِمُ مَنْ

لَوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَطَعَمَهُ تَصَدَّقُوا إِنَّ أَنْتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ (۳۶/۲۷)

جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ تم اللہ کے راستے میں اپنے رزق کو نوع انسانی کی ربوبیت عامہ کے لئے کھلا رکھو تو جو لوگ اس قانون کو نہیں مانتے وہ جماعتِ مومنین سے کہتے ہیں کہ کیا ہم ان کے رزق کا انتظام کریں جنہیں اگر خدا چاہتا تو براہِ راست رزق بہم پہنچا دیتا۔

ان سے کہو کہ تم (خدا کے نظامِ ربوبیت کے بارے میں) کس قدر کھلی ہوئی غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ یہ نظامِ ربوبیت (جس میں کوئی فرد سامانِ زیست سے محروم نہ رہے) خدا کے کائناتی قانون کی رفتار سے ہزاروں سال کے بعد متشکل ہوگا لیکن اگر انسان خدا کا رفیق بن جائے تو یہی نظامِ دنوں میں قائم ہو سکتا ہے (جیسا کہ اسلام کے ابتدائی ایام میں ہوا)۔ یہی وہ نظام (اسلامی معاشرہ) تھا جس نے خدا کے اس دعوے کو کہ

تَحْسُنْ نَزْرُقُكُمْ وَآيَاتُكُمْ ۶/۱۵۲

ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ داری اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی

عملاً پورا کر کے دکھا دیا۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن نے انسانی زندگی کا جو مقصود یا نصب العین بتایا ہے (یعنی افراد کی ذات کی نشوونما) وہ ایک انفرادی عمل نہیں۔ وہ انسانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ (بلکہ خارجی کائنات سب) کو محیط ہے۔ اور اجتماعی زندگی کا ہر گوشہ اس سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ نہ انسانی ذات کی نشوونما انفرادی طور پر ہو سکتی ہے اور نہ نشوونما یافتہ ذات کی روشنی صرف اس فرد کے سینے تک محدود رہتی ہے۔ اس سے انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا ہر گوشہ متاثر ہو جاتا ہے اور انسانی معاشرے کی تشکیل صحیح خطوط پر ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ خالقِ ہیئت (تصویر) کی زندگی اور قرآنی نظریہ اور نظامِ حیات اس قدر مختلف ہیں۔ اس سے آپ نے اس کا بھی اندازہ لگا لیا ہوگا کہ خدا کا جو تصور قرآن نے پیش کیا ہے اور خدا کے ساتھ انسان کا جو تعلق

بتایا ہے اس کی رُو سے نہ تو "پرستش" کا وہ مفہوم باقی رہتا ہے جس میں انسان کسی صاحبِ قوت پرستش کا مفہوم ہستی سے ڈر کر اس کے سامنے گڑ گڑائے یا اسے خوش کرنے کے لئے اس کی مدح و ستائش کے گیت

گائے یا اس کے غصے سے بچنے کے لئے اس کے حضور نذرانے گزارے اور نہ ہی خدا کے قوانین کی اطاعت کسی مستبدِ حاکم کے اندھے حکموں کی تعمیل کے مترادف ہوتی ہے۔ اس تصور کی رُو سے خدا کی صفات وہ خارجی معیار ہے جس کے مطابق انسان اپنی ذات کی نشوونما کرتا ہے۔ اور قوانین و احکامِ خداوندی وہ عملی طریق ہے جن سے انسانی ذات کی نشوونما ہو سکتی ہے۔ ان احکام و قوانین کی مثال ڈاکٹر کی ہدایات کی سی ہے جن کے مطابق وہ مریض کو بعض کام کرنے کی تلقین کرتا ہے اور بعض باتوں سے پرہیز بتاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر کی ان ہدایات پر عمل کرنے سے مریض کا اپنا بھلا ہوتا ہے۔ اس کی ڈاکٹر کی خوشنودی یا ناراضگی کا مظاہرہ

یہ تصوف اور اس کی تاریخ کے متعلق نیری مبسوط تصنیف "تصوف کی حقیقت" ملاحظہ کیجئے

نہیں ہوتا۔ اِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا (۱۷/۷) اگر تم حسن کارنامہ انداز سے زندگی بسر کرو گے تو اس کا فائدہ تمہاری اپنی ذات کو ہوگا اور اگر ناہمواریاں پیدا کرو گے تو اس کا نقصان بھی تمہاری ذات کو ہوگا۔ خدا تمہارے اعمال کا محتاج نہیں۔ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ (۳/۹۶) خدا، کائنات اور اقوام عالم سے بے نیاز ہے۔

اختیار و ارادہ چونکہ انسانی ذات پر دہی عمل اثر انداز ہو سکتا ہے جسے وہ اپنے اختیار و ارادہ سے بطیب خاطر سرانجام دے، اس لئے کسی فرد کو مجبور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اسی نتیجے کو اختیار کرے جو انسانی ذات

کی نشوونما کے لئے خدا کی طرف سے تجویز ہوئی ہے۔ اختیار و ارادہ، ذات (PERSONALITY) کی بنیادی خصوصیت ہے اس لئے اسے سلب کر لینے کے بعد انسان سے کسی بات کو منوانا اسے انسانی سطح سے گرا کر حیوانی سطح پر لے جانا ہے جو طریق (یعنی کسی بات کو بہ جبر منوانا) انسانی ذات کو اس کی بنیادی خصوصیت (اختیار و ارادہ) سے محروم کر دے وہ انسانی ذات کی نشوونما کیا کر سکے گا؟ اس لئے قرآن کا اعلان ہے کہ لَا كْرَاهَا فِي الدِّينِ (۲/۲۵۶) دین کے ماننے یا نہ ماننے پر کسی کو مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ قَدْ تَبَيَّنَ الشُّكُّ مِنَ الْغَيْبِ (۲/۲۵۶) غلط اور صحیح راستے وحی خداوندی کی رُود سے واضح ہو چکے ہیں۔ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِرْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ (۱۸/۲۹) جس کا جی چاہے صحیح راستہ اختیار کرے جس کا جی چاہے اس سے انکار کرے۔

لیکن جب آپ دل کے پورے اطمینان کے ساتھ۔ بطیب خاطر۔ دین کا تجویز کردہ راستہ اختیار کریں گے تو پھر آپ کے لئے ان تمام قوانین و ضوابط کا ماننا ضروری ہو جائے گا جسے انسانی ذات کی نشوونما اور اس معاشرہ کے نظم و ضبط کے لئے متعین کیا گیا ہے جس کے اندر اس کی ذات کی نشوونما ہو سکتی ہے۔ ذات کی برومندی، پابندیوں کے بغیر ناممکن ہے۔ البتہ یہ پابندیاں کسی غیر کی عائد کردہ نہیں ہوں گی یہ وہ پابندیاں ہوں گی جنہیں انسان اپنی ذات کی نشوونما کے لئے خود (بطیب خاطر) اختیار کرتا ہے۔

بطیب خاطر پابندیاں اسلام اس طریق زندگی کا نام ہے جسے انسان اپنی ذات کی نشوونما کے لئے بطیب خاطر اختیار کرتا ہے۔ اس سے صرف اس کی اپنی ذات کی نشوونما نہیں ہوتی بلکہ کائنات کے حسن میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور انسانی ہیئت اجتماعیہ کا ہر گوشہ روشن اور تابناک ہو جاتا ہے۔ یہ ایسے نظام ہی میں ممکن ہے جس میں تمام افراد انسانہ کو سامان زیست بلا مشقت بہم پہنچتا رہے اور ان کی مضر صلاحیتوں کی نشوونما کا پورا پورا انتظام ہو۔

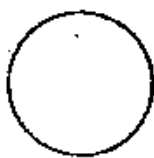
دین (یعنی قرآنی نظام زندگی) ایک حقیقت ہے اور حقیقت ہمیشہ زمان اور مکان کے حدود و قیود سے ماوراء ہوتی ہے۔ لیکن بعض اوقات زمانے کے تقاضوں سے ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کے بعض گوشے خاص طور پر اہمیت حاصل کر کے نمایاں

طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں اس حقیقت کے دو گوشے بڑی نمایاں حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ سامانِ رسل و رسائل کی وسعت سے پوری دنیا سمٹ کر ایک بستی بن گئی ہے۔ اور انسانی آبادی ایک وحدت سی بنتی نظر آ رہی ہے۔ اس اعتبار سے قرآنی نظامِ زندگی کی عالمگیریت نمایاں طور پر سامنے آ رہی ہے۔ قرآن نے مخاطب ہی "الناس" (نوع انسان) کو کیا تھا، اس لئے اب اس کے نظام کے مشہود ہونے کے لئے حالات خود بخود سازگار ہوئے ہیں۔

دوسرے یہ کہ ہمارا زمانہ 'عصر معاشیات' (AGE OF ECONOMICS) کہلاتا ہے۔ اس میں معاشی تقاضوں نے بڑی اہمیت حاصل کر لی ہے لیکن دنیا کو ابھی تک ایسا معاشی نظام نہیں ملا جس میں انسان کی انفرادیت کا قیام اور احترام بھی باقی رہے اور اس کی بنیادی ضروریات زندگی بھی باعزت طور پر حاصل ہوتی رہیں۔ نظامِ سرمایہ داری کا دیوالہ مدت ہوئی پٹ گیا تھا۔ اشتراکیت نے ایک نئے تجربہ کے طور پر دنیا کو چیلنج دیا تھا لیکن وہ ابھی چار قدم بھی چلنے نہ پائی تھی کہ بری طرح ٹھوکر کھا کر گری ہے اور اس کے سنبھلنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ اس لئے کہ اس کی بنیاد میں خرابی کی صورت مضمر تھی۔ دنیا اب پھر ایک دور ہے پر مہوت کھڑی ہے جہاں سے اُسے صرف قرآن کا نظامِ زندگی صحیح راستے کی طرف لے جا سکتا ہے۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کے باقی گوشے کم اہمیت رکھتے ہیں۔ انسانی زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے اور اس کا ہر گوشہ یکساں اہمیت کا حامل۔ اسلام انسان کو ایک وحدت کی حیثیت سے سامنے رکھتا ہے اور اسی حیثیت سے اس کے لئے نظامِ زندگی تجویز کرتا ہے۔ اس نظام کی عمارت انسانی ذات کے اقرار اور یقین پر اٹھتی ہے۔ آنتہ ابواب میں آپ کو اسی اجمال کی تفصیل ملے گی۔

تکملہ۔ ہم نے اوپر کہا ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما دین کے اجتماعی نظام میں ہو سکتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر دین کا اجتماعی نظام قائم نہ ہو تو انسانی ذات کی نشوونما کی رون صورت نہیں ہوتی۔ ایسے حالات میں ایک فرد ان اقدار کی پابندی کر سکتا ہے جن پر عمل پیرا ہونا انفرادی طور پر بھی ممکن ہے۔ مثلاً اپنی عصمت کی حفاظت کرنا، کسی کو دھوکا نہ دینا، ضرورت مندوں کی امداد کرنا، احترامِ آدمیت کا ملحوظ رکھنا، وغیرہ وغیرہ۔ ان اقدار کی پابندی سے انفرادی طور پر بھی انسانی ذات کی نشوونما ہوتی رہتی ہے۔ دیکھنے کی بات تو یہ ہوتی ہے کہ آپ اپنے اختیار و ارادہ کا استعمال کس انداز سے کرتے ہیں۔ زندگی کے جس دائرے میں اور جس حد تک آپ کے لئے اپنے اختیار و ارادہ کا استعمال ممکن ہوگا۔ اسی دائرے میں یہ دیکھا جائے گا کہ آپ اسے استعمال کس طرح کرتے ہیں۔



- 1- HUMANITY AND DEITY BY W.M. URBAN; P-15
GEORGE ALLEN AND UNWIN-1951
- 2- "APHILOSOPHI OF کتاب کے لیے دیکھئے (F.S. BRIGHTMAN) (DEFINITIONS) تمام (RELIGION" ۱۸ صفحہ
- 3- QUOTED BY "JULIAN HUXLEY" IN "RELIGION WITHOUT REVELATION"; P-40
- 4- QUOTED BY "ALDOUS HUXLEY" IN "ENDS AND MEANS" P-250.
- 5- SCIENCE AND THE MODERN WORLD.
- 6- MAX MULLER IN "SCIENCE AND RELIGION"
- 7- E.B. TAYLOR IN "PRIMITIVE CULTURE"
- 8- PROF. MONZIES IN "HISTORY OF RELEGION"
- 9- HOFFDING IN "RELIGIOUS PHILOSOPHY"
- 10- IN SEARCH OF THE MIRACULOUS (P-299)
- 11- C.F. BRIGHTMAN (P-81)
- 12- "F.J. SHEEN" IN "PHILOSOPHY OF RELEGION" (P-238)
- 13- AN HISTORION'S APPROACH TO RELIGION (P-18)
- 14- THE ORIGION AND GROWTH OF RELIGION

باب دوم

انسانی ذات

(HUMAN PERSONALITY)

گزشتہ باب میں بتایا گیا ہے کہ

(۱) انسان اس کے طبیعی جسم ہی سے عبارت نہیں۔ اس میں جسم کے علاوہ ایک اور شے "بھی ہے جسے انسانی ذات کہتے

ہیں۔

(۲) ذات کی کنہ و حقیقت کے متعلق ہم کچھ نہیں جان سکتے (خواہ وہ خدا کی ذات ہو یا انسان کی ذات) ہم اس کے صفات و اعمال سے اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

زیر نظر باب میں انسانی ذات کی صفات و خصائص اور اعمال و شئون کے متعلق بات کی جائے گی۔ ماہرین علم الابدان ہمیں بتاتے ہیں کہ انسانی جسم لاتعداد خلیات (CELLS) سے مرکب ہے لیکن ان خلیات کی یہ صورت نہیں کہ یہ ایک دفعہ کسی نہ کسی طرح وجود میں آگئے اور جب تک انسان زندہ ہے گا اسی شکل میں باقی اور موجود رہیں گے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ان خلیات میں ہر آن تغیر و تبدل کا عمل جاری رہتا ہے (اسے اصطلاح میں METABOLISM کہتے ہیں)۔ لاتعداد خلیات ضائع ہوتے رہتے ہیں (اسے KATABOLISM کہتے ہیں) اور ان کی جگہ بے شمار نئے خلیات بنتے رہتے ہیں (اس تعمیری عمل کو ANABOLISM) کہتے ہیں)۔ اس مسلسل تغیر و تبدل کا نتیجہ یہ ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد جسم انسانی

انسانی جسم میں ہر آن تبدیلی (جو ان خلیات سے مرکب ہے) ایک نئے جسم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور اس

(نئے جسم) میں سابقہ جسم کا کچھ حصہ باقی نہیں رہتا۔ پہلے تحقیق یہ تھی کہ سابقہ جسم نئے جسم میں سات سال کے عرصہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اب کہا جاتا ہے کہ یہ تبدیلی تین سال میں عمل میں آجاتی ہے۔ بہر حال یہ تبدیلی تین سال میں ہو یا سات سال میں ان کی اس تحقیق میں کوئی اختلاف نہیں کہ کچھ عرصہ کے بعد انسان کا سابقہ جسم یکسر نئے جسم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

اب آپ سوچئے کہ اگر انسان عبارت ہو صرف اس کے جسم سے تو تین یا سات سال کے بعد پہلا فرد (INDIVIDUAL) ختم ہو جائے گا۔ اور اس کی جگہ ایک نیا فرد لے گا۔ اس تبدیلی کا عملی دنیا میں اثر کیا ہوگا اس کا اندازہ ایک مثال سے لگائیے۔ دس سال پہلے زید نے آپ سے کچھ روپے بطور قرض لئے اور آپ کو رسید یا نسیک لکھ کر دے دیا۔ اب وہ قرضہ کی واپسی سے انکار کرتا ہے۔ آپ اس کی تحریر عدالت میں پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنی مدافعت میں ڈاکٹر کی شہادت پیش کر دیتا ہے کہ جس زید نے دس سال پہلے یہ تحریر لکھی تھی اس کے جسم کا ایک ذرہ بھی موجودہ زید میں باقی نہیں۔ وہ زید مدت ہوئی فنا ہو گیا۔ اب اس کی جگہ ایک نیا زید وجود میں آ گیا ہے۔ اگر اس (موجودہ) زید سے روپیہ وصول کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرضہ کوئی لے اور اس کی ادائیگی کوئی اور کرے۔ اور اگر قرضہ کی عدم ادائیگی کی صورت میں اسے کچھ سزا دی جاتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ کرے کوئی، بھرے کوئی۔ یہ انتہائی ظلم ہوگا۔ اب سوچئے کہ اگر اس نظریے کو صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ انسان صرف اس کے جسم سے عبارت ہے تو عملی دنیا میں اس کے کیا نتائج ہوں گے؟ نہ کوئی عہد معاہدہ باقی رہے گا نہ قول و قرار۔ نہ کسی سے ضابطہ اور قانون کی پابندی کرائی جاسکے گی۔ نہ مواخذہ اور باز پرس ہو سکے گی۔ نہ کسی کو کسی جرم کا مرتکب قرار دیا جاسکے گا، نہ سزا کا مستوجب۔ اور تو اور اگر دس سال کے بعد کسی کی بیوی اس سے کہہ دے کہ جس عورت نے تم سے نکاح کا عہد باندھا تھا وہ ختم ہو چکی ہے میں اُس عہد کی پابند نہیں۔ تو (مذکورہ صدر نظریہ کی رو سے) وہ ایسا کہنے میں حق بجانب ہوگی۔ اسی حقیقت کے پیش نظر (BRIGHTMAN) نے کہا ہے کہ

اخلاقی نظام کا دار و مدار اس مسئلہ پر ہے کہ میں اپنے تمام گزشتہ فیصلوں اور معاہدوں کا ذمہ دار ہوں۔ اس لئے کہ اگر میں کچھ عرصہ کے بعد وہی نہیں رہتا جو پہلے تھا تو اس صورت میں اپنے سابقہ فیصلوں اور معاہدوں کا ذمہ دار ہی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ لہذا ان فیصلوں کی خلاف ورزی اور ان معاہدوں کی شکست کا الزام مجھ پر کیسے عائد ہو سکتا ہے۔

آپ ان خارجی مثالوں سے قطع نظر خود اپنے آپ پر نگاہ ڈالئے۔ بات سمجھ میں آجائے گی۔ آپ کی مالیہ عمر اگر چالیس سال کی ہے تو (مذکورہ صدر نظریے کے مطابق) آپ کم از کم پانچ چھ مرتبہ بدل چکے ہیں اور بالکل نئے "فرد" بن چکے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس یہ حقیقت ہے کہ جس واقعہ نے آپ کی زندگی کو دس برس کی عمر میں متاثر کیا تھا اُس کی یاد آج بھی آپ کے دل میں خوشی یا غم کی وہی کیفیات پیدا کر دیتی ہے جن کیفیات کو آپ نے اُس وقت محسوس کیا تھا۔ آپ ایک لمحے کے لئے بھی اس کا تصور نہیں کر سکتے کہ جس فرو پروہ کیفیتیں گزری تھیں وہ میں نہیں ہوں کوئی اور تھا۔ ہم میں سے کون ہے جس نے تمہارا مور کی اس نظر کشی میں اپنی آرزوؤں کا رنگ بھلکتے نہ دیکھا ہو جس کا نادر کا کو روٹی نے اس حسین انداز سے پیش کیا ہے کہ

اکثر شب تنہائی میں کچھ دیر پہلے نیند سے
گزری ہوئی دلچسپیاں بیٹے ہوئے دن عیش کے
بننے ہیں شمعِ زندگی اور ڈالتے ہیں روشنی

میرے دل صد چاک پر
وہ بچپن اور وہ سادگی وہ رونا اور ہنسنا کبھی
پھر وہ جوانی کے مزے وہ دل لگی وہ قہقہے
وہ عیش وہ مہر و وفا وہ وعدہ اور وہ شکریہ
وہ لذتِ بزمِ طرب یاد آتی ہے ایک ایک سب

یوں ہی شب تنہائی میں کچھ دیر پہلے نیند سے
بیتی ہوئی ناکامیاں گزے ہوئے دن رنج کے
بننے ہیں شمعِ زندگی اور ڈالتے ہیں روشنی

ان حسرتوں کی قبر پر
جو آرزوئیں پہلے تھیں پھر غم سے حسرت بن گئیں

ہم میں سے کون ہے جو یہ کہے گا کہ وہ عیش وہ دلچسپیاں، وہ رنج اور ناکامیاں، جن کی یاد اکثر شب تنہائی میں۔
کچھ دیر پہلے نیند سے۔ غم و مسرت کے سنے جلے تاثرات سے افقِ قلب پر قوسِ قزح کی غم آلود رنگینیاں پیدا کئے چلی جاتی
ہے، میری نہیں، کسی اور کی تھیں، کیونکہ میں تو اپنے جسمانی خلیات کے فنا اور تبدیل ہو جانے سے مدت ہوئی ناپید ہو چکا ہوں۔
ہمارا اپنا تجربہ، اپنا احساس اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے کہ "میں" اس جسم کا نام نہیں جو ہر سات یا تین سال کے بعد
بالکل نیا ہو جاتا ہے، "میں" اس حقیقت ثابتہ کا نام ہے جو جسم کے تغیرات کے علی الرغم ہمیشہ غیر متبدل رہتی ہے۔ تغیرات کے بحر
متلاطم میں اس تغیر نا آشنا گہر تابدار کا نام انسانی ذات ہے۔ بار دیو کے الفاظ میں

(PERSONALITY IS CHANGELINESS IN CHANGE)

انسانی ذات، تغیرات کی دنیا میں ثبات کا نام ہے۔

”ہی“ میں ”دیا انسانی ذات“ ہے جو ایک فرد کے تمام اعمال کی ذمہ دار اور ان کے نتائج و عواقب کی موثر ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ جن باتوں کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے وہ انسانی حافظہ کے کرشمے ہیں۔ اس میں ذات کا کوئی تعلق نہیں۔

ذات اور حافظہ | اگر کسی انسان کا حافظہ کم ہو جائے تو اسے نہ اپنی سابقہ زندگی کا کوئی واقعہ یاد رہتا ہے نہ کسی واقعہ کا تذکرہ اس پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جب حافظہ درست ہو جائے تو ماضی کے واقعات پھر اسی طرح اثر انداز ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ لہذا یہ سب حافظہ کا کھیل ہے۔

لیکن یہ خیال سطح بینی کا نتیجہ ہے۔ حقیقت پر مبنی نہیں۔ انسانی ذات اپنے فیصلوں کو بروئے کار لانے کے لئے جسم کے اعضاء اور جوارج کو اپنا آلہ کار بناتی ہے۔ آپ کسی چیز کو پکڑنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ آپ کا ہاتھ آگے بڑھتا ہے اور اس چیز کو پکڑ لیتا ہے۔ اگر (خدا نکر وہ) آپ کا ہاتھ مفلوج ہو جائے تو وہ اس چیز کو پکڑنے کے لئے آگے نہیں بڑھے گا۔ کیا ہاتھ کی عدم حرکت سے آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ آپ کے اندر ارادہ کرنے والی شے کوئی نہیں؛ سب ہاتھ کا کرشمہ تھا۔ جب ہاتھ بیکار ہو گیا تو معاملہ ختم ہو گیا؛ آپ ایسا کبھی نہیں کہیں گے۔ آپ کے اندر فیصلہ یا ارادہ کرنے والی شے اب بھی بدستور موجود ہے۔ فرق اتنا پڑا ہے کہ اب اس کا ارادہ مشہود شکل میں آپ کے سامنے نہیں آتا کیونکہ جس ہاتھ نے اس ارادہ کا مظہر بنا تھا وہ ہاتھ بے حس حرکت ہو چکا ہے۔ اب اس مثال سے آگے بڑھئے۔

انسان کے تمام اعمال (خواہ وہ دل کی آرزو میں ہوں یا محسوس افعال) اس کی ذات پر نقوش مرتب کرتے ہیں۔ انسانی ذات اپنے ان نقوش کو دماغ کے ذریعے مشہود کرتی ہے۔ اس کا نام حافظہ ہے۔ اگر دماغ کسی بیماری یا حادثہ سے مفلوج ہو جائے تو وہ انسانی ذات کے نقوش کو ابھار کر سامنے لانے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے۔ جب یہ اچھا ہو جائے تو اس میں پھر وہی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

اسے بھی ایک مثال کے ذریعے سمجھئے۔ ریڈیو سٹیشن پر کوئی مغنی آتش نفس اپنی آواز کی شعلہ باریوں سے فضا کے بحر متلاطم میں آگ لگاتے جاتا ہے۔ آپ کا ریڈیو سیٹ ان برقی لہروں کو اپنے تاروں پر لیتا ہے۔ اور اس طرح اس میں سے وہی آواز پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ اس موسیقی کی کیف باریوں سے لذت اندوز ہو رہے ہیں کہ یکایک آپ کے سیٹ کا بلب اڑ جاتا ہے۔ وہ آواز ختم ہو جاتی ہے۔ ریڈیو سٹیشن پر گانے والا اب بھی گارہا ہے۔ برقی لہریں اب بھی آپ کے کمرے میں موجود ہیں۔ لیکن آپ انہیں محسوس نہیں کرتے۔ اس لئے کہ وہ آلہ جو ان لہروں کو مشہود بنانے کا ذریعہ تھا، جڑ گیا ہے۔ آواز بدستور موجود ہے۔ اس کا ذریعہ اظہار باقی نہیں رہا۔ دماغ ریڈیو سیٹ ہے اور انسانی ذات ریڈیو سٹیشن سے براڈ کاسٹ کرنے والا مغنی۔ ریڈیو سیٹ کی خرابی کے یہ معنی نہیں کہ ریڈیو سٹیشن پر مغنی ہی نہیں رہا۔ وہ تو بدستور موجود ہے۔ اس کی آواز کی نمود کا ذریعہ خراب ہو گیا ہے۔ یا مثلاً آپ آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہیں۔ آئینہ گر کر چور چور ہو جاتا ہے۔ اب سامنے دیوار پر آپ کا عکس دکھائی نہیں دیتا۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ کا وجود باقی نہیں رہا۔ وہ تو بدستور باقی ہے۔ وہ ذریعہ جس سے آپ کے عکس کی نمود ہوتی تھی باقی نہیں رہا۔

لہذا دماغ اصل ذات نہیں۔ وہ پردہ ہے جس پر ذات اپنے نقوش کی نمائش کرتی ہے۔ برگسان نے اس موضوع پر ایک نہایت عمدہ کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (MATTER AND MEMORY) وہ اس نکتہ پر بحث کرنے کے بعد کہ حافظہ مادہ کی پیداوار نہیں بلکہ انسانی ذات کے عمل کی نمائش ہے، لکھتا ہے۔

ہم نے اب سمجھ لیا ہے کہ حافظہ کیوں دماغ کی کیفیت کا نام نہیں ہو سکتا۔ دماغ حافظہ کے تسلسل کو قائم رکھتا ہے اور اسے مادی قالب میں سمو کر اس قابل بنا دیتا ہے کہ یہ حال پر اپنا تصرف جما سکے۔ لیکن خالص حافظہ مادی نہیں۔ یہ روحانیت کا مظہر ہے۔ حافظہ کی دنیا دراصل روحانیت کی دنیا ہے۔

ڈاکٹر گیلووی (GALLOWAY) نے اپنی کتاب میں حیات جاوید IMMORTALITY پر بحث کرتے ہوئے اس نکتہ کے متعلق بھی گفتگو کی ہے کہ کیا حافظہ انسانی دماغ کا فعل ہے۔ وہ اس باب میں لکھتا ہے۔

یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ حافظہ ان نقوش کا نام ہے جو انسان کے دماغ پر مرتب ہوتے ہیں، اس لئے مرنے کے بعد یہ باقی نہیں رہ سکتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان کی بہت سی عادات کی جڑ اس کے عصبی نظام میں پیوست ہوتی ہے۔ اس لئے یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ حافظہ کلیتہً انسانی نفس کا عمل ہے، علاوہ بریں کسی حادثہ کی وجہ سے حافظہ کا جلتے رہنا یا بڑھانے میں اس کا کمزور ہو جانا اس بات کی شہادت ہے کہ حافظہ کا دار و مدار ذہنی نقوش اور عصبی نظام پر ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان چیزوں پر حافظہ کا مدار ہے کس حد تک؟ یہ واقعہ ہے کہ حافظہ کا مدار کلیتہً یا زیادہ حد تک ذہنی نقوش پر نہیں۔ اس لئے کہ اگر ایسا ہو تو حافظہ کا مدار براہ راست کسی بات کے دہرانے پر ہوگا لیکن یہ امر واقعہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حافظہ کا بیشتر مدار اس پر ہے کہ وہ چیز جسے یاد رکھنا مقصود ہے معنی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ معنویت کا تعلق انسانی نفس سے ہے نہ کہ عصبی نظام سے۔ لہذا یہ ممکن ہے کہ انسانی نفس معنوں کو محفوظ رکھنے کی جو صلاحیت رکھتا ہے، اسے انسانی جسم کی موت کے بعد بھی اپنے ساتھ آگے لے جائے اور یوں اس دنیا کا تسلسل موت کے بعد بھی قائم رہے۔ اگر اس زندگی میں جسمانی تغیرات کے باوجود نفس انسانی معنوں کو بعینہ

لے یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ اگر ایک یا معنی فقرہ کو ایک آدھ مرتبہ دیکھ لیا جائے تو وہ یاد ہو جاتا ہے لیکن اگر اس کے الفاظ کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا جائے تو الفاظ کے اس بے معنی مجموعہ کو یاد کرنے کے لئے ان الفاظ کو کئی بار دہرانے کی ضرورت پڑے گی۔

برقرار رکھ سکتا ہے، تو اس سے باور کیا جاسکتا ہے کہ یہ انہیں موت کے پیدا کردہ تغیرات کے باوجود محفوظ رکھ سکے گا۔ (صفحہ ۵۶۶ - ۵۶۵)

ذہنی عادات (MENTAL HABITS) حیوانی سطح زندگی کی چیز ہے۔ جس بات کو بار بار دہرایا جائے اس سے عادت بنتی ہو جاتی ہے جو اس کے بعد از خود MECHANICALLY سرزد ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ جانوروں کو سدھانے کا طریقہ ہی یہ ہے کہ ان سے ایک کام بار بار کرایا جائے۔ اس کا تعلق (MIND) سے نہیں ہوتا۔ دماغ کے میکانیکی عمل سے ہوتا ہے۔ حافظہ کا تعلق اس شعور سے ہے جو انسانی سطح زندگی کی خصوصیت ہے اس لئے اس کی بنیاد نفس انسانی ہے نہ کہ جسم انسانی۔

پروفیسر شوڈنگر نے ایک مختصر لیکن بڑی عمدہ کتاب لکھی ہے (WHAT IS LIFE) وہ اس کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتا ہے "میں کیا ہے؟"

اگر آپ اس کا تجزیہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ یہ انسانی تجارب اور حافظہ کے مجموعہ سے کچھ زیادہ ہے۔ یہ وہ پردہ ہے جس پر حافظہ اور تجربہ کے نقوش جمع ہوتے ہیں۔ اگر آپ اپنی داخلی دنیا کا بغور مطالعہ کریں گے تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ جسے آپ "میں" کہتے ہیں وہ اس بنیاد کا نام ہے جس پر حافظہ اور تجربہ کی عمارت اٹھتی ہے۔۔۔۔۔

انسانی ذات ضائع نہیں ہو سکتی

اگر کوئی ماہر عمل تنویم ایسا بھی کرے کہ تہاری سابقہ یادداشت ذہن سے محو ہو جائے تو تم دیکھو گے کہ اس سے تہاری "میں" کی موت واقع نہیں ہو جاتی۔ انسانی ذات کبھی ضائع نہیں ہوتی۔ اس کے لئے کبھی صف ماتم نہیں بچھ سکتی۔ نہ ہی یہ کبھی ضائع ہو سکے گی۔

یہ ہے وہ "میں" (انسانی ذات) جس پر انسانی جسم کے تغیرات کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ جب انسان کا ہاتھ مفلوج ہو جائے تو انسانی ذات پھر بھی باقی رہتی ہے۔ ٹانگ مفلوج ہو جائے پھر بھی جگر بگڑ جائے پھر بھی دماغ خراب ہو جائے پھر بھی۔ یعنی انسانی جسم کے جتنے حصے (اعضار و جوارح) جی چاہے خراب اور ختم ہوتے جائیں، اس سے انسانی ذات ختم نہیں ہو جاتی۔ لہذا اگر انسانی جسم سارے کا سارا ختم (DISINTEGRATE) ہو جائے، تو بھی انسانی ذات کا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔ یعنی اگر اس کی طبعی موت واقع ہو جائے تو اس کی ذات پھر بھی باقی رہتی ہے۔ موت کا دھچکا انسانی ذات کا کچھ نہیں بگاڑتا۔ یہ اس کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔ اسے حیات بعد الممات کہتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے باب میں لکھا جا چکا ہے انسانی ذات کی نشوونما مقصد زندگی ہے اور یہی اسلامی معاشرہ کی ذمہ داری ہے۔ اگر انسانی ذات کی مناسب نشوونما ہو جائے تو یہ انسانی جسم کی موت کے بعد مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔

تفصیل اس اجمال کی آئندہ ابواب میں ملے گی۔ اوپنسنسکی اس ضمن میں گرجیف کے الفاظ میں کہتا ہے:-
 اگر انسان ہر آن بدلتا ہے۔ اگر اس میں کوئی شے ایسی نہ ہو جو خارجی تغیرات سے متاثر نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا
 کہ اس میں کوئی شے ایسی نہیں جو موت کا مقابلہ کر سکے۔ لیکن اگر وہ خارجی اثرات سے آزاد ہو جائے۔ اگر اس میں
 اس شے کی نمود ہو جائے جو اپنی زندگی جتنے تو یہ شے کبھی مر نہیں سکتی۔ عام حالات میں ہم ہر ثانیہ مرتے رہتے ہیں۔
 خارجی حالات بدلتے رہتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہم بھی بدل جاتے ہیں۔ اس طرح ہمارے بہت سے "انا" فنا
 ہوتے ہیں۔ لیکن اگر انسان اپنے اندر مستقل انا کو نشوونما دے لے تو یہ خارجی تغیرات سے غیر متاثر رہ سکتا ہے۔
 اور اس طرح طبعی جسم کی موت کے بعد بھی زندہ رہ سکتا ہے۔

اقبال کے الفاظ میں۔

زندگانی ہے صدفِ قطرہ نیناں ہے خودی وہ صدف کیا کہ جو قطعے کو گہر کر نہ سکے

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیس و خودی یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

(جیسا کہ باب اول میں کہا جا چکا ہے) ذاتِ خداوندی مکمل ترین ذات ہے اس کے متعلق قرآن میں ہے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَبَسْفَىٰ وَجْهَهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ (۲۷-۲۶/۵۵)

کائنات کی ہر شے میں ہر آن تغیر واقع ہوتا رہتا ہے لیکن یہ خدا کی ذات ہے جو تغیرات سے نا آشنا ہے۔ وہ بڑے اجلال و
 اکرام کی مالک ہے۔ جو انسانی ذات کی نشوونما ہوتی جاتی ہے اس میں (حدودِ بشری کے اندر) صفاتِ خداوندی کی نمود
 ہوتی جاتی ہے۔ خارجی تغیرات سے غیر متاثر رہنا خدا کی بنیادی صفات میں ہے۔ اس لئے ایسا انسان بھی خارجی حوادث سے
 غیر متاثر رہتا ہے۔ وہ اقبال کی آرزو۔

با اضطراب موج سکون گہر بدہ

فنا میں بقا کا مظہر بنتا چلا جاتا ہے۔ عام حالات میں ہماری کیفیت یہ ہوتی ہے کہ (مثلاً) میں نے رات کو سوتے
 وقت ارادہ کیا کہ صبح پانچ بجے اٹھوں گا۔ صبح پانچ بجے الارم بجا۔ میں جاگ اٹھا۔ لیکن باہر کی سردی اور

لحاف کی خواب آور نرمی اور گرمی سے یہ فیصلہ کر لیا آج نہیں، کل ضرور صبح سویرے اٹھ بیٹھوں گا اور سیر کو جاؤں گا۔ سوال یہ

ہے کہ کیا رات کو فیصلہ کر کے سونے والا "میں" اور صبح کو اس فیصلے کی خلاف ورزی کرنے والا "میں" ایک ہی تھا؟ یا مثلاً میں

نے آپ سے وعدہ کیا ہے کہ میں فلاں معاملہ میں آپ کا ساتھ دوں گا لیکن عین وقت پر میں آپ کا ساتھ چھوڑ جاتا ہوں۔ سوال

یہ ہے کہ کیا وہ وعدہ کرنے والا "میں" اور ساتھ چھوڑنے والا "میں" ایک ہی تھا؟ "میں" کے اس طرح بدل جانے کا مطلب یہ

ہے کہ میری ذات بہت کمزور ہے۔ اس کی نشوونما نہیں ہوتی۔ نشوونما یافتہ ذات کی پہلی پہچان یہ ہے کہ وہ خارجی حوادث سے متاثر ہو کر اپنے فیصلوں کو بدلتی نہیں۔ جن لوگوں کی ذات میں نشوونما شروع ہو جائے (یعنی جماعتِ مومنین) قرآن نے ان کے متعلق کہلے کہ إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا آمَنَّا بِاللَّهِ ثُمَّ اسْتَقَامُوا..... (۳۱/۳۰) جو ایک دفعہ اس حقیقت پر ایمان لے آتے ہیں کہ ہمارا نشوونما دینے والا اللہ ہے تو پھر اس پر ہم کہ کھڑے ہو جاتے ہیں اور مخالفتوں کے ہجوم ان کے پائے استقلال میں ذرہ بھر لغزش پیدا نہیں کرتے۔ بلکہ اس سے ان کا ایمان اور محکم ہو جاتا ہے (۳/۱۴۳)۔ انسانی ذات کی نشوونما کی یہ پہلی علامت ہے۔ یہی ذات ہے جس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

چو مرگ آید تبستم بر لبِ اوست

موت کا احساس بھی اس میں کسی قسم کا تغیر پیدا نہیں کر سکتا۔ انسان میں ہر آن ایک نئی "میں" کا پیدا ہو جانا (یعنی اس کا گھڑی گھڑی بدلتے رہنا) اس کا اپنی ذات کے ساتھ شرک ہے۔ اور شرک انسانیت کے لئے وجہ تذلیل۔ خدا کی احدیت (قل هو الله احد) کے بھی یہی معنی ہیں کہ وہ ذات تغیر پذیر نہیں۔

∴

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے قرآن کریم نے صفاتِ خداوندی کو بڑی شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ ان صفات میں سے انہیں چھوڑ کر جو ذاتِ خداوندی ہی کا خاصہ ہو سکتی ہیں (مثلاً هُوَ الْأَدَلُّ وَهِيَ الْأَزَلُّ) باقی صفات وہ ہیں جن کی نمود انسانی ذات کے اندر ہو سکتی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ان صفات کا بیان خود انسانی ذات کے لزوم و خصائص کا بیان ہے۔ اسی لئے قرآن میں ہے کہ لَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيهِ ذِكْرُكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۲۱/۱۰) ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب نازل کی ہے کہ اگر تم عقل و فکر سے کام لو تو تمہیں نظر آجائے کہ اس میں خود تمہارا **قرآن میں انسان ہی کا ذکر ہے** ہی ذکر ہے۔ یہ صفات متعدد ہیں لیکن ان میں سے بعض ایسی بھی ہیں جو

ایک اعتبار سے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان صفات کو سورۃِ اخلاص میں (جو یوں تو صرف چار مختصر آیات پر مشتمل ہے لیکن ان آیات کو پھیلائیے تو ان میں کائناتِ ذات کے چاروں گوشے سمٹ کر آجاتے ہیں) بڑی جامعیت سے بیان کیا گیا ہے۔ پہلی آیت ہے **قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ** (۱۱۲/۱) یعنی ذات کی پہلی خصوصیت احدیت ہے۔ احدیت بڑی جامع اصطلاح ہے۔ جس کا ترجمہ ایک لفظ میں نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں تفرید (UNIQUENESS) توحید (ONE-NESS)

اور وحدت و جامعیت WHOLENESS کے تمام رشتے آجاتے ہیں۔ ذاتِ اول و آخر۔ ظاہر و باطن ذات ہی ہوتی ہے (۵۴/۳)۔ اس میں کسی اور شے کی آمیزش کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اقبال کے الفاظ میں۔

گہریں آب گہکے سوا کچھ اور نہیں

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ ناپختہ خودی کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ رات کو سوتے وقت کچھ اور ہوتی ہے اور صبح کو جاگتے وقت کچھ اور۔ وعدہ کرتے وقت کچھ اور اور وعدہ توڑتے وقت کچھ اور۔ غصے کی حالت میں کچھ اور اور پشیمانی کے بعد کچھ اور یہ ذات کی وحدت (توحید) کی علامت نہیں۔ شرک کی علامت ہے۔ توحید یہ ہے کہ ذات خارجی حوادث یا داخلی جذبات سے متاثر ہو کر بدلتی نہ رہے۔ وہ اپنے خصوص و لزوم میں ہمیشہ یکساں ہے (ذات کی اس خصوصیت کو غیر متبدل اصول یا غیر متغیر قوانین کہتے ہیں)۔ قرآن کی ”سنت اللہ“ کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے کہ **وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا** (۳۲/۴۲) ”تو کبھی سنت اللہ میں تبدیلی نہیں پائے گا“۔ انسانی ذات کی اس خصوصیت کو ”کیریکٹر“ کہا جاتا ہے۔ بار دیو کے الفاظ میں ذات کی نمود کیریکٹر میں ہوتی ہے۔ پروفیسر وائٹ ہیڈ (A.N. WHITE HEAD) نے کہا ہے کہ ”ظاہر کا حقیقت کے ساتھ منطبق ہونا صداقت کہلاتا ہے“۔ انسانی ذات کے ظہور و بطون میں وحدت اس کی زندہ شہادت اور واضح دلیل ہوتی ہے۔

انسانی ذات کی انفرادیت INDIVIDUALITY کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ میں اپنے تمام ارادوں، فیصلوں اور اعمال و افعال کا ذمہ دار خود آپ ہوں۔ اس لئے ان کے نتائج و عواقب بھی مجھے ہی برداشت کرنے ہوں گے۔ اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو

سکتا۔ قرآن کے قانون مکافاتِ عمل کی ساری عمارت اس بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ **قانون مکافاتِ عمل**

اٹھائے گا: اس کا بنیادی اصول ہے۔ اس باب میں نہ کسی کی سفارش کسی کے کام آسکتی ہے نہ فدیہ۔ نہ کوئی کسی کا کفارہ بن سکتا ہے نہ معاوضہ۔ نہ کوئی کسی کی مدد کر سکتا ہے نہ معاونت۔ **وَالْقَوَا يُؤَمِّرُونَ مَا لَا تَجْرِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ** (۲/۲۸) اسی قانون مکافات کی کارفرمائی کا اعلان ہے اور (جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے) یہ انسانی ذات کی انفرادیت کا فطری نتیجہ ہے۔ جب میرے سر درد کو کسی کی سفارش، کفارہ یا فدیہ دور نہیں کر سکتا تو میرے اعمال کے اثرات کو یہ چیزیں مجھ سے کس طرح الگ کر سکتی ہیں۔ میری جنت اور جہنم ان ہی کے مطابق مرتب ہوگی۔ کوئی دوسرا اس میں دخل نہیں دے سکے گا۔ (تفصیل ان امور کی آئندہ ابواب میں اپنے مقام پر ملے گی)۔

(۲) سورۃ اخلاص کی دوسری آیت ہے **اللَّهُ الصَّمَدُ** (۱۱۲/۲)۔ صمدیت ذات کی دوسری خصوصیت ہے۔ یہ بھی ایک جامع لفظ ہے جس کا مفہوم ہے خارجی سہاروں سے مستغنی ہونا۔ اپنے ارادوں کا مالک آپ ہونا۔ اپنے فیصلوں میں خود مختار ہونا۔ ذات خداوندی کے متعلق **يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ** (۲۲/۸) اور **يَخْتَرُ مَا يُرِيدُ** (۵/۱) جیسے اشارات اسی خصوصیت کے آئندہ دار ہیں۔ ذات کی اس خصوصیت کی بنا پر انسان کو صاحب اختیار و ارادہ بنایا گیا ہے۔ اور مختلف امکانات POSSIBILITIES میں اسے

انتخاب CHOICE کا حق دیا گیا ہے اِعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ (۴۱/۲۰) تم جو چاہو کرو اور فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ (۱۸/۲۹) ”جس کا جی چاہے صدقت کو قبول کرے۔ جس کا جی چاہے اس سے انکار کرے“ انسان کے لئے ہے۔ کائنات میں کسی اور شے کو انتخاب اور فیصلہ کا حق نہیں دیا گیا چونکہ اختیار و ارادہ انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت ہے اس لئے اس کی نشوونما انہی اعمال سے ہو سکتی ہے جنہیں انسان اپنے اختیار و ارادہ سے بطیب خاطر کرے۔ نہ مجبوری کی نیکی نیکی ہے، نہ مجبوری کی بدی بدی۔ لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّينِ (۲/۲۵۶) ”دین میں کوئی زبردستی نہیں“ کے منشور سے ہی مقصود ہے۔ انسان کے اختیار و ارادہ کا اس قدر احترام کیا گیا ہے کہ اور تو اور خدا بھی (اپنی لامحدود قوتوں کے باوجود) انسانی آزادی میں دخل نہیں دیتا۔ یہ اس کا اپنا فیصلہ ہے جس پر وہ قائم رہتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

خدا بھی ایسا نہیں کرتا کہ میری جگہ خود محسوس کرنا یا حکم لگانا شروع کر دے یا یہ کہ اگر میرے سامنے ایک کی بجائے دو راستے ہیں تو وہ میرے لئے خود ایک کا انتخاب کرے۔

(خطبات تشکیل جدید (انگریزی) ص ۹۵، ۱۹۳۳ء ایڈیشن)

انسان کی انسانیت اس کے اختیار و ارادہ سے وابستہ ہے۔ یہ ذات کی صفتِ صمدیت کا تقاضا ہے۔ واضح رہے کہ ذات کا اپنی مرضی سے اپنے اوپر پابندی عائد کر لینا اس کی آزادی کے منافی نہیں۔ (آزادی کے منافی وہ پابندی ہے جسے کوئی دوسرا اس کی مرضی کے خلاف عائد کرے)۔ اس قسم کی پابندیاں خود ذاتِ خداوندی نے بھی اپنے اوپر عائد کر رکھی ہیں۔ مثلاً قرآن میں ہے کہ کَتَبَ مَا بَكَرُ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (۶/۵۴) ”تمہارے رب نے رحمت و ربوبیت کو اپنے اوپر واجب کر رکھا ہے“۔ انسان بھی اپنی ذات کے نشوونما کے لئے جو پابندیاں بطیب خاطر اپنے اوپر عائد کرتا ہے وہ اس کے شرفِ انسانیت کے منافی نہیں ہوتیں۔ قرآنی معاشرہ آزادی اور پابندی کے اسی بنیادی تصور کا مظہر ہوتا ہے جس میں افراد کی ذات نشوونما پاتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ (۳) سورۃ اخلاص کی تیسری آیت ہے۔ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ لَئِنْ لَدَّۤا (۱۱۲/۲) جس کا عام ترجمہ ہے: ”نہ اس نے کسی کو بسلسلہ تولید پیدا کیا ہے۔ نہ وہ کسی سے بسلسلہ تولید پیدا ہوا ہے“۔ یہ بھی ذات کی بنیادی خصوصیت ہے۔ انسانی جسم بسلسلہ تولید (PROCREATION) پیدا ہوتا ہے۔ یہ ”پیدائش“ کی حیوانی سطح ہے۔ اس سے ایک فرد اپنے باپ کی اولاد بنتا ہے۔ اور اسی سے اس کی اولاد پیدا ہوتی ہے۔ لیکن انسانی ذات پیدائش کے اس سلسلہ کا نتیجہ نہیں۔ پیدائش بسلسلہ توالد و تناسل کی صورت میں باپ کا ایک حصہ اس سے الگ ہو کر بیٹے کے جسم کا جزو بنتا ہے۔ لیکن ذات ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے۔ اس کے حصے بخرے نہیں ہو سکتے۔ اگر ذات کا کوئی حصہ اس سے الگ ہو جائے تو ذات نامکمل رہ جاتی ہے۔ اور ذات کا نامکمل ہونا ذات کی بنیادی خصوصیت کے خلاف ہے۔

افزائش نسل (یعنی بذریعہ تولید بچے پیدا کرنا) نوع انسانی کی بقا کے لئے ضروری ہے۔ لیکن ذات کا تقاضا تولید (PROCREATION) نہیں، تخلیق (CREATION) ہے (جیسا کہ پہلے باب میں بتایا جا چکا ہے) یہ خصوصیت انسان کی ہے کہ وہ خالق کائنات کے تخلیقی پروگرام میں شریک ہوتا ہے (اس لئے کہ کائنات میں کبھی اور شے کو ذات دی ہی نہیں گئی)۔ یہی وجہ شرف انسانی ہے۔

(۴) سورہ اخلاص کی چوتھی آیت ہے۔ دَلَّمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدًا ۝ (۱۱۲/۴) ”اس کا ہم پتہ اور ہمسر کوئی نہیں“ جس قوم کے افراد کی ذات کی نشوونما ہو رہی ہو دنیا کی کوئی دوسری قوم اس قوم کی ہمسر نہیں ہو سکتی۔ قرآن نے جب جماعتِ مومنین کے لئے کہا کہ اَنْتُمْ اَلْاَعْلَوْنَ (۳/۱۳۹) ”تم سب پر غالب رہو گے“ تو اس میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) قرآن کریم نے صفاتِ خداوندی کا تعارف نہایت شرح و بسط سے کرایا ہے۔ اور اس کا تذکرہ اس کی آیات میں مختلف مقامات پر درخشندہ موتیوں کی طرح بکھرا ہوا ہے۔ انسانی ذات میں ان صفات کا منعکس ہوتے جانا، اس (ذات) کی نشوونما کی علامت ہے۔ آئندہ باب میں بتایا جائے گا کہ اس نشوونما کا طریقہ (یا اس کے لئے ہدایات) انسان کو ملتی کس طرح سے ہیں۔



جیسا کہ باب اول میں بتایا جا چکا ہے، دین کی عمارت، انسانی ذات کے عقیدہ پر استوار ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے اس تصور یا عقیدہ کو دین کے نظام میں جس قدر اہمیت ہو سکتی ہے، وہ ظاہر ہے۔ آئندہ ابواب میں آپ کو جگہ بہ جگہ ذات انسانی کا ذکر نظر آئے گا اور اس کے مختلف خصائص و شئون کی تفصیل آپ کے سامنے آئیں گی۔ لیکن اس عقیدہ کی اہمیت کے پیش نظر ہم چاہتے ہیں کہ اس مقام پر مختصر الفاظ میں انسانی ذات کے مختلف گوشوں کو دہرایا جائے تاکہ آئندہ ادراک میں جہاں جہاں اس کا ذکر آئے، یہ حقائق پیش نظر رہیں اور اس کے متعلق کسی مقام پر بھی غلط تصور قائم نہ ہو سکے۔ انہیں غور سے دیکھئے۔

(۱) قرآن کریم نے ذی حیات مخلوق کے سلسلہ تخلیق اور اس کی مختلف کڑیوں کا ذکر متعدد مقامات میں کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک مقام وہ آتا ہے جہاں عملِ تخلیق بذریعہ تولید و تناسل وقوع پذیر ہوتا ہے۔ یعنی حیوانات کی تخلیق، جس میں جنین ایک مدت تک رحمِ مادر میں پرورش پاتا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن نے پہلے ان تمام مراحل کو گنایا ہے جن سے عام حیوانات کے بچے اور انسانی جنین، رحمِ مادر میں گزرتے ہیں۔ مثلاً لَطْفًا كَالْوَتْرِ (عَلَقَةً) میں تبدیل ہونا۔ لَوْتَرُ كَالْمُضْغَةِ (گوشت کے ٹکڑے) کی شکل اختیار کرنا۔ پھر اس میں ہڈیاں (عِظْمًا) بننا۔ پھر ہڈیوں پر گوشت کا پردہ چڑھنا۔ یہ وہ مراحل ہیں جن میں سے حیوانی اور انسانی جنین ایک ہی انداز سے گزرتے ہیں۔ اس کے بعد قرآن نے، انسانی جنین کے متعلق کہا ہے کہ ثُمَّ اَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا اٰخَرَ (۲۳/۱۴)

”پھر ہم نے اسے ایک جداگانہ قسم کی مخلوق بنا دیا۔“ گویا اس مقام میں پہنچ کر انسان دیگر حیوانات سے یکسر مختلف ہو گیا۔ دوسرے مقام پر

انسان اور دیگر حیوانات میں فرق

اس بابہ الامتیاز تبدیلی کے متعلق کہا کہ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوحِهِ (۳۲/۹) ”اللہ نے اس میں اپنی روح (توانائی) پھونک دی۔“ یہ ہے وہ خصوصیت جس سے انسان دیگر حیوانات سے منفرد ہو جاتا ہے اور جس کی وجہ سے کائناتی قوتیں (ملائکہ) اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتی ہیں۔ سورہ ص میں ہے۔ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰئِكَةِ اِنِّیْ خَلَقْتُ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ فَاِذَا اسْتَوٰیۡتُمْۤ اَ و نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سَاجِدٰتٍ (۲۸/۷۱-۷۲) ”جب تیرے رب نے ملائکہ سے کہا کہ میں مٹی (غیر جاندار مادہ) سے تخلیقِ انسانی (کی ابتداء) کرنے والا ہوں۔ سو جب میں اس کا تناسب درست کر کے اس میں اپنی توانائی پھونک دوں تو تم اس کے سامنے فرمانبرداری کرتے ہوئے جھک جانا۔“

یہ شے جسے خدا نے اپنی توانائی ”کہہ کر پکارا ہے“ صرف انسان کو عطا ہوتی ہے اور کسی کو نہیں۔ اس باب میں (کہ انسان حیوانات سے یکسر جداگانہ مخلوق ہے) ہمارے دور کا ایک ماہرِ نظریہ ارتقاء (SIMPSON) اپنی کتاب (THE MEANING OF EVOLUTION) میں لکھتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ انسان بھی ایک حیوان ہے۔ لیکن یہ کہنا ٹھیک نہیں کہ انسان صرف حیوان ہے۔... اگر یہ کہا جائے کہ انسان صرف حیوان ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم ان تمام خصوصیات کے وجود کا انکار کرتے ہیں جو صرف انسان کے اندر ہیں اور باقی حیوانات میں سے کسی میں موجود نہیں۔... اس حقیقت کا اعتراف کرنا نہایت ضروری ہے کہ انسان ایک حیوان تو ہے لیکن اس کی ہستی کی انفرادیت کی بنیاد وہ خصوصیات ہیں جن میں کوئی اور حیوان اس کا شریک نہیں۔ فطرت میں انسان کا مقام اور اس مقام کی بلند ترین اہمیت انسان کی حیوانیت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی انسانیت کی وجہ سے ہے۔... انسان بالکل ایک نئی قسم کا حیوان ہے۔ ایک ایسا حیوان جس میں اگرچہ طبعی ارتقاء کا سلسلہ بھی جاری ہے لیکن اس باب میں ایک باسکل نئی قسم کا ارتقاء بھی نمودار ہو رہا ہے۔ (صفحہ ۲۸۶-۲۸۳)

یہ شے عقل نہیں (۲) یہ شے عقل (INTELLECT) بھی نہیں۔ عقل اور دین کے متعلق چوتھے باب میں بڑی تفصیلی بحث کی گئی ہے اس لئے اس مقام پر اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس اجمالی

نکتہ کی تفصیل آگے چل کر سامنے آئے گی۔ یعنی باب چہارم میں۔

یہ سائیکولوجی سے متعلق ”نفس“ بھی نہیں (۳) نہ ہی یہ وہ چیز ہے جسے ماہرین علم النفس — (PSYCHE) سے تعبیر کرتے ہیں۔ یا جسے علم تحلیل نفسی

(PSYCHO ANALYSIS) کی رُو سے تحت الشعور (SUB-CONSCIOUS MIND) کہا جاتا ہے۔

(نہ ہی یہ وہ شے ہے جسے قدیم فلسفہ میں "روح" (SPIRIT) کہتے تھے اور جو مادہ (MATTER) کی نقیض سمجھی جاتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ دورِ حاضر کی تحقیقات کی رُو سے خود مادہ کا وہ تصور ہی باقی نہیں رہا جو اس سے پہلے عام فکرِ انسانی پر چھایا ہوا تھا۔ اب مادہ کوئی ٹھوس شے نہیں رہا۔ سر جیمز جینس لے معصور لہریں (BOTTLED UP WAVES) کہتا ہے۔ رسل اسے مربوط حوادث (INTER-RELATED EVENTS) کہہ

روح بھی نہیں

کر پکارتا ہے۔ آئن سٹائن اسے منجھد خیالات (CONSIDERED THOUGHTS) سے تعبیر کرتا ہے۔ اڈولف ہینکسکی اسے محض ایک (CONDITION) قرار دیتا ہے۔ خاص طبعی نقطہ نگاہ سے دیکھے تو مادی شے چھوٹے چھوٹے ذرات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ جنہیں (MOLECULES) کہتے ہیں۔ ان کا تجزیہ کیا جائے تو یہ اپنے سے بھی زیادہ چھوٹے چھوٹے عناصر کا مجموعہ ہوتے ہیں جنہیں (ATOMS)

کہا جاتا ہے۔ ان سے آگے جائیے تو یہ الیکٹرون (ELECTRONES) اور پروٹون (PROTONS) میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ جو برق (ELECTRICITY) کے ذرات کہلاتے ہیں اور جن پر مادہ کی تعریف صادق ہی نہیں آتی۔ اس طرح مادہ (قدیم تصور کے مطابق) خود غیر مادہ ہو جاتا ہے۔ لہذا 'روح اور مادہ کی وہ ثنویت جس نے گزشتہ زمانے کے مفکرین کو اس قدر پریشان کر رکھا تھا' اب عملاً مفقود ہو گئی ہے۔ قرآن 'مادہ کے مقابلہ میں روح (SPIRIT) کا ذکر تک نہیں کرتا۔ حسی کہ اس میں روح بعضی (SOUL) کا ذکر بھی نہیں۔ وہ مادہ کائنات کی تخلیق کی ابتداء کو خدا کے "عالمِ امر" سے متعلق بتا کر آگے بڑھ جاتا ہے کیونکہ محسوسات میں گھرا ہوا ذہن انسانی ماورائے محسوسات (عالمِ امر) کی کسب و حقیقت کا ادراک ہی نہیں کر سکتا۔

لہذا وہ شے جس نے انسان کو دیگر مخلوق سے ممتاز کیا ہے 'روح' (بمعنی (SPIRIT یا SOUL) بھی نہیں۔

(۵) قرآن نے اس "شے" کو عقل (INTELLECT) 'شعور' (CONSCIOUSNESS) قلب (MIND)

یا (PSYCHE) روح (SPIRIT OR SOUL) سے الگ قرار دیا ہے اور اسے نفس کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ سورہ شمس میں ہے، وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا (۱۰-۹۱/۴) "نفس" اور وہ تمام

یہ النفس انسانی ذات ہے

اسباب و عناصر جو اسے سنوارتے اور نیکیں دیتے ہیں، اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ خدا نے اس کے اندر نشقت و انتشار (DISINTEGRATION) اور ان سے محفوظ رہنے کی صلاحیت دونوں کے امکانات رکھ دیئے ہیں جس نے اس کی نشوونما کی، وہ کامیاب ہو گیا۔ جس نے اسے دبائے رکھا (اور اُبھرنے اور پھلنے پھولنے نہ دیا) وہ ناکام و نامراد رہا۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن کس طرح نفس انسانی کو ایک منفرد، مخصوص اور مستقل شخص (ENTITY) قرار دیتا ہے۔ اسی کو انسانی ذات

(HUMAN PERSONALITY) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے اندر امکانی قوتیں ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہیں۔

بننے اور بگڑنے دونوں کی استعداد۔

ارباب علم و فکر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ جب ہم فلسفہ کی اصطلاح میں "انا" (۱) کا لفظ بولتے ہیں تو اس کا مفہوم کچھ اور ہوتا ہے لیکن جب ہم روزمرہ کی بول چال میں اس لفظ ("میں" یا "ا") کا استعمال کرتے ہیں تو اس کا مفہوم کچھ اور قرآن کریم نے بھی نفس کا لفظ ان مختلف معانی میں استعمال کیا ہے۔ روزمرہ کے بول چال میں جسے ہم "فلاں شخص" یا "اپنا آپ" وغیرہ کہتے ہیں اس کے لئے بھی نفس کا لفظ آتا ہے اور انسانی ذات کے اصطلاحی مفہوم کے لئے بھی یہ لفظ آتا ہے۔ قرآن کے طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھے۔

(۶) نفس انسانی خدا کا عطا کردہ ہے۔ یہ خدا کی ذات کا جزو نہیں۔ خدا نے اُسے مِنْ مِّنْ رُّوحِنَا کہا ہے

لیکن اپنے آپ (خدا) کو کہیں بھی "روح" سے تعبیر نہیں کیا یعنی **انسانی ذات خدا کی ذات کا جزو نہیں** اگر قرآن میں یہ لکھا ہوتا کہ خدا روح ہے اور اس نے اس (روح)

کا کچھ حصہ انسان کو دے دیا ہے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسانی ذات خدا کی ذات کا جزو ہے۔ لیکن قرآن نے کہیں ایسا نہیں کہا اس لئے یہ خدا کی ذات کا جزو نہیں۔ ذات کے اجزاء (حصے) ہو نہیں سکتے۔ انسانی ذات خدا کی روح (توانائی) کی مظہر ہے۔ یعنی اس میں صفات خداوندی کی نمود ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ بھی حدود بشریت کے اندر۔ خدا کی طرح لامحدود و لا انتہا انداز سے نہیں۔

(۷) ہم دیکھ چکے ہیں کہ انسانی ذات کو خدا نے "جدید یا منفرد تخلیق" سے تعبیر کیا ہے۔ اس لئے یہ نہ تو طبعی ارتقار

(PHYSICAL EVOLUTION) کی پیداوار ہے۔ اور نہ ہی ان طبعی قوانین کے تابع جن کے مطابق انسانی جسم کی مشینری زندگی

اور مصروف عمل رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جسم کی موت سے انسانی ذات کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ یہ اس کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ آ

اخروی زندگی | اخروی زندگی یا حیات بعد الممات کہتے ہیں۔ سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔ وَقَالُوا آءِذَا كُنَّا عِظَامًا وَرُفَاتًا ؕ اِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا (۱۷/۴۹) یہ کہتے ہیں کہ جب ہم گل سڑ

کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ جائیں گے اور بالکل منتشر DECOMPOSED ہو جائیں گے، تو اس کے بعد بھی ایک نئی پیدائش

کے لئے اٹھائے جائیں گے؟ یعنی مادی تصور حیات کے قائلین کا اعتراض (اور سوال) یہ ہے کہ مادی جسم کے اجزاء کے منتشر

ہو جانے سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ کیا اس کے بعد پھر نئی زندگی ملے گی؟ وہ کیسے مل سکتی ہے؟ اس کے جواب میں کہا گیا۔

قُلْ كُونُوا حِجَارَةً اَوْ حَدِيدًا ؕ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِي صُدُورِكُمْ۔ ان سے کہو (ہاں) تمہیں مرنے کے بعد کی زندگی

ضرور ملے گی) خواہ تمہارے مادی اجزا، مرور زمانے سے، پتھر بن جائیں یا لوہے میں تبدیل ہو جائیں۔ یا کوئی اور ایسی مخلوق جس کے متعلق تم خیال کرو کہ اس میں زندگی کی نمود نہیں ہو سکتی۔ فَيَسْأَلُونَكَ مَنْ يَحْيِيهِمْ قَالَ مَنْ يَحْيِيهِمْ مَنْ يَحْيِيهِمْ مَنْ يَحْيِيهِمْ مَنْ يَحْيِيهِمْ۔ اس پر یہ کہیں گے کہ ہمیں کون زندگی کی طرف لوٹا کر لائے گا۔ قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ (۵۱۔ ۱۴/۵۰) ان سے کہو کہ وہی خدا جو تمہیں پہلی مرتبہ عدم سے وجود میں لایا تھا۔ جو خدا نیست (NON-EXISTENCE) سے هست (EXISTENCE) کی حالت میں لا سکتا ہے، وہ جسم کی موت کے بعد بھی زندگی کو مسلسل جاری رکھ سکتا ہے۔ اس وقت زندگی کا محل (VEHICAL) "نفس انسانی" ہوگا۔ یوں زندگی کی جوئے رواں اس طبعی زندگی سے آگے چلے گی، اگر نفس انسانی جسم سے متعلق طبعی قوانین کے تابع ہوتا تو جسم کی موت کے ساتھ یہ بھی ختم ہو جاتا۔ لیکن یہ جسم کے سہارے زندہ نہیں۔ اس لئے جسم کی موت سے مرنا نہیں۔

(۸) ایک چیز ہے حیات بعد الممات SURVIVAL AFTER DEATH اور دوسری چیز ہے حیات جاودا

(IMMORTALITY) حیات بعد الممات تو ہر ذی شعور انسان کے لئے ہے۔ لیکن حیات جاودا صرف اس ذات کے حق میں آ سکتی ہے جس کی باقاعدہ نشوونما ہو چکی ہو۔ (اسے تزکیہ نفس کہتے ہیں)۔ واضح رہے کہ انسانی ذات کی نشوونما کی تکمیل اسی دنیا میں نہیں ہو جاتی۔ اس کے لئے اُسے اُخروی زندگی کی جنت میں مزید مراحل طے کرنے ہوں گے۔ اس دنیا میں اس نشوونما کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اگر وہ نشوونما ایک خاص معیار تک جا پہنچتی ہے جسے قرآن نے ثقل موازین۔ پڑا جھکنے۔ سے تعبیر کیا ہے (۶۔ ۱۱/۶) تو یہ اگلے مراحل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو اس کی نشوونما رک جاتی ہے (اسے جہنم کی زندگی کہا جاتا ہے)۔

(۹) انسانی ذات کی جنت اُخروی کی زندگی کے متعلق ہم نے کہا ہے کہ اسے "حیات جاودا" مل جائے گی۔ اس سے مراد ہے کہ دنیاوی زندگی کی طبعی موت کے بعد اسے پھر موت نہیں آئے گی۔ یعنی لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ (۵۶/۵۶) "یہ لوگ اس میں اس پہلی موت کے علاوہ (جس کا مزہ وہ پہلے چکھ چکے ہیں) موت کا مزہ نہیں چکھیں گے۔" وہ زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کریں گے۔ لیکن یہ حیات جاودا خدا کی ابدیت جیسی نہیں ہے۔ اُس جیسی ازلیت یا ابدیت کسی کو نہیں مل سکتی۔ ان لوگوں کے متعلق قرآن میں متعدد بار آیا ہے کہ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا۔ وہ جنت میں ابدی طور پر رہیں گے۔ لیکن اس ابدیت کے متعلق دوسری جگہ کہہ دیا کہ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ ۚ (۱۱/۱۰۸) "وہ اس میں اس وقت تک رہیں گے جب تک زمین و آسمان باقی ہیں۔ بجز اس کے جو مشیت خداوندی میں ہے۔" (اس آخری ٹکڑے کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ خدا کی مشیت یہی ہے کہ اسی طرح ہو۔ یعنی اہل جنت کا خلود اسی وقت تک ہی ہوگا جب تک مشیت خداوندی کے مطابق ارض و سموات کا قیام و دوام ہے)۔ ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر

یہ نہیں سمجھ سکتے کہ یہ دوام کب تک ہوگا۔ لیکن یہ واضح ہے کہ اس کی ابدیت ذاتِ خداوندی کی ابدیت جیسی قطعاً نہیں۔ حیاتِ جاوداں سے ہمارا مقصد یہی ہے۔

(۱۰) انسانی زندگی کا مقصد ذاتِ انسانی کی نشوونما ہے۔ قرآن نے وہ ضابطہ عطا کیا ہے جس کے مطابق انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے، لہذا قرآن کی رُو سے "اخلاقیات" سے مقصد اتنا ہی نہیں کہ ان کے مطابق معاشرہ قائم کیا جائے تو امن و سلامتی کی زندگی بسر ہو جاتی ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ ان کے مطابق زندگی بسر کرنے سے فرد کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ لہذا عملِ خیر سے کہتے ہیں جس سے انسانی ذات کی نشوونما ہو اور عملِ شر وہ جس سے اس کی نشوونما رک جائے۔

خیر اور شر

یہی معیار ایک اچھی اور بُری (صحیح اور غلط) مملکت کا یا معاشرہ کا ہے۔ جس مملکت یا معاشرہ میں افراد کی ذات کی نشوونما ہوتی جائے وہ حق (قرآنی اقدار) کے مطابق ہے۔ جس میں انسانی ذات کی نشوونما رک جائے وہ باطل ہے۔ اسی کو آزادی اور محکومی کہتے ہیں۔ جن افراد کی ذات کی نشوونما ہو وہ آزاد ہیں۔ جن کی نشوونما رک جائے وہ محکوم اور غلام ہیں، خواہ ان کی اپنی حکومت ہی کیوں نہ ہو۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ نظامِ سیاست و معاشرت کی عمارت بھی کس طرح انسانی ذات کے عقیدہ کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے اور اخلاقیات کا نظام بھی کس طرح اسی محور کے گرد گردش کرتا ہے۔

(۱۱) جس طرح انسانی جسم کی پرورش کے لئے قوانین مقرر ہیں اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما کے لئے بھی قوانین متعین ہیں۔ یہ قوانین مستقل اقدار کہلاتی ہیں جن کا تفصیلی ذکر ایک الگ باب میں ملے گا۔ اس مقام پر ایک مرکزی نقطہ کی طرف

اشارہ کر دینا کافی ہوگا۔ انسانی جسم کی پرورش اس چیز سے ہوتی ہے جسے وہ شخص خود کھائے یا استعمال کرے۔

انسانی ذات کی پرورش "دینے" سے ہوتی ہے

اس کے برعکس، انسانی ذات کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے وہ شخص دوسروں کی نشوونما کے لئے دے دے۔ الفاظِ دیگر جسم کی پرورش "یہ لینے" سے ہوتی ہے۔ ذات کی پرورش "دینے" سے۔ اَلَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى (۹۲/۱۸) وہ شخص جو ہر اس چیز کو جو اس کے پاس ہے (۱) اور اس کی ضروریات سے زائد ہے (۲/۲۱۹) دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیتا ہے تاکہ اس کی ذات کی نشوونما ہو جائے۔ اور جس کی ذات کی نشوونما ہو جاتی ہے وہی مقصدِ حیات میں کامیاب ہوتا ہے۔ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى (۸۷/۴)۔ (تفصیل ان امور کی اگلے باب میں ملے گی)۔ قرآن کا معاشی نظام اسی بنیاد پر استوار ہوتا ہے۔ آپ تاریخِ انسانی پر غور کریں گے تو یہ حقیقت آپ کے سامنے آجائے گی کہ وہ سوال جس نے انسان کو ہمیشہ طلسمِ پیچ و تاب

بنائے رکھا ہے، یہ ہے کہ

اسلام کے معاشی نظام کی بنیاد (۱) مختلف افراد میں کمانے کی استعداد مختلف ہوتی ہے۔ (۲) اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو زیادہ کماتا ہے، اس کے پاس اس کی ضروریات

سے زیادہ دولت آجاتی ہے۔

(۳) جس کی کمانے کی استعداد کم ہوتی ہے، اس کی کمائی اس کی ضروریات کے لئے بھی کافی نہیں ہوتی۔

(۴) معاشرہ کا توازن قائم رکھنے اور افراد کی پرورش کے لئے ضروری ہے کہ جن کے پاس زائد دولت (SURPLUS MONEY) ہے، ان کی دولت ان پر صرف کی جائے جن کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔

(۵) سوال یہ ہے کہ جن کے پاس فاضلہ دولت ہے وہ اپنی دولت دوسروں کو کیوں دے دیں؟

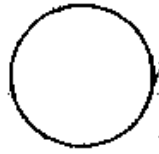
اخلاقیات کی تدبیر یہ ہے کہ دولت مندوں کو انسانی ہمدردی کا واسطہ دلا کر ان کے جذبات کو اپیل کیا جائے تاکہ وہ اپنی دولت خیرات میں دیں۔ لیکن تجربے نے بتایا ہے کہ یہ اپیلیں بہت کم کامیاب ہوتی ہیں اس لئے یہ بھی اس سوال کا تسلی بخش حل نہیں ہو سکتا۔ نیز جن لوگوں کی پرورش خیرات سے ہو ان کی خودی (ذات) تباہ ہو جاتی ہے ان میں احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے۔ اس نقطہ نگاہ سے بھی یہ تدبیر صحیح نہیں قرار پاسکتی۔ دنیا کی حکومتیں اس کے لئے ٹیکس عائد کرتی ہیں اور یوں مالداروں سے ان کی فاضلہ دولت حاصل کرتی ہیں۔ مالدار سے جبر خیرال کرتے ہیں اور ایسے حربے اختیار کرتے ہیں جن سے وہ حکومت کی دستبرد سے بچ جائیں۔ اس سے معاشرہ میں بددیانتی کا مرض عام ہو جاتا ہے۔ اگر وہ اپنی ان کوششوں میں ناکام رہتے ہیں تو وہ زیادہ کماتا ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم جان مار کر ایسی دولت پیدا کریں جو ہمارے پاس رہ نہیں سکتی۔ ہم کیوں نہ اتنا ہی کمائیں جتنا ہمارے پاس رہ سکے۔ اس سے معاشرہ کی پیداوار پر سخت مضر اثر پڑتا ہے۔ یہ ہے وہ مشکل جس میں آجکل اشتراکی نظام بُری طرح پھنسا ہوا ہے یعنی اسے وہ جذبہ محرکہ (INCENTIVE) نہیں ملتا جس سے لوگ پوری پوری محنت کر کے ملک کی دولت بڑھائیں اور اس میں صرف اپنی ضروریات کے مطابق رکھ کر باقی حکومت کے سپرد کر دیں۔

یہ جذبہ محرکہ صرف قرآن سے مل سکتا ہے جو کہتا ہے کہ جو شخص جس قدر زیادہ کماتا ہے اپنی فاضلہ دولت دوسروں کی پرورش کے لئے دے گا اتنی ہی زیادہ اس کی اپنی ذات کی نشوونما ہوگی۔ اس عقیدہ کے مطابق ہر فرد کا سب جان مار کر محنت کرتا ہے۔ لیکن فاضلہ دولت اپنے پاس نہیں رکھتا۔ اس سے ایک طرف نظام سرمایہ داری کی جڑ ٹوٹ جاتی ہے (کیونکہ اس نظام کی بنیاد ہی "فاضلہ دولت" پر ہے) اور دوسری طرف اس مشکل کا اطمینان بخش حل بھی مل جاتا ہے جس کی وجہ سے اشتراکی نظام کو پہلے استبداد کا ہنتر ہاتھ میں لینا پڑا اور اب وہ بُری طرح ناکام ہو رہا

اس مشکل کا حل

ہے۔ (ان امور کی تفصیل اپنے اپنے مقام ملے گی)۔

(۱۲) تصریحاتِ بالاسے انسانی ذات کے بنیادی خصائص بھی آپ کے سامنے آگئے اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ اسلامی نظام معاشرت و معیشت اور اخلاق و سیاست کی عمارت کس طرح اس بنیاد پر استوار ہوتی ہیں۔ آئندہ ابواب میں اس اجمال کی تفصیل آپ کے سامنے آئے گی۔



- 1- A PHILOSOPHY OF RELIGION; P-196
- 2- "NICOLAS BERDVAEV" IN "SLAVERY AND FREEDOM"
- 3- MATTER AND MEMORY BY HENRY BERGSON
- 4- WHAT IS LIFE BY ERVIN SCHRODINGER
- 5- IN SEARCH OF THE MIRACULOUS
- 6- SLAVERY AND FREEDOM
- 7- "TRUTH IS THE CONFIRMATION OF APPEARANCE TO REALITY"
A.N. WHITEHEAD IN "ADVENTURES OF IDEAS"
- 8- THE MYSTERIOUS UNIVERSE
- 9- QUOTED BY "IQBAL" IN HIS "LECTURES"
- 10- TERTIUM ORGANUM
- 11- HUMAN DESTINY

چشمہ ہدایت

جیسا کہ پہلے باب میں بتایا جا چکا ہے کائنات کی کوئی شے پہلے ہی دن اپنی مکمل شکل میں پیدا نہیں ہو جاتی۔ اس کا آغاز ابتدائی نقطہ تخلیق سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کا ارتقائی سفر شروع ہوتا ہے اس سفر کی ہر منزل میں وہ حشو و زوائد سے پاک و صاف ہو کر، بنتی، سنورتی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے تا آنکہ اس آخری منزل تک پہنچ جاتی ہے جو اس کے لئے مشیت کے پروگرام کی رو سے مقرر ہے۔ وہ ان تمام منازل کو اس راہ نمائی کی رو سے طے کرتی ہے جو اسے خالق کائنات کی طرف سے ملتی ہے۔ یہ ہے سلسلہ تخلیق و ارتقار کی وہ عظیم حقیقت جسے قرآن نے چار الفاظ میں بیان کر دیا ہے جب فرمایا کہ **الَّذِي خَلَقَ فَسُوِّيْهِ وَ الَّذِي قَدَّرَ فِهْدَىٰ** (۲۵-۲۴/۸۷) خدا وہ ہے جو ہر شے کا تخلیقی آغاز کرتا ہے۔ پھر اسے بنا سنوار کر اس میں اعتدال پیدا کرتا ہے۔

اشیائے کائنات کے لئے راہ نمائی | پھر اس کے لئے ایک اندازہ مقرر کرتا ہے کہ اس نے کس حد تک آگے جانا ہے اور کیا بننا ہے۔ اور ان تمام مراحل کو طے کرنے کے لئے اسے راہ نمائی دیتا ہے۔

ہے، زیر نظر موضوع کا تعلق اس آیت کے آخری حصے (یعنی فہدیٰ) سے ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اشیائے کائنات کو ارتقائی مراحل طے کرنے کے لئے راہ نمائی بھی خدا کی طرف سے ملتی ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس پر کائنات کی ہر چیز شاہد ہے اس لئے اس کے لئے کسی نظری دلیل یا ثبوت کی ضرورت نہیں۔ یہ "ہدایت" (راہ نمائی) ہر شے کے اندر ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہے۔ اسے قرآن نے وحی کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ (وحی کے معنی میں خفیف)

کائنات کی طرف وحی | لیکن تیز اشارہ) چنانچہ کائنات کائنات میں تیرنے والے عظیم الجثہ کروں کے متعلق

پروفیسر گیلووے اس باب میں لکھتا ہے۔ "وید معنوں میں دیکھا جائے تو نظام فطرت خود وحی ہے اس لئے کہ اس نظام سے ایک ایسا مقصد اور مفہوم سامنے آتا ہے جس کا سرچشمہ خود (علم، الہی ہے" (صفحہ ۵۸۲)

ہے۔ اَوْحِيَ فِي كُلِّ سَمَاءٍ اَمْرًا (۴۱/۲۲) ”خدا نے ہر کُرتے کی طرف اس کے متعلق وحی کر دی۔“ زمین کے متعلق ہے۔ بِانِّ رَبِّكَ اَوْحِيَ لَهَا (۹۹/۲) ”وہ ایسا اس لئے کرے گی کہ اس کے نشوونما دینے والے نے اسے اس کی وحی کر دی ہے۔“ بے جان اور غیر نامی اشیاء سے ہٹ کر جاندار چیزوں کی طرف آئیے تو وہاں بھی خدا کی وحی اسی طرح کار فرما ہے۔ چنانچہ شہد کی مکھی کے متعلق ہے وَ اَوْحِيَ رَبُّكَ اِلَى النَّعْلِ..... مِمَّا يَخْتُلُونَ (۱۶/۶۸) ”میرے نشوونما دینے والے نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کر دی ہے کہ وہ پہاڑوں میں درختوں پر تہیوں پر اپنا گھر بنائے۔“ سورۃ نور میں اس تفصیل کو سمٹا کر دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے جہاں کہا کہ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهُ..... يَفْعَلُونَ (۲۳/۳۱) ”کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ کائنات کی بلندیوں اور پستیوں میں جو کچھ ہے، نیز پرندے جو فضا میں اس طرح پھیلے ہوئے اڑتے رہتے ہیں خدا کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل میں سرگرم عمل رہتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اُس راستے کو بھی جانتا ہے جس پر اسے قانون خداوندی کے اتباع میں چلنا ہے اور ان فرائض زندگی کو بھی جن کی خاطر اسے مصروفِ تگ و تازر ہونا ہے (اس اہتمام کے باوجود انہیں ویسے ہی نہیں پھوڑ دیا گیا) ان پر قانون خداوندی کی نگاہ سلسلہ متواتر رہتی ہے تاکہ وہ اس کا جائزہ لیتا ہے کہ یہ اپنے اپنے فرائض کو کس طرح سر انجام دیتے ہیں۔“ (اس آیت میں ”صلوٰۃ“ اور ”سبج“ کے الفاظ قابلِ غور ہیں)۔

اس حقیقت کو سورۃ انعام میں یوں بیان کیا گیا ہے (۶/۳۸)۔ ”زمین میں کوئی چلنے والا جانور ایسا نہیں اور نہ ہی اپنے بازوؤں پر اڑنے والا کوئی پرندہ“ کہ وہ سب تمہارے جیسے انواع (SPECIES) نہ ہوں۔ کوئی شے ایسی نہیں جس کے لئے کتابِ کائنات میں ضروری ہدایت موجود نہ ہو۔ یہ سب اس کے قانون کے محور کے گرد جمع ہوتے ہیں۔“

یہ وہ راہ نمائی ہے جسے عام اصطلاح میں جبلت (INSTINCT) کہتے ہیں یا اقبال کے الفاظ میں (TRACKLESS WAY OF A BIRD) ”ایسا راستہ جس پر کوئی نشانات نہ ہوں۔“ آپ ”ہاجر پرندوں“ (MIGRATORY BIRDS) کو دیکھئے وہ کس طرح سمندر کی پہنائیوں، جنگلوں اور صحراؤں کو عبور کرتے ہوئے ہزار ہا میل کی مسافت کے بعد یوں اپنی منزل مقصود پر پہنچ جاتے ہیں گویا کوئی ان کا ہاتھ پکڑے وہاں تک لے آیا ہے۔ یہ اشیائے کائنات کی پہلی خصوصیت ہے۔ یعنی انہیں ان کے فرائض زندگی اور وظائفِ حیات کے متعلق راہ نمائی قدرت کی طرف سے ملتی ہے اور یہ راہ نمائی ہر شے (اور ایک نوع کے ہر فرد) کے اندر ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہے۔ ایک نوع کے ہر فرد سے مراد یہ ہے کہ (مثلاً) مرغ ایک نوع ہے۔ یہ راہ نمائی مرغی کے ہر بچے کو قدرت کی طرف سے ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر (مثلاً) ایک مرغی کے نیچے سینے کے لئے کچھ انڈے مرغی کے اور کچھ سطح

کے رکھ دیئے جائیں اور سب انڈوں سے ایک ہی وقت میں بچے نکلیں تو بطخ کے بچے پانی کی طرف بچیں گے اور مرغی کے بچے خشکی پر رہیں گے۔ اور ان میں سے ہر بچہ ایسا ہی کرے گا خواہ وہ افریقہ کے صحرائیں ہو یا نیویارک کے شہر میں۔

ایشائے کائنات کی مجبوری | ایشائے کائنات کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جو ہدایت انہیں قدرت کی طرف سے ملتی ہے وہ اس پر چلنے کے لئے مجبور پیدا کی گئی ہیں۔ انہیں اس کا اختیار نہیں ہوتا

کہ جی چاہے تو اس راہ نمائی کے مطابق چلیں اور جی چاہے تو اس کے خلاف راستہ اختیار کر لیں۔ **وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ** (۱۷/۲۹) کائنات کی بندگیوں اور پستیوں میں جو کچھ ہے اور زمین میں جس قدر ذی حیات (چلنے والے) ہیں۔ نیز تمام کائناتی قوتیں سب خدا کی راہ نمائی کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں اور وہ اس سے کبھی سرکشی اختیار نہیں کرتیں۔ اسے ان اشیاء کی فطرت کہتے ہیں۔

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ

(i) کائنات کی ہر شے کو راہ نمائی خدا کی طرف سے ملتی ہے جس کے مطابق وہ اپنے ارتقائی مدارج طے کر کے منزل مقصود تک پہنچ جاتی ہے۔

(ii) ہر شے اس راہ نمائی کے مطابق چلنے پر مجبور ہے۔ اس کو اس شے کی فطرت کہتے ہیں جسے وہ بدل نہیں سکتی۔ اب آگے بڑھیے۔

انسان بھی مخلوق خداوندی کے زمرے میں داخل ہے اس لئے اسے راہ نمائی دینا بھی خدا کے ذمے ہے لیکن اس باب میں اس کی کیفیت دیگر اشیائے کائنات سے مختلف ہے۔ ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ (مثلاً) حیوانات میں ہر نوع اور نوع کے ہر فرد کو وہ راہ نمائی جس کے مطابق اس نے زندگی بسر کرنی ہوتی ہے پیدائشی طور پر از خود ملتی ہے۔ انسان کی طبعی زندگی دیگر حیوانات کی طرح ہے۔ اس لئے حیوانی بچہ بھی دیگر حیوانی بچوں کی طرح اپنے طبعی تقاضوں کے لئے راہ نمائی اپنی پیدائش کے ساتھ لاتا ہے۔ وہ کبھی اس دنیا میں آتے ہی بھوک کے لئے دودھ کے چشموں کی طرف لپک جاتا ہے اور اپنی جبتی راہ نمائی سے دودھ پینے کا ڈھنگ سیکھتا ہے۔ لیکن وہ جوں جوں بڑا ہوتا جاتا ہے اس میں اور دیگر حیوانی بچوں میں فرق ہوتا چلا جاتا ہے مثلاً اگر مرغی کا بچہ شروع میں پانی سے ڈور بھاگتا تھا تو وہ آخر وقت تک پانی سے محترز رہے گا۔ لیکن انسانی بچے کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ کبھی آگ میں ہاتھ ڈال دے گا۔ کبھی پانی کے ٹب میں جا کرے گا اور ڈکھیاں لگائے گا۔ کبھی مرچیں آنکھوں کو لگائے گا۔ کبھی کوئلہ منہ ڈال لے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان معاملات میں اسے فطرت کی طرف سے کوئی راہ نمائی نہیں ملتی۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ انسانی زندگی کے تقاضے محض طبعی تقاضے نہیں۔ انسانی تقاضے بھی ہیں۔ بالفاظ دیگر اس کی زندگی محض حیوانی

زندگی نہیں انسانیت کی زندگی بھی ہے۔ فرائض کا احساس، لغزش پر ندامت، مستقبل پر نگاہ، یہ سب انسانی زندگی کے مظاہر ہیں۔ بنیادی طور پر سمجھا جائے تو انسان صرف اس کے جسم سے عبارت نہیں بلکہ (جیسا کہ سابقہ ابواب میں بتایا جا چکا ہے) جسم کے علاوہ

انسانی ذات کی نشوونما اس کے پاس ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات (HUMAN PERSONALTY) کہا جاتا ہے۔ جس طرح جسم کی پرورش اس کی حیوانی زندگی کا تقاضا ہے

اسی طرح اس کی ذات کی نشوونما اس کی انسانی زندگی کا تقاضا ہے۔ اس کے لئے انسان کو فطرت کی طرف سے کوئی راہ نمائی نہیں ملتی۔ بالفاظ دیگر خیر اور شر کی تمیز انسان کے اندر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "انسان شر کو بھی اُسی طرح پکار پکار کر بلاتا ہے جس طرح خیر کو۔ یہ بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے" (۱۱/۱۶)۔ یہ پیش پا افتادہ مفاد کی طرف لپک کر جاتا ہے، خواہ وہ آخر الامر اس کے حق میں کتنے ہی نقصان رساں کیوں ثابت ہوں۔

ہم اے ہاں عام طور پر یہ خیال چلا آ رہا ہے کہ نیکی اور بدی کی تمیز انسان کو فطرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ہے۔ اس خیال کی تائید میں قرآن کریم کی ایک آیت بھی پیش کی جاتی ہے یعنی "وَلَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا..... دَسَّهَا (۹۱/۱۰)۔ اس آیت (فَالهَمَّهَا فَجُودَهَا وَنَقَّوَهَا) کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ خدا نے انسانی نفس کو نیکی اور بدی کا الہام کر دیا ہے۔ لیکن نہ صرف یہ کہ اس آیت کا ترجمہ صحیح نہیں یہ پورے کا پورا تصور ہی قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ سب سے پہلے تو اس لئے کہ اگر نیکی اور

بدی کی تمیز ہر فرد کے اندر ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہے تو حضرات انبیاء کرام کی وساطت سے رشد و ہدایت کا سلسلہ بے معنی قرار پا جاتا ہے۔ اس قسم کی تمیز دیگر اشیائے کائنات میں (مثلاً حیوانات میں) تو رکھ دی گئی ہے۔ اس لئے ان کی طرف کسی نبی کے بھیجنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ پھر یہ کہ یہ چیز ہمارے تجربہ اور مشاہدہ کے بھی خلاف ہے۔ انسانی بچہ جس قسم کے ماحول میں پرورش اور تربیت پاتا ہے اسی قسم کے خیالات و معتقدات لے کر پروان چڑھتا ہے۔ یعنی بچے کے نزدیک گوشت ہنایت قابل نفرت شے ہے لیکن مسلمان بچہ گوشت مزے لے لے کر کھاتا ہے۔ لہذا یہ تصور غلط ہے کہ نیکی و بدی کی تمیز اور خیر و شر کی تفریق انسان کے اندر رکھ دی گئی ہے۔ سورۃ الشمس کی جو آیات اوپر درج کی گئی ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ نفس انسانی (انسانی ذات) میں یہ امکانی صلاحیت و استعداد رکھ دی گئی ہے کہ وہ چاہے تو اپنے آپ کو محفوظ رکھ لے اور چاہے اپنی تخریب کر لے جو فرد اس کی نشوونما کرے گا وہ کامیاب ہوگا۔ جو لے دبا لے رکھے گا وہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔ دراصل ان آیات میں اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ انسانی ذات نشوونما اور ارتقا یافتہ شکل میں نہیں دی گئی۔ وہ صرف امکانی صلاحیتوں

(POTENTIALITIES) کا مجموعہ ہے۔ اگر انسان ان صلاحیتوں کی صحیح پرورش کر لے تو انسانی ذات نشوونما یافتہ

(DEVELOPED) ہو جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ کرے تو وہ تباہ ہو جاتی ہے۔ اس میں محفوظ رہنے اور تباہ ہونے کے امکانات (POSSIBILITIES) موجود ہیں۔

اس ضمن میں ایک اور غلط تصور بھی ہمارے ہاں مروج ہے۔ اور وہ یہ کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے یعنی جو فطرت خدا کی ہے وہی فطرت انسان کی ہے اور اسلام دینِ فطرت ہے۔ یعنی یہ دین انسان کی اس فطرت کے مطابق ہے جو فطرت اللہ پر متفرع ہے۔ اس غلط تصور کی تائید میں سورہ روم کی یہ آیت پیش کی جاتی ہے۔ **فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّا أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ** (۳۰/۳۰)۔ حالانکہ اس آیت میں بلکہ زمانہ نزولِ قرآن کی عربی زبان میں (لفظ "فطرت" ان معنوں میں استعمال ہی نہیں ہوتا تھا جن معنوں میں یہ اب استعمال ہوتا ہے۔ اب اس سے مراد NATURE لی جاتی ہے۔ عربی زبان اور قرآن میں فطرت کے معنی ہیں کسی چیز کو پہلی بار پیدا کرنا (قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ ۱۵/۱۵ قرآن میں آیا ہے) لہذا فطرت کے معنی ہیں خدا کا قانونِ تخلیق۔ اس اعتبار سے سورہ روم کی مندرجہ صدر آیت کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے انسان کو بھی اپنے اسی قانونِ تخلیق کے مطابق پیدا کیا ہے جس کے مطابق نے کائنات کی دوسری اشیاء کو پیدا کیا ہے۔

اگر اسے تسلیم کر لیا جائے کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے تو اس سے خود خدا کی فطرت کا جو نقشہ مرتب ہوتا ہے وہ کبھی خدا کے شایانِ شان نہیں ہو سکتا۔ مثلاً انسان کے متعلق قرآن میں ہے کہ **خُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا** (۲۱/۲۸) "انسان کو بڑا ہی کمزور پیدا کیا گیا ہے"۔ یہ جھٹ لگنا ہے۔ یا **خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ** (۲۱/۳۰) "انسان بڑا ہی جلد باز ہے"۔ **وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا** (۱۴/۱۱) "اسی طرح دوسری جگہ ہے۔ **وَكَانَ الْإِنْسَانُ كَفُورًا** (۱۴/۶۴) "انسان بڑا ہی ناشکر گزار ہے"۔ یا **كَانَ الْإِنْسَانُ قَتُورًا** (۱۴/۱۰) "یہ بڑا ہی کم ظرف اور تنگ نظر واقع ہوا ہے"۔ **إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا** (۹۰/۱۹)

انسان بڑا بے صبر پیدا کیا گیا ہے"۔ **كَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْئًا جَدَلًا** (۱۸/۵۳) "یہ بڑا جھگڑالو ہے"۔ **إِنَّهُ كَانَ**

ظَلُومًا كَبُورًا (۳۳/۷۲) "انسان بڑا ظالم اور جاہل واقع ہوا ہے"۔ یہ ہیں "انسان کی فطرت" کے وہ نمایاں خط و خال جن کا ذکر خدا نے قرآن میں کیا ہے۔ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے تو اس سے یہ ماننا پڑے گا کہ (معاذ اللہ) خود خدا کی فطرت بھی ایسی ہی ہے۔ لہذا یہ تصور بھی غلط ہے کہ انسان کی فطرت وہی ہے جو خدا کی فطرت ہے انسان کی کوئی فطرت نہیں۔

انسان کی فطرت کوئی نہیں | "انسان کی کوئی فطرت نہیں" ایک عظیم انقلابی اعلان ہے جو اس خیال کے یکسر خلاف جاتا ہے جو دنیا میں بطور مسلمہ مانا جاتا ہے۔ "انسانی فطرت"

ایک ایسی اصطلاح ہے جو صدیوں سے انسان کے کان میں پڑتی چلی آرہی ہے اور اس طرح اس نے ایک حقیقت ثابتہ کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے لیکن اصل یہی ہے کہ انسان کی کوئی فطرت نہیں۔ فطرت کسی شے کی ان بنیادی خصوصیات کو کہا جاتا ہے جو پیدائش سے اس کے اندر ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہوں اور جن کے مطابق وہ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو۔ پانی کی فطرت ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہے۔ آگ کی فطرت ہے کہ وہ حرارت پہنچائے۔ بجری کی فطرت ہے کہ وہ گھاس کھائے شیر کی فطرت ہے کہ وہ گوشت کھائے، گھاس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ یہ تمام اشیائے کائنات اور حیوانات اپنی اپنی فطرت کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ وہ اپنی فطرت بدل نہیں سکتے۔ فطرت ہوتی ہی غیر متبدل ہے۔ جہاں تک انسان کی حیوانی سطح کی زندگی (یعنی طبعی زندگی) کا تعلق ہے، اس پر قوانین فطرت اسی طرح حاوی ہیں جس طرح دیگر حیوانات پر۔ لیکن اس کی انسانی سطح کی زندگی میں کوئی شے ایسی نہیں جسے اس کی فطرت کہا جائے۔ "انسانی" فطرت کے متعلق یہی غلط تصور تھا جس سے ایک گروہ نے یہ کہہ دیا کہ بدی انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ یہ عقیدہ کہ "ہر انسانی بچہ گناہگار پیدا ہوتا ہے" اسی غلط تصور کی تخلیق ہے۔ دوسری طرف متبادل طبقہ (OPTIMIST) ہے جس کا نظریہ یہ ہے کہ انسان فطرتاً نیک واقع ہوا ہے۔ یہ دونوں تصور باطل ہیں۔ انسان نہ فطرتاً نیک ہے نہ بد۔ اس میں کچھ صلاحیتیں رکھ دی گئی ہیں اور وہ بھی غیر نشوونما یافتہ (UN-DEVELOPED) شکل میں۔ یہ اس کے اختیار پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ (i) وہ ان صلاحیتوں کی نشوونما کرے یا نہیں ویسے ہی (UN-REALISED) چھوڑ دے۔ اور (ii) جب ان کی نشوونما کرے تو انہیں جس طریق پر چاہے استعمال کرے۔ اگر یہ انہیں نوع انسانی کے تعمیری مقاصد کے لئے صرف کرتا ہے، تو اسے نیکی کہا جائے گا۔ اگر انہیں تخریبی امور میں استعمال کرتا ہے تو یہ بدی کہلائے گی۔ وحی کی راہ نمائی سے ان صلاحیتوں کو نشوونما دینے کا طریق اور ان کا صحیح مصرف بتاتی ہے۔ یہ جو اوپر قرآن کریم کی بعض آیات میں بتایا گیا ہے کہ انسان ایسا ہے اور ایسا ہے۔ تو اس سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر انسان وحی کی روشنی میں نہ چلے اور اپنے طبعی تقاضوں کی تسکین ہی کو اپنا مقصود زندگی قرار دے لے تو پھر وہ اس قسم کا ہو جاتا ہے لیکن اگر وہ اپنی صلاحیتوں کو وحی کی راہ نمائی میں استعمال کرے تو پھر اس کی صفات وہ ہوں گی جنہیں قرآن "مومن کی زندگی" سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی ایسی زندگی جو خود اپنی اندرونی کشمکش سے بھی امن میں ہو اور جس سے پوری انسانیت امن میں رہے۔

اسے پھر سمجھ لینا چاہیے کہ "فطرت" اور "اختیار و ارادہ" دو متضاد چیزیں ہیں۔ فطرت مجبور کی ہوتی ہے۔ صاحب اختیار و ارادہ کی نہیں ہوتی۔ اور چونکہ انسان کو اختیار و ارادہ دیا گیا ہے، اس لئے اس کی فطرت کوئی نہیں۔ نہ نیک نہ بد۔

یہ نیک یا بد اپنے اختیاری اعمال سے بنتا ہے۔

جس طرح یہ تصور صحیح نہیں کہ خیر اور شر کی تمیز انسان کی فطرت کے اندر رکھ دی گئی ہے اسی طرح یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ انسان کے اندر ایک اور شے ہے جسے اس کی ضمیر کہتے ہیں اور جو خیر اور شر نیکی

ضمیر کی آواز

اور ہدی میں تمیز کر دیتی ہے۔ (اسی لئے کہتے ہیں کہ انسان کو اپنی ضمیر کی آواز کے تابع چلنا چاہیے)۔ یہ تصور بھی غلط ہے۔ ضمیر کی آواز انسان کے ابتدائی ماحول، تعلیم، تربیت، معاشرہ کی فضا سے مرتب ہوتی ہے۔ یہ درحقیقت (SOCIETY INTER NALISED) ہوتی ہے جس طرح تقلید (SOCIETY DIVINISED) ہوتی ہے۔

ان مختصر اشارات سے واضح ہے کہ خدا کی طرف سے راہ نمائی دیئے جانے کا جو طریق کائنات کی دیگر اشیاء کے سلسلہ میں اختیار کیا گیا تھا، انسان کے سلسلہ میں وہ طریق اختیار نہیں کیا گیا۔

انسان کی صورت میں یہ طریق اختیار کیا گیا کہ خود انسانوں میں سے ایک شخصیت کو منتخب کر کے اسے وہ راہ نمائی بذریعہ وحی دے دی جاتی، جس کی روشنی میں چل

انسان کے لئے راہ نمائی

کر کاروان انسانیت اپنی منزل تک پہنچ سکتا تھا۔ وہ منتخب فرد (جسے نبی اور رسول کہہ کر پکارا گیا ہے) اس راہ نمائی کو دوسرے انسانوں تک پہنچا دیتا۔ سورۃ اعراف میں ہے (۴/۳۵) ”اے نوع انسان! جب تمہاری طرف تم میں سے میرے رسول آئیں اور میرے احکام تمہارے سامنے پیش کریں تو تم میں سے جو ان قوانین کی نگہداشت کرے گا اور اپنی اصلاح کرنے کا تو ایسے لوگوں کو نہ کوئی خوف ہو گا نہ خزن“ ہم نے (سابقہ صفحات میں) دیکھا ہے کہ جو راہ نمائی خدا کی طرف سے کسی نوع کے فرد کو براہ راست ملتی ہے (مثلاً حیوانات کو) وہ فرد اس راہ نمائی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔ لیکن انسان کو اختیار و ارادہ دیا گیا ہے۔

اس لئے اس کی صورت میں راہ نمائی دیتے جانے کا وہ طریق تجویز کیا گیا ہے جس میں اس کا اختیار و ارادہ سلب نہ ہو یہی وجہ ہے

کہ خدا نے اس طریق راہ نمائی کی وضاحت کے بعد کہہ دیا کہ اس باب میں ہر فرد آزاد ہے

انسانی اختیار و ارادہ

کہ اس کا جی چاہے تو اس کے مطابق زندگی بسر کرے اور جی چاہے تو اس کے خلاف روش اختیار کرے (۱۸/۲۹)۔ وہ جو نسبی روش اختیار کرے گا اس کے مطابق نتائج مرتب ہو جائیں گے۔

جس طرح وہ وحی جو اشیائے کائنات کی طرف کی جاتی ہے ان اشیاء کی پیدا کردہ نہیں ہوتی (خدا کی طرف سے وہی

لے چونکہ میں اپنی دیگر تصانیف اور مقالات میں ان تمام عنوانات پر تفصیلی بحث کر چکا ہوں اس لئے اس مقام پر انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

وحی الکتسابی نہیں ہوتی | طور پر ملتی ہے) اسی طرح جو وحی خدا کی طرف سے انبیاء کرام کو دی جاتی ہے وہ بھی ان کی اپنی عقل و فکر کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ بالفاظ دیگر صاحبِ وحی اپنی کوشش

اور محنت سے حقیقت کا انکشاف (DISCOVER) نہیں کرتا۔ حقیقت اپنے آپ کو خود اس پر منکشف (REVEAL) کرتی ہے

وحی کے اس طرح خارج سے ملنے (OBJECTIVITY) کو قرآن، نزول کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ

حقائق انسان کے اندر سے اُبھر کر برآئے کی بجائے انسان کو خارج سے ملتے ہیں۔ قرآن میں ہے۔ **إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ**

بِالْحَقِّ (۳۹/۲) ”ہم نے تجھ پر یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے“ نزولِ وحی سے مراد یہ ہے کہ وہ انسان کو کسب و ہنر اور

محنت و ریاضت سے نہیں ملتی، بلکہ جس فرد کو خدا خود منتخب کرے اسے بلا سعی و کاوش مل جاتی ہے۔ **وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ**

مَنْ يَشَاءُ (۲۱/۵) ”اللہ اپنی رحمت کے لئے جسے چاہے منتخب کر لیتا ہے“ اس میں صاحبِ وحی کے ذاتی خیالات کا شائبہ

تک نہیں ہوتا (۳-۵۳/۴)۔ وہ اپنے خیالات و رجحانات و میلانات سے کوئی بات نہیں کرتا۔ یہ وحی ہوتی ہے جو اس پر نازل کی

جاتی ہے چونکہ ہم وحی کی کیفیت کا کچھ اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اس لئے اس بات کا سمجھنا ہمارے لئے مشکل (بلکہ ناممکن) ہے

کہ ایک شعبہ میں وہ ایسی باتیں کرے جو (دوسرے انسانوں کی طرح) اس کے اپنے فکر و اختیار کا نتیجہ ہوں اور دوسرے شعبے

میں وہ ایسے حقائق بیان کرے جو نہ اس کی اپنی عقل و فکر کا نتیجہ ہوں اور نہ ہی اس نے انہیں کسی سے پڑھا سنا یا سیکھا ہو

لیکن نبی کی زندگی اس قسم کے دو شعبوں میں منقسم ہوتی تھی۔ پہلی وہ ہے کہ جب مخالفین حضور سے کہتے کہ وہ ان قوانین میں تھوڑا

سارو و بدل کر دیں جو ان کے سامنے پیش کئے جاتے تھے تاکہ باہمی مفاہمت (COMPROMISE) کی کوئی شکل پیدا ہو

سکے تو ان کے جواب میں کہہ دیا جاتا کہ **قُلْ مَا يَكُونُ لِي بِ... إِلَّا مَا يُؤْتِيَنِي** (۱۰/۱۵) ”میرے لئے یہ ناممکن ہے کہ میں

اپنی طرف سے اس میں کوئی رد و بدل کر دوں۔ میں تو بس اس کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف بذریعہ وحی بھیجا جاتا ہے۔

نبی کو اس کا علم تک نہیں ہوتا | چونکہ وحی فرد متعلقہ کے اپنے کسب و ہنر اور سعی و کاوش کا نتیجہ نہیں ہوتی

تھی اس لئے اُسے (قبل از نبوت) اس کا علم و احساس تک بھی نہیں ہوتا

تھا کہ اسے وحی مل جائے گی۔ سورۃ شوریٰ میں ہے۔ **وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِي**

مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ (۴۲/۵۲) ”اس طرح ہم نے تیری طرف اپنے عالم امر سے وحی نازل کی ہے (حالانکہ) اس سے

پہلے تو جانتا ہی نہ تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں اور ایمان کیا ہوتا ہے“ حتیٰ کہ اسے اس کی توقع تک نہیں ہوتی تھی (وَمَا

كُنْتَ تَرْجُوَ أَنْ يُلْقَىٰ إِلَيْكَ الْكِتَابُ إِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَبِّكَ (۲۸/۸۶) ”تجھے اس کی امید ہی نہیں ہو سکتی تھی کہ

تیری طرف یہ کتاب نازل کی جائے گی۔ یہ خالص رحمتِ خداوندی کا نتیجہ ہے۔ جو تو صاحبِ وحی ہو گیا۔“

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جو شخص یونہی راستے پر چلتا مل جاتا، وحی کا تاج اس کے سر پر رکھ دیا جاتا۔ بالکل نہیں۔ جس ذاتِ گرامی کو آخر الامرو وحی دی جانی مقصود ہوتی، اُس کی تربیت شروع سے ہی خود خدائے تعالیٰ کی زیر نگرانی ہوتی چنانچہ حضرت موسیٰ کے قصہ میں قرآن میں ہے کہ جب انہیں طور کی چوٹیوں پر وحی سے سرفراز کیا گیا تو انہوں نے اپنے جذبات سپاس گزاری کے اظہار کے طور پر خدائے کہا کہ یہ آپ کا بہت بڑا احسان ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے کہا کہ یہ ہمارا پہلا احسان نہیں جس کے لئے تم شکر گزار ہو رہے ہو۔ ان احسانات کا سلسلہ

نبی کی تربیت

اس سے بہت پہلے شروع ہے، اس دن سے جب تمہاری پیدائش ہوئی تو ہم نے تمہاری ماں سے کہا کہ تمہیں صندوق میں ڈال کر دریا میں بہا دے۔ پھر تمہاری پرورش فرعون کے محلات میں ہوئی تاکہ تم محکوم قوم کا فرد ہوتے ہوئے بساطِ سیاست کی ہرہ بازیوں سے واقف ہو جاؤ (کیونکہ تمہیں آخر الامران کے مقابلہ میں آنا تھا)۔ پھر وہاں سے تمہیں مدین کی وادیوں میں لے جایا گیا تاکہ تم فطرت کی کھلی فضا میں زندگی کے کچھ دن گزارو۔ تم نے آخر کار بنی اسرائیل کی تربیت انہی وادیوں میں کرنی تھی۔ جب تم دئے موسیٰ! ان تمام مراحل سے گزارے گئے ثُمَّ جِئْتَ عَلٰی قَدَرٍ اِيْمُوْمِنِيْ تَب كَيْسٍ جَاكِرْتُمْ هَمَارے پیمانے پر پورے اترے۔ وَ اَصْطَلَعْتُمْ لِنَفْسِيْ (۲۷/۲۱-۲۴) اور ہم نے تمہیں اپنے مشن کے لئے منتخب کیا۔ یہ نہیں کہ

اگ لینے کو آئے پیغمبری مل جائے

جس مقدس سینے کو وحی کا مہبط بنانا مقصود ہوتا تھا، اس کی نگہداشت شروع سے ذاتِ باری تعالیٰ خود کرتی تھی۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ اس کی نگہداشت خود ذاتِ خداوندی کرتی تھی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ نبی کی زندگی ایک بے اختیار و ارادہ مشین کی طرح خدا کے ہاتھ میں ہوتی تھی اور وہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرتا تھا۔ نبی بھی دوسرے انسانوں کی طرح اپنے ہر عمل میں صاحبِ اختیار ہوتا تھا اور جو کچھ کرتا تھا اپنے ارادے اور فیصلے سے کرتا تھا۔ اسی لئے وہ اپنے ہر عمل کا ذمہ دار قرار پاتا تھا۔ ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ نبی کی وحی، اس چیز سے یکسر مختلف اور منفرد ہے، جسے عام طور پر ”مذہبی واردات“ (RELIGIOUS EXPERIENCE) یا ”باطنی مکاشفات“ REVELATIONS OF A MYSTIC کہا جاتا ہے۔ یہ واردات

مکاشفات انسان کے اپنے کسب و ہنر کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ یہ از قبیل وحی نہیں ہوتے۔ یہ صرف انسان کی مضمحل صلاحیتوں کی نشوونما ہے جو ایک خاص طریق اور مہارت سے ہو جاتی ہے۔ اس کے لئے نہ کسی عقیدہ کی ضرورت ہے نہ کسی مذہب کی۔ چونکہ نبوت نبی اکرم کی ذاتِ گرامی پر ختم ہو گئی، اس لئے اب وحی کا سلسلہ بھی بند ہو گیا۔ لہذا اسلام میں کسی کے باطنی تجربے

کی کوئی سند یا حیثیت نہیں۔ نہ ہی اب کسی کے لئے خدا سے ہمکلامی کا امکان ہے۔ خدا سے ہمکلامی کا ذریعہ صرف وحی تھا جس کا سلسلہ نبی اکرمؐ کی ذات پر ختم ہو گیا۔ قرآن کریم میں وحی کے سوا، خدا سے براہِ راست علم حاصل کرنے کا کوئی ذکر نہیں۔ کشف، الہام وغیرہ بعد کی اصطلاحات ہیں جنہیں قرآن سے کچھ واسطہ نہیں۔ یہ بھی ایک بنیادی خصوصیت ہے جس کی بنیاد پر ”دین“ (اسلام) ”مذہب“ (RELIGION) سے الگ قرار پاتا ہے۔ مذہب میں انسان کا انتہائی کمال یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ خدا سے براہِ راست ہمکلام ہو جاتا ہے۔ ”دین“ (اسلام) یہ بتاتا ہے کہ خدا کا کلام، اس کی آخری کتاب کے اندر محفوظ ہے۔ اور انسان کا کام اس وحی کے مطابق زندگی بسر کرنا ہے۔ اس کے اتباع کا نتیجہ اس زندگی کی خوشگواریاں اور موت کے بعد کی زندگی کی سرفرازیاں ہے۔ اس کا نتیجہ کسی قسم کا باطنی علم حاصل ہو جانا نہیں، باطنیت اور دین دو متضاد چیزیں ہیں۔



اب اس سے آگے بڑھتے

”باطنی واردات“ کے مدعوین (MYSTICS) کا کہنا ہے کہ جو شخص حقیقت کی کوئی بھلاک پالیتا ہے اس کی کیفیت

یہ ہو جاتی ہے کہ

کاں را کہ خیر شد، خیرشس باز نیاید

وہ اس کیفِ مستی میں گم ہو جاتا ہے، لہذا اس کا ان کیفیات کا کسی دوسرے کو بتانا تو ایک طرف اسے خود اپنے آپ کا بھی ہوش نہیں رہتا۔ لیکن جب نبی پر انکشافِ حقیقت ہوتا ہے (یعنی اُسے وحی ملتی ہے) تو اس پر عظیم ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں۔ اسے

اپنی وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچانا ہوتا ہے۔ اور صرف پہنچانا ہی نہیں

فریضہ رست کی ذمہ داریاں

اس کے مطابق سابقہ (غلط) معاشرے کی جگہ ایک جدید معاشرے کو عملاً

مشکل کرنا ہوتا ہے۔ یہی وہ گراں بار ذمہ داریاں ہیں جن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ

وَدَوَّضْنَا عَنْكَ دِمْرًا ۝ الذِّبَانِ أَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝ (۲-۹۴/۳)

ہم نے تم پر سے اس بوجھ کو اتار دیا جس سے تمہاری کمر دوہری ہو رہی تھی۔

علامہ اقبالؒ اس حقیقت کو بڑے دلکش انداز میں بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

”محمد عربیؐ فلک الافلاک کی بلندیوں پر پہنچ کر واپس تشریف لے آئے۔

خدا شاہد ہے کہ اگر میں اس مقام پر پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا۔“

یہ الفاظ ایک بہت بڑے صوفی بزرگ (عبد القدوس گنگوہیؒ) کے ہیں، تصوف کے تمام لٹریچر میں ان جیسے اور الفاظ کا ملنا غالباً مشکل ہے جو ایک فقرے کے اندر شعورِ نبوت اور تصوف کے اس قدر لطیف نفسیاتی فرق کو

اس طرح واضح کر دیں۔ ایک صوفی اپنے انفرادی تجربہ کی تجر دکاہ سے واپس آنا نہیں چاہتا۔ اور جب واپس آتا بھی ہے (اس لئے کہ اسے واپس آنا پڑتا ہے) تو اس کی یہ مراجعت نوع انسانی کے لئے کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس ایک نبی کی مراجعت تخلیقی مقصد کے لئے ہوتی ہے۔ وہ آتا ہے کہ زمانے کے طوفان پر تسلا پا کر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے آئے۔ اور اس طرح مقاصد کی ایک نئی دنیا تعمیر کرے۔ ایک صوفی کے لئے اس کے انفرادی تجربہ کی تجر دکاہ آخری مقام ہوتی ہے۔ لیکن ایک رسول کے دل میں اس سے زلزلہ انگیز نفسی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام دنیائے انسانیت میں ایک انقلاب پیدا کر دیں یہ آرزو کہ جو کچھ اس نے دیکھا ہے وہ ایک حقیقی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہو جائے، نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے۔ اسی لئے ایک صاحبِ وحی کے تجربہ کی قدر و قیمت جانچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے وہ کیسا ہے اور اس کے پیغام کی رُو سے جس قسم کی دنیائے ثقافت ابھر کر سکتی آگئی ہے وہ کس انداز کی ہے۔

(خطبات اقبال)

نبی کی اس خصوصیت کو (کہ وہ خدا سے وحی پاتا ہے) عام طور پر نبوت کہا جاتا ہے اور اس کے اس فریضہ کو (کہ اس نے وحی کو دوسروں تک پہنچانا اور اس کے مطابق ایک جہان نو کی تخلیق کرنا ہوتا ہے) رسالت سے تعبیر کیا جاتا۔ اس فریضہ رسالت کی ادائیگی کے لئے ایسے افراد کو ساتھ ملانا ہوتا ہے جو وحی کی راہ نمائی میں زندگی بسر کرنے کا تہیہ کر لیں۔ یہی وہ جماعت ہے جو حسن کائنات کو نکھارنے اور انسانی معاشرے میں خدا کے قانونِ مکافات کو انسانی حساب و شمار کے مطابق تیسرے خیز بنانے میں خدا کی رفیق بنتی ہے۔ اسے "جماعتِ مومنین" کہا جاتا ہے۔

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی کہ

(۱) کائنات کی ہر شے کو اس ہیج کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے جس سے وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائے، خدا کی طرف سے راہ نمائی ملتی ہے۔

(۲) یہ راہ نمائی کائنات کی ہر شے کے اندر شروع سے ودیعت کر کے رکھ دی جاتی ہے۔ خارج سے نہیں ملتی۔ اشیائے کائنات اس داخلی راہ نمائی کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ یہی ان کی فطرت کہلاتی ہے جو غیر متبدل ہوتی ہے۔

(۳) انسان کو چونکہ صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے اس لئے اسے راہ نمائی دینے کا وہ طریق اختیار نہیں کیا گیا جس کی رُو سے یہ اس راہ نمائی کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ اس لئے یہ راہ نمائی ان کے اندر نہیں رکھی گئی۔

(۴) اس کے لئے طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ انسانوں میں سے ایک فرد کو منتخب کر کے اس کی طرف وحی بھیج دی جاتی۔ وہ اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتا اور جو لوگ اس وحی کی صداقت پر ایمان لے آتے وہ مل کر ایسے معاشرے کی تشکیل کرتے جس میں انسانی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جاتی۔

(۵) نبی کو جو راہ نمائی (وحی) خدا کی طرف سے ملتی اس میں اس کی اپنی عقل و فکر اور خیالات و جذبات کا کوئی دخل نہ ہوتا۔ اس لئے کہ وحی کی راہ نمائی عقل کی پیدا کردہ نہیں ہوتی۔

قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ جب انسان نے تمدنی زندگی بسر کرنی شروع کی اور اس سے ان کے باہمی مفاد میں ٹکراؤ پیدا ہوا (اسے وہ "ہبوطِ آدم" کے استعارہ سے تعبیر کرتا ہے) تو اس کی راہ نمائی کے لئے وحی کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کا

اعلان یہ ہے کہ اس مقصد کے لئے خدا کی طرف سے ہر قوم اور ہر ملک میں انبیائے کرام آتے رہے۔ اصولی طور پر ان سب کا ایک ہی پیغام اور ایک ہی دعوت تھی (۲/۱۶۳)۔ چونکہ قرآن

وحی کا سلسلہ

کے اولین مخاطب عرب تھے، اس لئے اس میں ان رسولوں کا تذکرہ نام لے کر کیا گیا ہے جن سے وہ لوگ پہلے سے متعارف تھے۔ مثلاً نوح، ابراہیم، اسمعیل، اسحاق، یوسف، موسیٰ، ہارون، داؤد، سلیمان، عیسیٰ (علیہم السلام) وغیرہ۔ اور باقیوں کا تفصیلی تذکرہ نہیں کیا (۲/۱۶۳)۔ لیکن کسی رسول کا ذکر کیا گیا ہو یا نہ، ایک شخص مسلمان ہو نہیں سکتا جب تک وہ اس حقیقت پر ایمان نہ لے آئے کہ دنیا کی ہر قوم میں رسول آتے رہے ہیں اور انہیں خدا کی طرف سے سچی تعلیم ملی تھی۔ اگر کوئی شخص ان کے رسول ہونے میں تفریق کرتا ہے تو وہ مسلمان ہو نہیں سکتا۔ (۲/۲۸۵)

شروع شروع میں انسان کا ذہن بڑا نا پختہ اور علم بڑا ناقص تھا، اس لئے اسے چھوٹی چھوٹی جزئیات تک کی تعلیم بھی وحی کے ذریعے دی جاتی تھی۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا، تا آنکہ انسانی تاریخ میں وہ زمانہ آگیا جس کے بعد انسانی علم نے دن بدن وسیع ہوتے چلے جانا تھا۔ تمثیلاً یوں سمجھئے کہ اب آدمی اپنے بچپن سے نکل کر سن بلوغت تک پہنچ گیا۔ اب ضرورت تھی کہ اس

وہ مستقل اصول اپنی مکمل شکل میں دے دیتے جاتے جن کی تعمیر انسانیت کے لئے ضرورت تھی اور اس کے بعد اسے اس کی آزادی ہوتی کہ یہ ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، اپنے اپنے زمانے

ختم نبوت

کے تقاضوں کے مطابق، اپنی عقل و بصیرت کی رُو سے زندگی کی راہیں آپ متعین کرے۔ چنانچہ یہ اصول آخری بار محمد رسول اللہ کی وساطت سے، قرآن کریم کے اندر دیئے گئے۔ قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔ (۱۵/۹) اور اس کے بعد سلسلہ نبوت

لے یہ حقیقت تاریخی شواہد سے ثابت ہے کہ قرآن کریم حرفاً حرفاً وہی ہے جو نبی اکرمؐ نے دیا تھا۔ اس کے برعکس دنیا کی کوئی اور قوم نہ اس کا دعویٰ کرتی ہے اور نہ ہی اسے ثابت کر سکتی ہے کہ جو کتاب اس کے بانی مذہب کو ملی تھی وہ ان کے پاس اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔

ختم کر دیا۔ ”ختم نبوت“ درحقیقت انسانی تاریخ کا عظیم ترین انقلاب ہے۔ اس کے بعد ان حدود کے علاوہ جو قرآن میں متعین کی گئی ہیں، انسان کو اپنے کاروبار حیات میں پوری پوری آزادی حاصل ہو گئی۔ ان حدود سے مقصد یہ ہے کہ انسانوں کا باہمی ٹکراؤ نہ ہو اور اس طرح کاروان انسانیت یا باہمی تعاون و تناصرے زندگی کو بندیوں کی طرف لئے جائے۔ اب انسانی راہ نمائی کے دو ہی سرچشمے ہیں۔ قرآنی تعلیم اور انسانی علم و بصیرت۔ قرآن کی یہ تعلیم پوری کی پوری نوع انسان کے لئے ہے، اس پر ایمان لانے سے انسان مسلم کہلاتا ہے۔

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ان قوانین (وحی) پر ایمان کیسے لایا جاتا ہے، یعنی جو لوگ انہیں سچا تسلیم کر لیتے ہیں وہ کس طرح اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ وہ قوانین سچے ہیں، اس کے متعلق آئندہ باب میں گفتگو کی جائے گی جس میں یہ بتایا جائے گا کہ وحی اور عقل کا باہمی تعلق کیا ہے۔

لیکن قبل اس کے ہم اگلے باب کے لئے ورق الٹیں ایک اہم حقیقت کا خدا پر ایمان سے مفہوم کیا ہے

سمجھ لینا ضروری ہے، ہم نے دیکھا یہ ہے کہ انسانی راہ نمائی کے لئے وحی کی ضرورت ہے، اور وحی عقل انسانی کی وضع کردہ نہیں، یہ خدا کی طرف سے ملتی ہے۔ لہذا خدا پر ایمان سے عملی مفہوم یہ ہے کہ اس کی طرف سے عطا فرمودہ وحی پر ایمان لایا جائے۔ خدا کی ایک حیثیت یہ ہے کہ وہ خالق کائنات ہے، کائنات کا نظم و نسق اس کے مقرر کردہ قوانین کے ماتحت سرگرم عمل ہے، ان قوانین پر اسی کا کنٹرول ہے، مغرب میں مفکرین اور سائنسدانوں کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو خدا کی اس حیثیت پر تو ایمان رکھتا ہے، لیکن جہاں تک انسانی راہ نمائی کا تعلق ہے وہ اس کے لئے انسانی عقل کو کافی سمجھتا ہے، خدا کی وحی کا قائل نہیں، ہیکلے (JULIAN HUXLEY) کی کتاب کا ٹائٹل (RELIGION WITHOUT REVELATION) اسی بیچ فکر کا آئینہ دار ہے، قرآن کی رو سے خدا پر اس قسم کا ایمان درحقیقت ایمان کہلانے کا مستحق نہیں، وہ ایسے خدا پرستوں کے متعلق کہتا ہے کہ قُلْ لِّمَنِ الْأَرْضُ وَمَنْ فِيهَا إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ (۲۳/۸۴)۔ ان سے پوچھو کہ زمین اور جو کچھ اس کے اندر ہے وہ سب کس کے پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل ہے اور اس کا مالک اور آقا کون ہے، اس کے ساتھ ہی ان سے یہ بھی کہو کہ اس کا جواب جہالت اور تعصب سے نہ دیں بلکہ علم و بصیرت کی رو سے دیں۔ تو اس کے جواب میں یہ یقیناً کہیں گے کہ یہ سب خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لئے ہے اور وہی اس کا مالک ہے (سَيَقُولُونَ لِلَّهِ)۔ اس لئے کہ علم کی بارگاہ سے اس کے سوا اور کوئی جواب مل نہیں سکتا، قرآن اس کے بعد کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ جب تمہارا علم و بصیرت تمہیں اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے تو پھر تم اصل حقیقت کو کبھی اپنے سامنے کیوں نہیں لاتے، قُلْ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ (۲۳/۸۵)۔ اس کے

بعد وہ ان سے کہتا ہے کہ قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمَوَاتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ (۲۳/۸۶) ان سے پوچھو کہ فضا نے آسمانی میں تیرنے والے کروں پر کس کا اقتدار ہے؟ بلکہ یہ پوچھو کہ پوری کی پوری کائنات کا مرکزی کنٹرول کس کے اختیار میں ہے۔ اس کے جواب میں بھی یہ کہہ دیں گے کہ اللہ کے ہاتھ میں (سَيَقُولُونَ لِلَّهِ)۔ اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ جب حقیقت یہ ہے تو پھر تم اس کی نگہداشت کیوں نہیں کرتے؟ پھر قرآن کہتا ہے کہ ان سے پوچھو کہ قُلْ مَنْ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُخَيِّرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ (۲۳/۸۸) کائنات پر قبضہ و اختیار کس کا ہے۔ وہ کون ہے جس کی طرف ہر شے اپنی حفاظت کے لئے پناہ ڈھونڈتی ہے اور جو اس کے قانون کی خلاف ورزی کرے اسے کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ بتاؤ کہ تمہارا علم و فکر اس کا کیا جواب دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے جواب میں بھی یہ کہیں گے کہ یہ سب کچھ خدا کے قانون کے مطابق ہو رہا ہے (سَيَقُولُونَ لِلَّهِ)۔

خارجی کائنات میں قوانین خداوندی کی ان کار فرمایوں کا اقرار لینے کے بعد قرآن کہتا ہے کہ ان سے پوچھو کہ جب ان کی عقل و بصیرت انہیں اس نتیجے پر پہنچاتی ہے کہ یہ تمام اشیاء خدا کے قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہیں تو اس بات پر یقین رکھنے کے لئے انہیں کہاں سے دھوکا لگتا ہے کہ انسانی دنیا میں قوانین خداوندی کی ضرورت نہیں۔ یہاں انسان اپنے وضع کردہ قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکتا ہے (فَأَن تَشْهَرُونَ) (۲۳/۸۹) انسانی زندگی کے لئے بھی محکم اور اہل قوانین خدا ہی کی طرف مل سکتے ہیں بَلْ آتَيْنَاهُم بِالْحَقِّ (۲۳/۹۰)۔ لیکن اگر یہ اس حقیقت پر ایمان نہیں لاتے اور خارجی کائنات پر کنٹرول رکھنے والے خدا کے ایمان ہی کو ایمان بائبل سمجھتے ہیں تو یہ اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں۔ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ (۲۳/۹۰) خدا پر ایمان کا دعویٰ اسی کا ہے جو خارجی کائنات میں خدا کی کبریائی کے ساتھ اس حقیقت پر بھی ایمان رکھے کہ انسان کو راہ نئی بھی خدا ہی طرف سے ملتی ہے۔ اسے وحی کہتے ہیں۔ بالفاظ دیگر وحی پر ایمان کے بغیر خدا پر ایمان کی کچھ حقیقت نہیں رہ جاتی۔

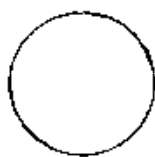
اوسپنسکی کے الفاظ میں :-

اگر وحی کا تصور نہ ہو تو مذہب ہی باقی نہیں رہتا۔ مذہب میں کوئی عنصر تو ایسا ہوتا ہے جو انسانی فکر کے احاطہ سے باہر ہو۔ اس لئے اگر یہ کوشش کی جائے کہ جن باتوں کو انسانی عقل اچھا سمجھتی ہے انہیں ایک جگہ اکٹھا کر کے اس کا نام مذہب رکھ لیا جائے تو اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اسی کوششوں کا نتیجہ مذہب نہیں بلکہ ایک زبوں حال فلسفہ ہوگا۔

(A NEW MODEL OF THE UNIVERSE, P-34)

لہذا خدا پر ایمان کے لئے ضروری ہے کہ اس کی وحی پر ایمان لایا جائے۔ اس ایمان کو ایمان بالرسول (رسولوں

پرایمان، اور ایمان بالکتاب (خدا کی کتابوں پر ایمان) کہتے ہیں۔ چونکہ قرآن خدا کی طرف سے نازل شدہ وحی کا آخری، مکمل اور واضح ضابطہ ہے اور یہ نوع انسان کو مُحَمَّدٌ رسول اللہ (صلعم) کی وساطت سے ملا ہے (جو سلسلہ نبوت و رسالت کی آخری کڑی ہیں) اس لئے قرآن اور مُحَمَّدٌ رسول اللہ پر ایمان، خدا پر ایمان کی لازمی کڑی ہے۔



عقل اور دین

سابقہ باب میں اس حقیقت کو سامنے لایا گیا تھا کہ انسانی ذات کی نشوونما ان قوانین کی رُو سے ہوتی ہے جو وحی کے ذریعے ملتے ہیں اور وحی عقل انسانی کی پیداوار نہیں ہوتی۔ اس کا سرچشمہ ذہن انسانی نہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وحی جن حقائق اور نظام زندگی کو پیش کرتی ہے انہیں عقل کی رُو سے سمجھا بھی نہیں جاسکتا۔ اس نکتہ کی وضاحت ذرا آگے چل کر کی جائے گی۔ اس وقت اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ عقل بھی انکشاف حقیقت کے لئے کوشش کرتی ہے لیکن جس طرح آنکھ (دوربین کے بغیر) ایک خاص حد تک دیکھ سکتی ہے اس سے آگے نہیں دیکھ سکتی اسی طرح عقل کی کارفرمائی کا ایک خاص دائرہ ہے۔ جو امور اس دائرے سے باہر ہوں وہ ان کے متعلق کوئی تحقیق و

عقل کی محدودیت

تفتیش نہیں کر سکتی۔ (مثلاً کیلی فورنیا کی رصد گاہ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر اٹیکس کے الفاظ میں :-
کائنات کے آغاز اور انجام کے متعلق ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔

(THE GREAT DESIGN)

دوسرے عقل انسانی کی رُو سے جس قدر تحقیقات کی جاتی ہیں ان کے متعلق کسی مقام پر بھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اس باب میں صرف آخر ہیں۔ اس سے آگے کچھ اور نہیں۔ اس ضمن میں ریڈنگ یونیورسٹی کا طبیعیات کا پروفیسر ڈاکٹر جیمز آرنلڈ کرودتھ لکھتا ہے کہ

نظام فطرت اپنی گہری بنیادی سادگی میں اس قدر پیچیدگی ہے کہ دنیا کے سائنس میں کسی موضوع پر صرف آخری
آخری انسان کے لئے ہی پھوڑنا پڑتا ہے۔ (ایضاً ص ۵۲)

عقل کی یہ محدودیت اور حدود سترس کی یہ کیفیت خارجی کائنات کے متعلق ہے۔ جہاں تک انسانی دنیا کا تعلق ہے اس میں اس کی

تحقیقات کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں اس کا طریق تجرباتی ہوتا ہے۔ وہ کسی ایک مسئلہ کو لیتی ہے۔ اس کا کوئی حل سوچتی ہے اور اس حل پر تجربہ شروع کر دیتی ہے۔ صدیوں کی مسلسل سعی و کوشش کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ تجربہ ناکام رہا۔ وہ حل غلط تھا۔ پھر وہ کوئی دوسرا حل سوچتی ہے اور اس پر تجربہ شروع کر دیتی ہے۔ اس طرح متعدد ناکام تجارب کے بعد اسے کامیابی حاصل ہوتی ہے، اس دوران میں انسانیت کو جس قدر نقصان پہنچتا ہے اس کا اندازہ تاریخ کے اوراق سے لگ سکتا ہے۔ مثلاً جب انسان نے مدنی زندگی شروع کی تو عقل نے یہ فیصلہ کرنا چاہا کہ اس کے اجتماعی امور کے حل اور افراد اور قبائل و اقوام کے باہمی تنازعات کے تصفہ کے لئے کس قسم کا نظام وضع کیا جائے۔ اس نے اس تجربے کی ابتداء انفرادی اقتدار سے کی۔ صدیوں کے تجربے نے بتایا کہ یہ طریق، انسانیت کی نشوونما کے لئے بڑا مضرت رسا ہے۔ پھر اس نے ایک اور حل سوچا۔ اسے ناکام پایا تو کوئی دوسرا حل سامنے رکھا۔ اس طرح وہ اب خدا خدا کر کے جمہوریت تک پہنچی ہے۔ آپ سوچئے کہ عقل انسانی کو ابتدائی طرز حکومت سے جمہوریت تک پہنچنے میں کتنی صدیاں لگ گئیں اور اس دوران میں نوع انسان کو کتنے خون کے دریا پیرنے اور کتنی آتشیں خندقیں عبور کرنی پڑیں۔ اور یہ جمہوریت بھی کون سی امن و سکون کی ضامن ہے۔ اس ایک مثال سے دیگر امور کے متعلق اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ عقل کا دائرہ عمل محدود اور اس کا طریق کار تجرباتی ہے۔ لیکن اس کی محدودیت کے یہ معنی نہیں کہ انسان عقل کے پیچھے لٹھے کر دوڑنا شروع کرے اور اسے انسانی دنیا سے نکال باہر کرے۔ اگر آنکھ ایک خاص حد کے اندر ہی دیکھ سکتی ہے، اس سے آگے نہیں جاسکتی، تو کوئی صاحب ہوش آنکھ کی محدودیت کی وجہ سے اُسے پھوڑ نہیں دیتا۔ لیکن انسانوں کے خود ساختہ مذہب نے (جس کی بنیاد درحقیقت اس تصوف (MYSTICISM) پر ہے جس کا سرچشمہ فکر فلاطون کی بنیادی غلط نگہی ہے) عقل کے ساتھ ہی کیا۔ ساری دنیا کا مذہبی لٹریچر (وہ شریعت سے متعلق ہو یا طریقت سے) عقل کی تنقیص و مذہب اور عقل | تنگیری سے نہیں بلکہ تحقیر و تذلیل سے بھرا پڑا ہے۔ حتیٰ کہ خود ہمارا (مسلمانوں کا) مروجہ مذہب بھی جو اسی تصوف کا جزو ہے یا اس سے متاثر شدہ تصورات کا مجموعہ ہے، ان کے تنبع میں عقل کے متعلق وہی کچھ کہتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں ہر منبر و محراب سے یہ آواز اٹھتی ہے کہ عقل اور ایمان متضاد عناصر ہیں جو ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ ایمان آنکھیں بند کر کے مان لینے کا نام ہے۔ عقل و فکر، دانش و بینش، علم و بصیرت، دلائل و براہین سے ایمان حاصل نہیں ہو سکتا۔ پھر اس نظریہ کی تائید میں اس قسم کی وضعی روایات کو پیش کر دیا جاتا ہے جن میں (مثلاً) کہا گیا ہے کہ **أَهْلُ الْجَنَّةِ بُلْهٌ**۔ اہلہوں (بے دقوفوں) کا مقام جنت ہے۔ یہ ارباب شریعت کی حالت ہے۔ اہل طریقت ان سے بھی سو قدم آگے ہیں۔ ان کا تو گویا زندگی کا مشن ہی یہ ہے کہ عقل و خرد کی اس قدر مٹی پلید کی جائے کہ کوئی ہوشمند اس "خباثت" کے قریب تک نہ جانا چاہے۔ ان کے ہاں سلمہ

ہے کہ

پائے چوبیس سخت بے تمکیں بود

پائے استدالیایاں چوبیس بود
علم کو ان کے ہاں "حجابِ اکبر" کہا جاتا ہے۔

عقل اور قرآن

انسانوں کے ان خود ساختہ تصورات کے بعد آئیے ہم دیکھیں کہ قرآن کریم اس باب میں کیا کہتا ہے قرآنی تعلیم کے متعلق اگر کم از کم الفاظ میں کچھ کہنا چاہیں تو بلا تامل کہا جاسکے گا کہ قرآن "طلسمہائے فلاطونی" کے خلاف ضربِ کلیمی اور عجیبی بت کدوں کے حق میں "تیمشہ ابراہیمی" ہے۔ اس نے ان تمام تخریبی تصوراتِ حیات کو بڑبڑ بنیاد سے اکھڑ کر رکھ دیا، جو انسانیت کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل تھے۔ جہاں تک موضوعِ زیرِ نظر کا تعلق ہے اس نے انسانی عقل کو بہت بڑا بلند مقام عطا کیا ہے۔ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ وہ حیوان میں ماہر الامتیازِ خصوصیت عقل کو قرار دیتا ہے۔

کہتا ہے کہ پیدائش کے ابتدائی مراحل میں حیوان اور انسان کا راستہ ایک ہی تھا۔ **بَدَا خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ (۳۲/۷)** انسانی زندگی کا آغاز بھی (حیوانات کی طرح) غیر ذی حیات مادہ (INORGANIC MATTER) سے ہوا۔ پھر وہ مختلف ارتقائی منازل طے کرتا اس مقام تک پہنچا جہاں پیدائش کا سلسلہ بذریعہ تولید ہوتا ہے۔ **ثُمَّ جَعَلْنَا نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ مَاءٍ مَرْيُومٍ (۳۲/۸)** یہاں تک انسان اور دیگر حیوانات میں کوئی فرق نہیں تھا۔ **ثُمَّ سَوَّاهُ**۔ اس کے بعد قانونِ ارتقار کی رو سے انسان کے حشو و زوائد کو دور کر کے اس میں خاص تناسب و اعتدال پیدا کیا گیا۔ یہاں سے وہ منزل شروع ہو گئی جہاں پہنچ کر یہ دیگر حیوانات سے مختلف ہو گیا۔ ایسا مختلف کہ قرآن نے اسے "تخلیقِ جدید" سے تعبیر کیا: **ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ (۳۲/۸)** اس مقام پر خدا نے اسے اپنی توانائی کا ایک شمع عطا کر دیا۔ **وَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ نُورِهِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ**۔ تمہیں حواس (SENSSES) عطا کر دیئے جن کے ذریعے تم اپنے اپنے خارجی ماحول کی معلومات فراہم کرتے ہو۔ اور ان کے ساتھ فؤاد (MIND) دے دیا۔ جس سے تم غور و فکر کے بعد استنباطِ نتائج کرتے ہو۔ **قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ (۳۲/۹)** لیکن تم میں بہت تھوڑے ہیں جو ان سے صحیح کام لیتے ہیں۔

علم انسان کا پہلا درجہ علم بذریعہ حواس (PERCEPTUAL KNOWLEDGE) ہے اس کے بعد دوسرا درجہ تصوراتی علم (CONCEPTUAL KNOWLEDGE) کا ہے۔ یہ سب عقل و فکر کی بدولت ہے جو خالص انسانی خصوصیت ہے۔

اس میں کائناتی مخلوق میں سے کوئی اور شریک نہیں۔ قرآن واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ جو لوگ اس امتیازِ خصوصی (یعنی عقل) سے کام نہیں لیتے وہ بدترین خلائق ہیں۔ **إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ**

بدترین خلائق

(iii) یہی لوگ ہیں جنہیں "شیطان" اپنے دام فریب میں الجھا لیتا ہے۔ اور یہی ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے۔

∴

قرآن کی دعوت سزا پا علم و بصیرت کی دعوت ہے۔ وہ قدم قدم پر تدبر و تفکر کا حکم دیتا اور عقل و شعور سے کام لینے کی تاکید کرتا ہے جو لوگ اس دعوت سے انکار کرتے ہیں ان کے متعلق پوچھتا ہے کہ اَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ (۴/۸۲)

تدبر و تفکر | کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر و تفکر سے کام نہیں لیتے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق دوسرے مقام پر ہے اُولَٰئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ... اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (۲۴-۲۳/۲۴) "یہ وہ لوگ ہیں جو عقل و فکر سے کام نہ لینے کی وجہ سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہ کان رکھنے کے باوجود پہرے اور آنکھیں رکھنے کے باوجود اندھے ہوتے ہیں۔ حیرت ہے کہ یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے کیا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں؟" وہ اپنے احکام و ضوابط کی وضاحت کے بعد کہتا ہے، كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ... اٰخِرَةَ (۲/۲۱۹) "اللہ تمہارے لئے اپنے احکام کو واضح طور پر بیان کرنا ہے تاکہ تم ان کے فوری فوائد اور مستقبل میں جا کر نمایاں ہونے والے نتائج پر غور و فکر کر سکو" غور کیجئے اس آیت میں "دنیا اور آخرت" دونوں پر غور و فکر کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔

جب میدان جنگ میں فوجیں ایک دوسرے کے سامنے آئیں تو وہاں کے متعلق عام طور پر یہی کہا اور سمجھا جاتا ہے کہ جس فوج کے سپاہیوں کے جذبات میں زیادہ شدت ہوگی، وہی بے جگرگی سے لڑے گی فلہذا وہی غالب و منصور ہوگی جنگ میں عقل و فکر کا کوئی کام نہیں۔ اگر سپاہی وہاں سوچنے لگ جائیں تو کوئی بھی جان دینے پر آمادہ نہ ہو۔ وہاں فقط اندھے جذبات کام دے سکتے ہیں۔ لیکن قرآن ایسے مقام پر

جنگ میں عقل و فکر | بھی عقل و فکر سے کام لینے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ جماعتِ مومنین سے کہتا ہے کہ اگر تم میں سو سپاہی ہمت و استقلال سے کام لینے والے ہوں گے تو وہ دشمن کے ہزار (یا کم از کم دو سو) آدمیوں پر غالب آجائیں گے۔ یہ اس لئے کہ يٰۤاَيُّهَا قَوْمُ لَا يَفْقَهُوْنَ (۸/۶۵) "فریقِ مخالف عقل و فکر سے کام نہیں لیتا اور تم ایسے نازک وقت میں بھی تدبر و تفکر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے"

تصریحاً بالاسے واضح ہے کہ قرآن عقل و فکر کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ اس ضمن میں سورۃ نبا کی ایک آیت ایسی جامع ہے جس میں قرآن نے تمام تفصیل کو چند الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے اور اگر کہا جائے کہ وہ اس موضوع پر حرفِ آخر ہے تو اس میں کچھ بھی مبالغہ نہیں ہوگا۔ آپ غور کیجئے کہ نبی اکرمؐ عمر بھر دعوت و تبلیغ میں مصروف رہے۔ وہ مختلف طرق و انداز سے قرآنی تعلیم لوگوں کے سامنے پیش کرتے رہے۔ آپ دن رات اپنے پیغام کی نشر و اشاعت میں لگے رہتے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآنی تعلیم کے متنوع گوشے اور مختلف پہلو ہیں۔ یہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہے۔ اس کی تعلیم کی وسعتیں

حدود فراموش اور قیود نا آشنا ہیں۔ لیکن آپ اس پر غور کیجئے کہ اس قسم کی وسیع و عریض تعلیم کا مبلغ اپنے مخاطبین سے کہتا ہے کہ میں تم سے کوئی لمبی چوڑی باتیں نہیں کرنا چاہتا۔ میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں، فقط ایک بات۔ **قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُمْ بِوَعْدِ اللَّهِ**۔ آپ، اندازہ لگائیے کہ یہ ایک بات کس قدر اہم ہوگی؟ یہ ایسی بات ہوگی جس میں اسلام کی ساری تعلیم کا پختہ آجائے۔ جو اس دعوتِ رشد و ہدایت کا لب لباب ہو۔ ہر شخص ایسی بات سننے کے لئے ہمد تن گوش ہو جائے گا۔ ماننے کی غرض سے نہیں تو اس تعجباً ہی ہسی کہ دیکھیں وہ ایک بات ہے کیا؟

اس کے بعد آپ ان سے کہتے ہیں کہ وہ بات ایسی نہیں جسے یونہی چلتے چلتے سُن لیا جائے۔ وہ رُک کر، کھڑے ہو کر، تھم کر سننے کی ہے۔ **أَنْ تَقُولُوا لِلَّهِ مَثْنَىٰ وَفُرَادَىٰ**۔ تم سب نہیں رُکنا چاہتے تو خیر تمہاری مرضی۔ تم ایک ایک دو دو کر کے رُک جاؤ اور اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ آپ غور کیجئے کہ اس انداز میں کس قدر نفسیاتی نزاکتیں پوشیدہ ہیں۔ جب اس طرح تمام توجہات کو اپنی طرف مرکوز کر لیا تو کہا کہ اب سنو کہ وہ ایک بات کیا ہے جو میں تم سے کہنا چاہتا ہوں اور جس کے اندر باقی سب باتیں آجاتی ہیں۔ وہ ایک بات ہے۔

ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا (۳۴/۳۶)

سوچا کرو

غور و فکر کیا کرو، سوچا کرو، سمجھا کرو، عقل سے کام لیا کرو۔ تم نے جب عقل و فکر سے کام لینا شروع کر دیا تو پھر صحیح راستہ اختیار کر لو گے۔ اس لئے کہ ہم جو صحیح راستے کی طرف دعوت دیتے ہیں، وہ دعوتِ علیٰ وجہ البصیرت ہے۔ ہماری دلیل ہی علم و بصیرت اور دانش و بینش سے ہوتی ہے۔ **قُلْ هَذَا سَبِيلِي..... تَبَلَّغْنِي (۱۳/۱۰۸)** ان سے کہہ دو کہ میں جو تمہیں اللہ کی طرف دعوت دیتا ہوں تو میری یہ دعوت علیٰ وجہ البصیرت ہے۔ میں بھی ایسا ہی کرنا ہوں اور میرے اتباع کرنے والے بھی ایسا ہی کریں گے؟ اگر تمہیں اس دعوت سے اختلاف ہے تو اپنے دعوے کی تائید میں دلائل و براہین پیش کرو۔ **قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ** **إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (۲/۱۱۱)** ان سے کہو کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اس کی تائید میں اپنی دلیل پیش کرو۔ علم و بصیرت

اور دلائل و براہین کے بغیر یونہی جھگڑتے چلے جانا کبھی صحیح روش نہیں قرار پا سکتی! **فَلِمَ دَلِيلٍ مِّنْكُمْ** اور دلائل و براہین کے بغیر یونہی جھگڑتے چلے جانا کبھی صحیح روش نہیں قرار پا سکتی! **فَلِمَ دَلِيلٍ مِّنْكُمْ**

دلیل پیش کرو **بِهِ عِلْمٌ (۳۶/۳۶)**۔ تم اس معاملہ میں یونہی کیوں جھگڑتے ہو جس کی بابت تمہیں علم نہیں؟ دوسروں سے جھگڑنا تو ایک طرف، تمہیں خود بھی اس بات کے پیچھے نہیں لگنا چاہئے جس کا تمہیں علم نہ ہو۔ **وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ (۱۷/۳۶)** پھر علم بھی یونہی قیاسی اور ظنی نہیں۔ ایسا یقینی علم جس کی شہادت تمہاری عبادت و بصارت (حواس) اور تمہارا قلب (MIND) دے۔ **إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ... مَسْئُولَا (۱۷/۳۶)**۔ جیسا کہ پہلے

بھی کہا جا چکا ہے علم کی ابتداء ادراک بالحواس (PERCEPTUAL KNOWLEDGE) سے ہوتی ہے۔ سمع و بصر سے مراد اول الذکر علم ہے اعد فواد سے ثانی الذکر۔ لہذا علم وہی علم کہلانے کے قابل ہے جس میں حواس (SENSES) کی شہادت اور قلب (MIND) کی تائید موجود ہو۔ ظن و قیاس کو علم کہا ہی نہیں جاسکتا۔ چنانچہ حقیقت کی مخالفت کرنے والوں کو ظن و قیاس قرآن میں ہے کہ مَا لَهُمْ بِهِ..... (۵۲/۲۸) انہیں حقیقت کا علم نہیں یہ صرف ظن و قیاس کا اتباع کرتے ہیں اور ظن، حق (یقین) کے مقابلے میں کبھی کفایت نہیں

کر سکتا۔

ظن و قیاس تو ایک طرف قرآن اس باب میں یہاں تک کہتا ہے کہ کسی چیز کا محض سرسری نظروں سے دیکھنا کافی نہیں۔ وہی دیکھنا کچھ معنی رکھتا ہے جس کے ساتھ غور و فکر شامل ہو۔ چنانچہ وہ ایسے لوگوں کے متعلق جو نبی اکرم کی مجلس دعوت ارشاد میں آکر حضور کو سرسری نگاہوں سے دیکھتے اور آپ کی باتوں کو سرسری طور پر سنتے تھے دراصل ایک ان کا خیال کہیں اور ہوتا تھا کہتا ہے کہ تَرَاهُمْ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ (۷۸/۷۸) وہ نہیں ایسے نظر آتے ہیں کہ وہ تیری طرف دیکھتے ہیں، لیکن وہ درحقیقت دیکھتے نہیں۔ ”نظر“ اور ”بصر“ کا یہ لطیف فرق قابل غور ہے۔ اسی طرح وہ کہتا ہے وَ مِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ (۱۰۷/۲۲) اور ان میں وہ بھی ہیں جو (بظاہر) تیری طرف کان لگائے دکھائی دیتے ہیں، لیکن چونکہ وہ تمہاری باتوں کو دل کے کانوں سے نہیں سنتے۔ جو کچھ کہا جاتا ہے اس پر غور نہیں کرتے۔ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔ اس لئے ان کا یہ سننا درحقیقت سننا نہیں۔ أَفَأَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَ كُنَّا لَا نَعْقِلُونَ (۱۰۷/۲۲) کیا تو ان بہروں کو سنا سکے گا جو عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔ یہ آنکھوں والے نہیں بلکہ درحقیقت اندھے ہیں۔ أَفَأَنْتَ... لَا يُبْصِرُونَ (۱۰۷/۲۳)۔ تو کیا تو ایسے اندھوں کو صحیح راستہ دکھا سکے گا جو عقل و بصیرت سے کام ہی نہ لیں (نیز دیکھئے ۲۵/۱۶ از ۲۶/۱۶)۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جن لوگوں کی زبان عربی ہے (یا جو عربی زبان جانتے ہیں) وہ تو قرآن کے مطالب سے واقف ہوتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ کسی کتاب کے مطالب کو سمجھنے کے لئے اس زبان کا جاننا ضروری ہے جس میں وہ کتاب لکھی گئی ہے۔ لیکن یہ محض زبان جاننا کافی نہیں | ضروری نہیں کہ محض زبان کے جاننے سے اس کتاب کے مطالب بھی سمجھ میں آجائیں۔ مطالب سمجھنے کے لئے غور و فکر اور عقل و شعور سے کام لینے کی ضرورت

ہوتی ہے۔ چنانچہ (سورہ ہود میں ہے کہ) حضرت شعیب کی دعوت کے جواب میں ان کی قوم کہتی تھی کہ مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ (۱۱/۹۱) جو کچھ تو کہتا ہے اس میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو ہماری سمجھ میں ہی نہیں آتیں۔ (حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ حضرت شعیب اپنی قوم کی زبان میں ہی گفتگو کرتے تھے۔ خود نبی اکرم کے اولیں مخاطب عرب ہی تھے لیکن ان میں سے کبھی وہی ایمان

لائے تھے جو وحی کے پیغام پر غور و فکر کرتے تھے۔ جو لوگ ایسا نہیں کرتے تھے وہ اس پیغام کی صداقت و حقانیت کو نہیں پہچان سکتے تھے۔ نبی اکرمؐ جب ان کی حالت پر غور کرتے اور دیکھتے کہ جس غلط روش پر چلے جا رہے ہیں وہ انہیں کس طرح تباہی اور بربادی کے جہنم کی طرف لئے جا رہی ہے تو ایک مشفق طبیب کی طرح آپ کا دل کڑھتا اور آپ چاہتے ہیں کہ انہیں کسی نہ کسی طرح صحیح راستے پر لے آیا جائے، انہیں تباہی سے بچایا جائے خواہ اس کے لئے ان پر جبر ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ آپ کی اس خواہش اور آرزو کے جواب میں کہہ دیا گیا کہ ایمان وہی ہے جو سمجھ سوچ کر لایا جائے۔ جبر سے منوائی ہوئی بات کو ایمان کہہ ہی نہیں سکتے۔

دیکھو کہ ایمان تو دل کی رضا مندی اور ذہن کے اطمینان سے لایا جاتا ہے۔ دیکھئے اس باب میں قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ

ایمان وہی ہے جو سمجھ سوچ کر لایا جائے

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسًا أَسْفًا (۱۸/۶) اے رسول! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تو اس غم میں کہ یہ لوگ صحیح بات کو مانتے کیوں نہیں ان کے پیچھے اپنی جان گھلا لے گا۔ حالانکہ اگر زبردستی لوگوں کو مسلمان بنانا مقصود ہوتا تو اللہ کے لئے کیا مشکل بنتا کہ وہ انسان کو پیدا ہی اس طرح کرتا کہ وہ (دوسرے حیوانات کی طرح) مجبوراً ایک ہی روش پر چلتا۔ لیکن اس نے دانت ایسا نہیں کیا۔ اس نے انسان کو اختیار و ارادہ دیا ہے اور اختیار و ارادہ کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ جس روش کو چاہے اپنی مرضی سے اختیار کرے۔ وَ لَوْ شَاءَ رَبُّكَ جَمِيعًا (۱۰/۹۹) لہذا یہ غلط ہے کہ تو لوگوں کو زبردستی مومن بنا لے۔ أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (۱۰/۹۹) ایمان خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق لایا جاتا ہے وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تُؤْمِنَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ اور وہ قانون یہ ہے کہ وَ يَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ (۱۰/۱۰۰) جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے وہ شکوک اور التباس میں بہتے ہیں۔ ان پر حقیقت واضح نہیں ہوتی۔ ان کی نگاہ کے سامنے بات صاف نہیں ہوتی۔ لہذا

ایمان وہی لاسکتے ہیں جو عقل و فکر سے کام لیتے ہیں۔

یہاں قرآن نے کہا ہے کہ جو بات کسی سے جبراً منوائی جائے اسے ایمان کہہ ہی نہیں سکتے۔ ایمان وہی ہے جو عقل و فکر کی بنیاد پر لایا جائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کسی کو مجبور کرنے سے مراد یہ ہے کہ وہ شخص اپنی عقل و فکر سے کام نہ لے سکے۔ اس جبر کی ایک قسم تو یہ ہے کہ کسی کے سر پر تلوار رکھ کر کہا جائے کہ جو کچھ تم سے کہا جاتا ہے اسے مانو ورنہ تمہارا سر قلم کر دیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں عقل و فکر سے کام لینے اور اپنے اختیار و ارادہ سے فیصلہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسری شکل یہ ہے کہ کسی اور طریق سے عقل و فہم کو اس طرح ماؤف کر دیا جائے کہ وہ شخص سمجھنے سوچنے کے قابل نہ رہے اور یوں دوسرے سے دب کر، بلکہ ڈر کر اس کی بات مان لے۔ اسے تو ہم پرستی

معجزہ دیکھ کر ایمان نہیں لایا جاسکتا (SUPERSTITION) کہتے ہیں۔ قرآن نے متعدد مقامات

یہ رسول اللہ کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کوئی معجزہ دکھائیے تو ہم آپ کی دعوت پر ایمان لے آئیں گے۔ ان سے کہو کہ ایمان عقل و فکر کی رُو سے کسی بات کے ماننے کو کہتے ہیں۔ معجزہ دیکھ کر کسی بات کو مان لینا ایمان نہیں کہلا سکتا۔ مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ میں تم سے جو کچھ کہتا ہوں وہ بالکل سچ ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ میں آگ پر چل سکتا ہوں بظاہر ہے کہ آگ پر چل کر دکھا دینا اس کے پہلے دعویٰ کی دلیل نہیں بن سکتا۔ چنانچہ قرآن میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ رسول اللہ کو (قرآن کے سوا) کوئی معجزہ نہیں دیا گیا۔ سورۃ النعام میں ہے: وَإِنْ كَانُ... يَسْمَعُونَ (۲۶-۳۵) اے رسول! اگر یہ بات تجھ پر بہت گراں گزرتی ہے کہ یہ لوگ تمہارے پیغام سے اعراض کیوں برت رہے ہیں تو اگر تو اس کی استطاعت رکھتا ہے کہ زمین میں کوئی سرنگ تلاش کرے یا آسمان تک کوئی سیڑھی لگا لے اور اس طرح انہیں کوئی معجزہ دکھائے۔ (تم ایسا کر دیکھو۔ لیکن

حضور کو کوئی حسی معجزہ نہیں دیا گیا

اس طرح انہیں مومن نہیں بنایا جاسکتا) اگر اس طرح سب کو زبردستی مومن بنانا مقصود ہوتا تو اللہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق نہایت آسانی سے ایسا کر دیتا۔ سو تو یہ سب کچھ جاننے بوجھنے کے باوجود ان میں سے نہ ہو جا جو حقیقت سے بے خبر ہوتے ہیں۔ یاد رکھو پیغامِ صداقت پر لبیک وہی کہتے ہیں جو اسے دل کے کانوں سے سنتے ہیں۔

قرآن کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ جو لوگ خدا اور تعصب یا تقلید اور جہالت کی بنا پر عقل و فکر سے کام نہیں لیتے کچھ عرصہ کے بعد ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ یہ بہت بڑی حقیقت ہے جس کی طرف قرآن کریم نے راہ نمائی کی ہے۔ ماہرینِ علم الحیات (BIOLOGISTS) کا کہنا ہے کہ جس عضو سے کوئی کام نہ لیا جائے کچھ عرصہ کے بعد فطرت اسے بیکار سمجھ کر معدوم ہی کر دیتی ہے اور پھر وہ نوع اس عضو سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ جو لوگ اپنی بیرونی بنا لیں کہ ”ہم سے جو کچھ کہا جائے گا ہم اس سے بلا سوچے سمجھے انکار کر دیں گے اور ایک دفعہ انکار کر دینے کے بعد پھر انکار ہی کئے چلے جائیں گے“ ان لوگوں میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔

فکر کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے

ان کی روش اختیار کر لیتے ہیں انہیں ان کی زندگی کے تباہ کن عواقب سے متنبہ کرنا یا نہ کرنا برابر ہے۔ وہ ایک بار انکار کر دینے کے بعد پھر کبھی اعترافِ حقیقت نہیں کریں گے۔ ان کی اس روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خدا کا قانونِ سکافات ان کے دلوں اور کانوں پر مہریں لگا دیتا ہے۔ اور ان کی آنکھوں پر پردے بڑ جاتے ہیں۔ ان کا انجام بڑا دردناک ہوتا ہے۔ یہ اس لئے کہ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا... الْمُعْتَدِينَ (۱۰۴) ”وہ حقیقت و صداقت سے محض اس لئے انکار کرتے ہیں کہ اس سے پہلے یہ (یا ان کے آباؤ اجداد) اس سے انکار کر چکے ہیں اس طرح اللہ کا قانون

ردّ عمل ان سرکشوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے: یہ مہر میں خود ان کی اپنی روش کا نتیجہ ہوتی ہیں کَلَّا بَلَّ سَرَّانَ عَلٰی قُلُوبِهِمْ فَمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (۸۳/۸۴)۔ (حقیقت یہ نہیں جسے یہ لوگ اپنے طور پر سمجھے بیٹھے ہیں کہ اللہ یونہی لوگوں کے دلوں پر مہریں لگا دیتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ان لوگوں کے اپنے اعمال زنگ بن کر ان کے دلوں پر لگ جاتے ہیں: ان کی حالت یہ ہوتی ہے

دلوں میں مہر ہیں کیسے لگتی ہیں

کہ وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِبَيِّنَاتٍ لَّيَعْلَمُونَ (۵۸-۵۹/۳۰) جب ان کے سامنے خدا کا قانون پیش کیا جاتا ہے تو اس پر عقل و فکر سے غور کر کے کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتے۔ ان کا پہلا ردّ عمل یہ ہوتا ہے کہ یہ (پیغام پہنچانے والا) دھوکے باز ہے۔ اس کے بعد وہ اس کے ماننے سے یکسر انکار کر دیتے ہیں۔ اس طرح اللہ ان لوگوں کے دلوں پر مہریں لگا دیتا ہے جو علم و بصیرت سے کام نہیں لیتے۔ كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (۵۹/۲۰ ذ ۵۴/۱۸)۔ مہریں لگنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے دل حقیقت کی طرف سے پھر جاتے ہیں، اور یہ سب اس لئے کہ یہ لوگ تدبیر و تفقہ سے کام نہیں لیتے۔ صَاحِفَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُوْنَ (۹/۱۲۷)

قرآن نے اس کی وضاحت کر دی ہے کہ جہاں کہا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں اور وہ اندھے ہو جاتے ہیں تو اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے ماتھے کی آنکھیں پھوٹ جاتی ہیں۔ یہ طبعی طور پر اندھے

(PHYSICAL BLIND) ہو جاتے ہیں۔ نہیں۔ یہ مراد

دل کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں

انہیں۔ ان کے ماتھے کی آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں۔ دل کی آنکھوں سے روشنی جاتی رہتی ہے۔ اَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فِي الصُّدُورِ (۲۲/۴۶) کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ اقوام گذشتہ کی بستیوں کے اُجڑے ہوئے کھنڈرات ان کے لئے باعثِ عبرت بنتے اور اس طرح ان کے دل ایسے ہو جاتے جن سے یہ سمجھنے سوچنے کا کام لے سکتے۔ ان کے گوش، نصیحتِ نبیوش بن سکتے۔ اس لئے کہ عقل و فکر سے کام نہ لینے کی وجہ سے ماتھے کی آنکھیں اندھی نہیں ہوا کرتیں۔ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینے کے اندر ہیں۔

مندرجہ بالا آیت میں قرآن نے "سَيَرُوا فِي الْأَرْضِ" کی تاکید کی ہے۔ اس سے ذہن اس گوشے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس میں قرآن نے بتایا ہے کہ اس کے سمجھنے کا طریق کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کسی پیغام

قرآن فہمی کے تین طریق

یا نظام کو پرکھنے کا طریق یہ ہے کہ (۱) جس سطح تک تمہارے زمانے میں علم پہنچ چکا ہے اسے اس علم کی رُو سے پرکھو اور دیکھو کہ علم کی بارگاہ سے اس کے متعلق کیا فتوے ملتا ہے۔ یا

(ii) یہ دیکھو کہ اقوام سابقہ میں سے جس قوم نے اس نظام کے مطابق زندگی بسر کی تھی اس کے نتائج کیا نکلے اور جس نے اس کی خلاف ورزی کی اس کا مال کیا ہوا۔

اور تیسرا طریقہ یہ ہے کہ جو جماعت اس نظام پر عمل پیرا ہو رہی ہے اسے اطمینان سے اسے عمل میں لانے دو۔ اس کے بعد اس کے نتائج خود بتا دیں گے کہ یہ نظام اپنے دعاوی میں سچا ہے یا جھوٹا۔ سورہ یونس میں ہے: **بَلْ كَذَّبُوا..... الظَّالِمِينَ** (۱۰/۳۹) یہ لوگ اس پیغام کو جھٹلا رہے ہیں جس کا انہوں نے علمی طور پر احاطہ نہیں کیا۔ **وَلَمْ يَخِشُوا بِهَا عِلْمًا** (۲۴/۸۴) نہ انہوں نے اس کا انتظار کیا ہے کہ اس کے نتائج سامنے آجائیں تو ان کو دیکھ لیا جائے کہ اس کا دعویٰ سچا ہے یا جھوٹا۔ اسی طرح ان اقوام نے اس کی تکذیب کی تھی جو ان سے پہلے ہو گزری ہیں۔ یہ کم از کم یہی دیکھ لیتے کہ ان اقوام کا انجام کیا ہوا تھا۔ غور کیجئے: قرآن نے یہ تینوں طریقے تجویز کر کے کس طرح علم و عمل کے تمام گوشوں کو اپنے اندر سمیٹ لیا۔ اس نے کہا کہ ہے کہ یا تو انسان قرآنی حقائق کو علمی نقطہ نگاہ سے دیکھے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اسے اپنے زمانے کے علوم تک دستگاہ ہو۔ یا تاریخ کے اوراق سے پوچھے کہ اس قسم کے نظام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا انجام کیا ہوا تھا۔ اور تیسرا طریقہ استنتاجی (PRAGMATIC) ہے جس میں کسی پروگرام کے نتیجے سے اس کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ تینوں زمانوں کو محیط ہو جاتا ہے۔ تاریخی شہادت سے ماضی کا زمانہ، اپنے دور کی علمی سطح سے زمانہ حال، اور مرتب ہونے والے نتائج سے زمانہ مستقبل۔

یہ تیسرا طریقہ وہ ہے جس پر نبی اکرم نے خاص طور پر زور دیا تھا کیونکہ وہ لوگ نہ اقوام سابقہ کی سرگزشتوں سے عبرت حاصل کرنا چاہتے تھے اور نہ ہی ان کا علم اتنا زیادہ وسیع تھا کہ وہ اس کی کسوٹی پر قرآن کے دعاوی کو پرکھ سکیں اس لئے آپ ان سے بار بار فرماتے تھے کہ **قُلْ يٰقَوْمِ... الظَّالِمُونَ** (۹/۱۳۶) ”اے گروہ مخالفین تم اپنے پروگرام پر عمل پیرا ہو اور میں اپنے پروگرام پر عمل پیرا ہوں (نہ تم میرے پروگرام میں دخل دو، نہ میں تمہارے پروگرام میں دخل انداز ہوتا ہوں) نتیجہ مرتب ہونے پر معلوم ہو جائے گا کہ آخر الامر کامیابی کس کی ہوتی ہے۔ اس وقت یہ حقیقت محسوس طور پر سامنے آجائے گی کہ وقت انون خداوندی کی رو سے ظالموں کی گھنٹی کبھی پروان نہیں چڑھا کرتی“

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کی رو سے وحی پر ایمان علم و عقل کی رو سے ہی لایا جاسکتا ہے۔ خواہ یہ نظری دلائل سے ہو اور خواہ وحی کے متعین کردہ نظام کے نتائج کو اپنے سامنے مشہود دیکھ کر۔ بہر حال ایمان کی عمارت علم و بصیرت اور عقل و فکر کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ حقیقت کو سمجھنے اور اسے تسلیم کرنے کا اور کوئی طریقہ نہیں۔ قرآن نے واضح

لے قرآن تاریخی شواہد پر بڑا زور دیتا ہے۔ اس حقیقت کو ہم نے ایک مستقل باب میں الگ بیان کیا ہے جو آگے چل کر سامنے آجائے گا۔

الفاظ میں بتا دیا ہے کہ جو لوگ علم و بصیرت اور فہم و تدبیر سے کام نہیں لیتے۔ وہ کبھی ان لوگوں جیسے نہیں ہو سکتے جو عقل و فکر سے کام لیتے ہیں۔ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَدْرُسُونَ (۶/۵۰) نیز ۱۱/۲۳

اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں (۱۳/۱۶) "ان سے کہو کہ کیا اندھا اور آنکھوں والا کبھی برابر نہیں ہو

سکتے ہیں۔ کیا تم اس حقیقت پر غور و فکر نہیں کرتے؟ دوسری جگہ ہے۔ وَمَا يَسْتَوِي... (۱۹-۳۵/۲۲) "اندھا اور آنکھوں والا کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ نہ ہی اندھیرا اور روشنی ایک جیسے ہو سکتے ہیں۔ نہ دھوپ اور سایہ۔ نہ ہی زندہ اور مردہ برابر ہو سکتے ہیں۔ تم انہیں نہیں سنا سکتے جو قبروں میں جا پڑیں۔ سنایا اسی کو جاسکتا ہے جو (قانونِ خداوندی کے مطابق) خود سننا چاہے۔" اس حقیقت کو چند الفاظ میں سنا کر یوں بیان فرمایا کہ هَلْ يَسْتَوِي... اذْوَ الْأَلْبَابِ (۳۹/۹) "کیا وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے، ایک دوسرے کے برابر ہو سکتے ہیں؟ (جب وہ برابر نہیں ہو سکتے تو اس حقیقت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے کہ نصیحت وہی قبول کر سکتے ہیں جو عقل و فکر سے کام لیں؟ جو لوگ عقل و فکر سے کام لیں ان کے سامنے خدا کی طرف لے والی راہیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۲۹/۶۹) جو لوگ ہماری راہ میں جدوجہد کرتے ہیں ہم انہیں اپنی طرف آنے والے راستے دکھاتے چلے جاتے ہیں۔

لہذا، ایمان عقل و فکر کی رُو سے لایا جاتا ہے اور کوئی فرد یا قوم جس قدر زیادہ تدبیر و تفکر سے کام لے اس کے سامنے آتی ہی زیادہ زندگی کی راہیں کشادہ ہوتی چلی جاتی ہیں۔



ایمان کے بعد عمل کا سوال سامنے آتا ہے اور عمل کے متعلق بے ساختہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اس کا تعلق یکسر جذبات سے ہے۔ عقل و فکر سے نہیں۔ جذبات کو ابھارنے سے آپ انسان سے بڑے سے بڑا کام کر سکتے ہیں۔ اس طرح وہ ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار ہو جاتا ہے حتیٰ کہ وہ جان تک دے دینے میں ذرا تاثر و توقف نہیں کرتا۔

عمل کا محرک کیا ہے؟ اگر اس وقت انسان عقل سے مشورہ کرنے بیٹھ جائے تو اسے کبھی اس اشارہ اور قربانی کی

اجازت نہیں دے گی۔ اس موضوع پر کسی سے بات کیجئے وہ اس چیز کو مسئلہ کی حیثیت سے پیش کر دے گا کہ عمل کے محرک جذبات ہی ہو سکتے ہیں عقل نہیں۔ اور اس مسئلہ کی تائید میں اس قسم کے اشعار بھی پیش کر دے گا کہ

بے خطر کو دہرا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لبِ بامِ ابھی

یاد رہے کہ

اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بے گانہ کیا
جو یہ کہتا تھا خود سے کہ بہانے نہ ترا شیخ

لیکن قرآن اس باب میں بھی جذبات میں بہنے کی بجائے حقیقت کو سامنے لاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جذبات کو مشتعل کر کے آپ کسی سے ہنگامی طور پر تو کام لے سکتے ہیں۔ لیکن اس سے نہ تو عمل میں استقامت پیدا ہوتی ہے۔ نہ ہی کیریکٹر بنتا ہے۔ استقامت سے کیریکٹر کی تشکیل ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ مومنین کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَسْخَرُوا عَلَيْهَا صَبْرًا وَعُمِّيَانًا (۲۵/۲۳) ”مومنین وہ ہیں کہ جب ان کے سامنے (اور تو اور) خود خدا کے قوانین بھی پیش کئے جاتے ہیں تو وہ ان پر بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گر پڑتے۔ ظاہر ہے کہ جب احکام خداوندی پر بھی سوچ سمجھ کر عمل کرنے کی تلقین ہے تو دیگر امور میں محض جذبات کی بنا پر آمادہ بہ عمل ہونا کس طرح مستحسن قرار پاسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جذباتی لوگوں پر کبھی اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ ہو سکتا ہے

عمل بھی عقل و فکر کی رُو سے ہونا چاہیے کہ ایک وقت میں آپ ان کے جذبات کو ابھار کر ان کی جان

مہمک بھی لے لیں لیکن دوسرے وقت میں وہ آپ کو ایک پیسہ تک دینا بھی گوارا نہ کریں، اعتماد اور بھروسہ صرف انہی پر کیا جاسکتا ہے جو عقل و فکر کی بنا پر کوئی راستہ اختیار کریں اور جو قدم اٹھائیں سوچ سمجھ کر اٹھائیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو شاہراہ حیات پر استقلال و استقامت سے گامزن رہیں گے اور آخر الامر منزل مقصود تک جا پہنچیں گے۔ انہی کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (۲۱/۲۰) ”جو لوگ اس حقیقت پر ایمان رکھتے ہیں کہ ان کا نشوونما دینے والا اللہ ہے اور پھر اس پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں تو یہی لوگ ہیں جن پر ملائکہ نازل ہوتے ہیں۔“

:

اس مقام پر ہمارے سامنے وہ اہم اور نازک سوال آتا ہے جو سطح بین حضرات کے ذہن کو طلسم پریچ و تاب بنائے

رکھتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں جس قدر فتنہ و فساد برپا ہے وہ، یو قوفوں کی وجہ سے نہیں۔ ان لوگوں کی وجہ سے ہے جو بڑی عقل و فکر کے مالک ہیں۔ دنیا در حقیقت مختلف عقول کی کشمکش (BATTLE

OF WITS) کی رزمگاہ ہے۔ یہاں صبح سے شام تک عقلوں کی جنگ جاری رہتی ہے جو سب سے زیادہ عقل و فکر کا مالک

۱۲۔ ایسے مقامات میں عقل سے مفہوم کیا ہے اس کے متعلق ذرا آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔

ہوتا ہے وہ سب سے زیادہ چالاک اور ہوشیار ہوتا ہے اور اپنے سے کم عقل والوں کو فریب دے کر ان کا سب کچھ چھین کر لے جاتا ہے۔ افراد سے آگے بڑھتے تو یہی حالت اقوام کی ہے۔ جو قوم زیادہ سمجھدار ہے وہ کم عقل رکھنے والی قوم کو اپنا (سیاسی یا معاشی) غلام بنائے رکھتی ہے۔ یہی نہیں کہ ان کی عقل انہیں ہر وقت ایسی ایسی تدابیر سمجھاتی رہتی ہے جن سے وہ کمتر عقل والی اقوام کی کھال اتارتے رہتے ہیں۔ ان کی عقل ایسے دلائل بھی فراہم کرتی ہے جو ان کے ان سیاسی اور اقتصادی حربوں کو حق بجانب (JUSTIFIED) قرار

عقل فریب کار ہے

دیتے اور دنیا کی نگاہوں میں انہیں بڑا خوش آئند بنا کر دکھاتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض اوقات انہی دلائل کی بنا پر ایسے اشخاص یا اقوام کے اس قسم کے اعمال خود ان کی اپنی نگاہوں میں بھی مستحسن بن کر دکھائی دینے لگ جاتے ہیں اور وہ غیر شعوری طور پر اپنے آپ کو بالکل حق بجانب سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر انسانی عقل نہ صرف دوسروں کو دھوکا دیتی ہے بلکہ خود اس شخص کو بھی دھوکا دے جاتی ہے جس کی یہ عقل ہوتی ہے۔ چنانچہ (H.C. WARREN) کی (DICTIONARY OF PSYCHOLOGY) عقل RATIONALITY کی تعریف ہی یہ لکھی ہے کہ

س۔ اس ذہنی عمل کا نام ہے جو اس کام یا رائے کے جواز کے لئے خوش آئند دلائل تراشے جو درحقیقت کسی اور ہی جذبے کے ماتحت پیدا ہوا ہو۔ خواہ اس شخص کو جس کی عقل یہ کچھ کر رہی ہے اس کا احساس تک بھی نہ ہو۔

جوڈ C.M. JOAD لکھتا ہے کہ

عقل اس وقت کا نام ہے جس سے ہم اپنے آپ کو دھوکا دے سکتے ہیں کہ جس بات کو ہم صحیح ماننا چاہتے ہیں وہ فی الواقعہ صحیح ہے

حشی کہ

عقل انسان کے جذبات کے پیچھے اس طرح چلتی ہے جس طرح کتے کے پاؤں اس کی ناک کے پیچھے چلتے

DECADANCE

ہیں۔

قرآن بھی اس حقیقت کی تائید کرتا ہے کہ انسان اپنے جذبات سے مغلوب ہو جائے اور انہی کو اپنا "خدا" بنا لے تو (شرابی کی طرح) اس کی عقل اس کی صحیح راہ نمائی کرنے کے قابل نہیں رہتی۔ وہ کہتا ہے۔ اَمَّاؤَيْتَ مِّنْ اَتَّخَذَ الْهٰهٗ هَوٰٓءَہٗ۔ کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو اپنے جذبات کو اپنا معبود بنا لیتا ہے۔ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَاٰلِہٖٓ وَسَلَّمَ۔ کیا تو ایسے شخص کا نگران و محافظ بن سکتا ہے؟ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ اس قسم کے لوگ سمجھتے سوچتے اور یاد رکھتے سنتے ہیں۔

جذبات کے تابع عقل

بالکل نہیں۔ ان کی عقل و فکر مفلوج ہو چکی ہوتی ہے۔ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيلًا (۲۳-۲۵/۲۳) یہ انسان نہیں رہتے بلکہ حیوانی سطح پر آجاتے ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گئے۔ دوسرے مقام پر اس کی مزید وضاحت کر دی گئی کہ جو لوگ جذبات کے پیچھے چلتے رہتے ہیں رفتہ رفتہ ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ اُولَئِكَ الَّذِيْنَ اَهُوَآءَهُمْ (۳۲/۱۶) یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر مہریں لگ چکی ہیں اس لئے کہ یہ اپنے جذبات ہی کے پیچھے چلتے رہے۔ یہ صاحب علم و عقل ہوتے ہیں لیکن جس طرح نشے کی حالت میں انسان کی عقل و ہوش کچھ کام نہیں دیتی۔ جذبات سے مغلوب ہو جانے پر علم و بصیرت بیکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اَقْرَعُ يَت غَشْوَةً (۲۳/۲۵) ”کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا معبود بنا لیا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ (خدا کے قانون مکافات کی رو سے) وہ علم و عقل کے باوجود راستہ سے بھٹک گیا اور اس کے کانوں پر اور دل پر مہریں لگ گئیں اور اس کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے“ وہ اقوام سابقہ کی سرگزشت بیان کرنے کے بعد کہتا ہے کہ وہ اس لئے تباہ نہیں ہوئے کہ وہ علم و بصیرت نہیں رکھتی تھیں۔ وہ اس لئے تباہ ہوئے کہ ان کی مفاد پرستیوں کے جذبات نے ان کی غلط روش

مستبصرین کی ہلاکت

کو ان کی نگاہوں میں بڑا خوشنما بنا دیا اور وہ دانش و بینش اور علم و بصیرت کے باوجود ہلاک ہو گئیں۔ وَ عَادَ وَ قَوْمًا كَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ (۲۸/۱۹)

”اور عاد و ثمود (کے انجام پر غور کرو جو) ان کی بستیوں کے کھنڈرات سے واضح طور پر سامنے آجاتا ہے۔ ان کے سرکش جذبات نے ان کے غلط اعمال کو ان کی نگاہوں میں خوشنما بنا کر دکھا دیا اور اس طرح انہیں صحیح راستے کی طرف جانے سے روک دیا اور وہ تباہ ہو گئے حالانکہ وہ علم و بصیرت رکھتے تھے۔ دوسرے مقام پر ہے۔ وَ لَقَدْ مَكَرْتُمْ فَمَا اِنْ يَسْتَكْبِرُونَ (۲۶-۲۷/۲۶) ”ان قوموں کو جیسا غلبہ و تمکُن حاصل تھا ویسا تمہیں بھی حاصل نہیں۔ ان کی آنکھیں سب کچھ دیکھتی تھیں۔ ان کے کان سب کچھ سنتے تھے۔ ان کے دل سب کچھ سمجھتے تھے (وہ دانا و بینا تھیں) لیکن جب انہوں نے اپنے جذبات کے پیچھے لگ کر تو انہیں خداوندی سے انکار اور سرکشی اختیار کی تو ان کی سماعت و بصارت و قلب ان کے کسی کام نہ آسکے۔ اور جس تباہی (تذیر) کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے اس نے انہیں ہر طرف سے گھیر لیا۔“

ان تصریحات سے (بظاہر) ایسا نظر آتا ہے کہ قرآن کی رو سے عقل (جس کا اس نے اتنا بلند مقام بتایا تھا) جذبات کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ اور جذبات انسان کو صحیح راستے کی طرف آنے نہیں دیتے۔ لہذا اس مقام پر انسان بالکل بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ افلاطونی طلسم (ویدانت اور تصوف) نے اس مشکل کا حل یہ بتایا کہ جذبات کو فنا کر دو تاکہ — نہ رہے بانس نہ بچے بانسری — لیکن

جذبات اور قرآن

قرآن اس ذہنیت کو رہبانیت قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ لوگوں کا خود ساختہ نظریہ ہے جسے خدا کی سند حاصل نہیں (۵۷/۲۷)۔ اقول تو اس لئے کہ (وہ جانتا ہے کہ) جذبات کبھی فنا نہیں ہو سکتے۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کر سکتے ہیں کہ انہیں دبا دیں۔ لیکن جذبات کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر انہیں ایک طرف سے دبا دیا جائے تو وہ اپنے اُبھرنے اور نکلنے کے لئے دس راستے خود پیدا کر لیتے ہیں اور یہ راستے ایسے ہلاکت انگیز ہوتے ہیں کہ اس سے انسان کی ذات بے حد ملوث ہو جاتی ہے۔ اور معاشرہ میں فساد برپا ہو جاتا ہے۔ سائیکالوجی کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ جذبات کی PERVERSION سے PEPRESSION پیدا ہو جاتی ہے۔

دوسرے یہ کہ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے کہ جذبات انسان کی تباہی کا موجب ہیں اور ان کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ انہیں فنا کر دیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے ساتھ ایک ایسی چیز پیدا کر دی ہے جو شر ہی شر ہے۔ قرآن کی رو سے خدا کے متعلق یہ تصور باطل اور گمراہ کن ہے۔ خدا بیکسر خیر ہے۔ اور خیر و شر

EVIL ہے۔ اس نے کوئی چیز ایسی نہیں بنائی جو فی ذاتہ شر ہو اور اس کا علاج اس کے فنا کرنے کے سوا کچھ نہ ہو۔ اس نے دنیا میں مختلف قوتیں پیدا کی ہیں۔ تو توں کا استعمال انہیں خیر و شر بنا دیتا ہے۔ اگر تلوار کو ظالم کا ہاتھ دیکھنے کے لئے استعمال کیا جائے تو وہ خیر ہے۔ اگر اسے مظلوم کے گلے پر چلایا جائے تو وہ شر ہے۔ جذبات اپنے اندر بے پناہ قوت رکھتے ہیں۔ اگر اس قوت کو سرکش اور بے لگام چھوڑ دیا جائے تو اس کا نتیجہ تخریب ہوتا ہے۔ اگر اسے صحیح راستے CHANNEE پر ڈال دیا جائے تو وہ تعمیری نتائج پیدا کرتی ہے۔ لہذا کسی شے کا صحیح مصرف میں استعمال ہونا خیر ہے اور غلط مقام پر استعمال (حتیٰ کہ اس کا رائیگاں اور بیکار چلے جانا) شر۔

قرآن کی رو سے جذبات کوئی ایسی چیز نہیں جن سے دُور بھاگا جائے۔ اور انہیں قابلِ نفرت قرار دے کر فنا کر دینے کی فکر کی جائے۔ وہ کہتا ہے کہ جب جذبات سے وحی کی راہ نمائی میں کام لیا جائے تو اس سے تعمیری نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اور اگر وہ اس راہ نمائی سے سرکش اور بیباک ہو جائے تو اس کا نتیجہ ہلاکت اور بربادی ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے فَان لَّمْ یَسْتَجِیْبُوا..... ظَالِمِیْنَ (۲۸/۵۰) ”اگر یہ لوگ تیری بات نہیں سنتے اور ماننے تو (یہ اس لئے نہیں کہ یہ عقل و فکر کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تمہاری بات ماننے کے قابل ہی نہیں)۔ یہ اس لئے ہے کہ یہ لوگ اپنے جذبات کے پیچھے چل رہے ہیں اور اس شخص سے زیادہ گمراہ اور کون ہو سکتا ہے جو خدا کی راہ نمائی کے بغیر اپنے جذبات کے پیچھے چلا جائے۔ یاد رکھو خدا کا قانون ایسے لوگوں کی راہ نمائی نہیں کرتا جو مختلف قوتوں کو ان کے صحیح مقام پر نہ رکھیں۔“

ان تصریحات سے ہمارے سامنے یہ حقیقت آگئی کہ جذبات سے اگر وحی خداوندی کی روشنی میں کام لیا جائے تو اس سے

وہ نتائج مرتب ہوتے ہیں جن کے لئے جذبات کو پیدا کیا گیا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ جذبات میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت نہیں۔ یہ کام عقل کا ہے۔ بالفاظ دیگر جو کچھ قرآن نے کہا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ عقل اگر وحی کی راہ نمائی میں چلے تو اس میں اتنی اوقت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ (جذبات کی لونڈی بننے کے بجائے) جذبات کو اپنے پیچھے چلائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو عقل جذبات سے مغلوب ہو کر ان کا آلہ کار بن جاتی ہے وہ عقل خام اور ناتربیت یافتہ ہے۔ جس عقل کی تربیت وحی کی راہ نمائی میں کی جائے وہ اتنی پختہ ہو جاتی ہے کہ جذبات کے دبانے سے دب نہیں سکتی بلکہ وہ ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام لیتی ہے۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ تنہا عقل جذبات سے مغلوب ہو جاتی ہے لیکن عقل اور وحی دونوں مل کر جذبات پر غالب رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے کھلے الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ جو لوگ وحی کی راہ نمائی میں چلتے ہیں ان پر ”شیطان“ غالب نہیں آسکتا۔ (”شیطان“ سے مراد انسان کے سرکش جذبات اور ان کے تابع چلنے والی عقل ہے)۔

عقل وحی کی روشنی میں

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وحی عقل کو وہ کون سی بات سمجھاتی ہے جس سے اس میں اتنی پختگی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ جذبات کے تابع چلنے کی بجائے انہیں اپنے پیچھے پیچھے چلاتی ہے اور اس طرح تخریب کی بجائے تعمیری نتائج مرتب کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور انتہائی غور و فکر کا محتاج۔ بادی تعمق یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ انسان کی عقل ہمیشہ اُس چیز کو اختیار کرتی ہے جس میں اُسے اپنا فائدہ نظر آئے۔ جو شخص اپنے فائدے کی سوچتا ہے اسے عقلمند کہا جاتا ہے جو اپنا نقصان چاہتا ہے اُسے ہر شخص بے وقوف بلکہ پاگل کہتا ہے۔ لہذا عقل کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے فائدے کی سوچے۔ اور یہ وہ فریضہ ہے جس سے آپ اُسے باز نہیں رکھ سکتے۔

آپ نے یہ بھی اکثر دیکھا ہو گا کہ ایک شخص کوئی کاروبار کرتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ اسے چھوڑ کر کوئی دوسرا کاروبار اختیار کر لیتا ہے۔ دریافت کرنے پر وہ بتاتا ہے کہ یوں تو پہلے کاروبار میں بھی نقصان نہیں تھا لیکن موجودہ کام میں زیادہ فائدہ ہے۔ لہذا انسان کی عقل اس کام کو چھوڑ دیتی ہے جس میں کم فائدہ ہو۔

لیکن ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ عقل ایک کام کو یہ سمجھ کر اختیار کرتی ہے کہ اس میں بہت زیادہ فائدہ ہے لیکن اس میں فائدے کی بجائے نقصان ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ جس بات کو عقل اپنے لئے نفع بخش سمجھے وہ فی الواقع نفع بخش ہو۔

تصریحات بالا سے واضح ہوتا ہے کہ

(i) اگر عقل کو مطمئن کر دیا جائے کہ فلاں باتیں اس کا زیادہ فائدہ ہے تو وہ اس بات کو اختیار کرے گی۔
 (ii) جب وہ کسی معاملہ میں تجربہ کے بعد دیکھ لے کہ کہنے والے کی بات سچی ثابت ہوئی ہے تو وہ اس کے بعد اس کی اور باتوں پر بھی اعتماد کرے گی۔ اور جب تک اس کی کوئی بات نقصان رساں ثابت نہ ہو جائے وہ اس پر اعتماد کرتی جائے گی۔
 ان مبادیات کے بعد آگے بڑھیے۔ ہمارے ہاں ایک مشہور ضرب المثل ہے کہ ”مال صدقہ جان۔ جان صدقہ آبرو“۔
 اس کے معنی یہ ہیں کہ مال بھی اپنی جگہ قیمت رکھتا ہے۔ لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ مال اور جان میں سے ایک ہی چیز بچ سکتی ہو تو انسان کی خاطر مال قربان کر دینا چاہیے۔ ایسے وقت میں جو شخص ایسا کرتا ہے اسے عقلمند کہا جاتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہوتے کہ مال کے مقابلے میں جان کا بچانا از روئے عقل زیادہ نفع رساں ہے۔ اس لئے جب مال اور جان میں TIE پڑے گی تو انسانی عقل مال کو قربان کر کے جان بچالے گی۔

مال صدقہ جان جان صدقہ آبرو

اور اگر کبھی ایسا ہو کہ جان اور آبرو میں TIE آپڑے تو عقلمند وہ ہے جو آبرو کے تحفظ کے لئے جان تک بھی قربان کرے۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ مال، جان اور آبرو میں سے ہر شے اپنی اپنی قیمت رکھتی ہے لیکن ایک تو ان کی قیمتوں میں فرق ہے۔ یعنی مال کی قیمت سے جان کی قیمت زیادہ ہے اور جان کی قیمت سے آبرو کی قیمت زیادہ۔
 دوسرے یہ کہ آبرو اتنی قیمتی متاع ہے کہ اسے کسی چیز کی خاطر قربان نہیں کیا جاسکتا۔
اضافی اور مستقل اقدار لیکن مال اور جان ایسی چیزیں ہیں جنہیں ان سے زیادہ قیمتی شے کے حصول کی خاطر قربان کرنا پڑتا ہے۔ بالفاظ دیگر مال اور جان کی اقدار اضافی RELATIVE VALUES ہیں لیکن آبرو کی قیمت مستقل PERMANENT یا مطلق ABSOLUTE ہے۔

کرنے کا کام یہ ہے کہ عقل کو بتایا جائے کہ زندگی کی فلاں متاع کی قیمت کیا ہے۔ اور وہ کون کون سی چیزیں ہیں جو مستقل اقدار رکھتی ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ جب تک مستقل اقدار کا تعین نہ کیا جائے یہ متعین کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے کہ شے کی حفاظت کے لئے کس شے کو قربان کر دینا ضروری ہے۔ یہی اخلاقیات ETHICS کی بنیاد ہے۔

گذشتہ ابواب میں ہم نے یہ بتایا ہے کہ دین وہ طریق زندگی بتاتا ہے جس پر چل کر کاروان انسانیت اپنی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔ یا وہ ضابطہ حیات دیتا ہے جس کی رو سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ اب ہم اس تمام تک پہنچ گئے ہیں جہاں

دین مختلف اقدار کا تعین کرتا ہے

متعین طور پر کہا جاسکتا ہے کہ دین ہمیں کیا دیتا ہے؟ ایک فقرے میں یہ کہ دین مختلف اقدار کا تعین کرتا ہے۔

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ زندگی کا ایک تصور یہ ہے کہ انسان عبارت ہے اپنے طبعی جسم سے۔ جسم کے تقاضوں کی تسکین مدعاے حیات ہے۔ اور یہ سب طبعی قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تصور زندگی کے مطابق اقدار کا تعین بھی طبعی نقطہ نگاہ سے ہوگا۔ اس کے لئے نہ کسی خارجی راہ نمائی کی ضرورت ہے نہ ماورائے عقل کسی سرچشمہ علم کی احتیاج۔ انسان کے طبعی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ان تقاضوں میں جسم کی پرورش کے ساتھ جذباتی حفظان و لذائذ بھی شامل ہیں) کس کس چیز کی ضرورت ہے۔ ان چیزوں میں کون سی زیادہ اہم اور قیمتی ہے اور کون سی کم۔ جب دو چیزوں میں تصادف ہو تو ان میں سے کسے اختیار کرنا چاہیے اور کسے چھوڑ دینا چاہیے۔ یہ سب کچھ انسانی عقل و تجربہ کی رُو سے متعین کیا جاسکتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ جب مال اور جان میں INSTINCT پر جانے تو جان کی حفاظت کے لئے مال کو قربان کر دینا چاہیے۔ اس کے لئے وحی کی راہ نمائی کی ضرورت نہیں۔ جان کی حفاظت انسان (بلکہ تمام حیوانات) کی جبلت INSTINCT کا تقاضا ہے جس کی تصدیق اس کی عقل اور تجربہ مشاہدہ اور مطالعہ کرتے ہیں۔

لیکن (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے) دوسرا تصور زندگی یہ ہے کہ انسان محض جسم انسانی کا نام نہیں۔ جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات یا خودی کہتے ہیں۔ جس طرح جسم کے تقاضے ہیں اسی طرح اس کی ذات کے بھی تقاضے ہیں۔ جس طرح جسم کی نشوونما ہوتی ہے اسی طرح اس کی ذات کی بھی نشوونما ہوتی ہے۔ جس طرح جسم کی نشوونما کے لئے قوانین مقرر ہیں اسی طرح اس کی ذات کی نشوونما کے لئے بھی قوانین مقرر ہیں۔

واضح رہے کہ (جیسا کہ ہم پہلے باب میں بیان کر چکے ہیں) انسان ایک وحدت ہے جس کے مظہر جسم اور ذات دونوں ہیں۔ اس لئے (قرآنی نقطہ نگاہ سے) انسانی جسم اور اس کی ذات دو متخاضم اور متناقض "عناصر" نہیں جو ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتے ہیں۔ نہ ان میں سے ایک شہ ہے اور دوسرا خیر۔ انسان عبارت ہے ان دونوں سے اور دونوں کی پرورش اور نشوونما ضروری ہے۔ لیکن جس طرح جسم سے متعلق اقدار میں فرق ہوتا ہے۔ کوئی قدر زیادہ اہم ہوتی ہے کوئی کم۔ اور دو اقدار کے تصادم کی صورت میں کم قدر کو زیادہ قیمتی قدر کی خاطر چھوڑ دینا پڑتا ہے اسی طرح جب جسم سے متعلق کسی قدر اور ذات سے متعلق قدر میں باہمی تضاد ہو تو چونکہ انسانی ذات جسم کے مقابلے میں زیادہ قیمتی ہے۔

اس لئے جسم سے متعلق قدر کو ذات سے متعلق قدر کی خاطر چھوڑ دینا ہوتا ہے۔ (جیسے جان اور آبرو کے تصادم کے وقت آبرو کے تحفظ کے لئے جان کو قربان کر دینا چاہیے) جو اقدار انسانی ذات کو نشوونما دے کر حیات جاوید کا مستحق بنا دیتی ہیں وہ ان تمام اقدار سے افضل اور گراں بہا ہیں جن کا تعلق محض جسم کی حفاظت اور نشوونما

قرآنی نظام اخلاق

سے ہے۔ یہ وہ بنیاد ہے جس پر قرآنی نظام اخلاق کی عمارت استوار ہوتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا ان مستقل اقدار کا تعین عقل انسانی کی رُو سے کیا جاسکتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ چیز عقل کے
مستقل اقدار صرف وحی دے سکتی ہے | بس کی بات نہیں۔ اس کا تعین وحی کی رُو سے ہی کیا جاسکتا
 ہے۔ قرآن کا یہ فیصلہ ایسا ہے جس کی تائید اب مغرب کے

مفکرین اور ماہرین علم الاخلاق کی طرف سے بھی ہو رہی ہے۔ مثلاً مارٹن بوبر MARTIN BUBER لکھتا ہے۔
 مستقل اقدار کے یہ معنی نہیں کہ ہر شخص خود فیصد کرے کہ مستقل قدر کیا ہے۔ ڈان جون کے نزدیک زیادہ سے
 زیادہ عورتوں کا اپنے دام فریب میں فریب میں لے آنا مستقل قدر ہے۔ اور ایک ڈکٹیٹر کے نزدیک قوت کا
 حصول مستقل قدر۔ مستقل اقدار کو عالمگیر ہونا چاہیے جسے ہر شخص متعلقہ تسلیم کرے اور ان کا معترف ہو۔

BETWEEN MAN AND MAN

راشدل HASTINGS RASHDALL اپنی کتاب (THE THEORY OF GOOD AND EVIL) میں
 لکھتا ہے۔

اخلاقیات سے مفہوم ہی یہ ہے کہ دنیا میں اقدار کے لئے ایک مطلق معیار ہے جو ہر انسان کے لئے یکساں ہے
 (صفحہ ۲۸۶)

اس حقیقت کو اس نے دوسرے مقام پر زیادہ وضاحت سے لکھا ہے جہاں کہا ہے کہ
 ہم یہ کہتے ہیں کہ قانون اخلاق اپنا حقیقی وجود رکھتا ہے اور اخلاقیات مطلق ہیں یعنی کوئی ایسی شے ضرور ہے
 جسے ہم اخلاقی فیصلوں میں حق مطلق یا باطل مطلق کہہ سکتے ہیں۔ خواہ ہم یا کہنے ہی اور انسان انہیں ایسا نہ
 مانیں۔ اخلاقیات سے ہمارا جو مفہوم ہے اس کی بنیاد اسی عقیدہ پر ہے۔ اس قسم کے غیر مشروط موجود فی الخار
 ج مطلق۔ اخلاقی قوانین بطور ایک نفسیاتی حقیقت تو ضرور موجود ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اس قسم کا قانون
 گا کہاں سے۔ یہ قانون کسی انسانی شعور میں تو ملنے سے رہا۔ انسان اخلاقی مسائل کے متعلق الگ الگ نگاہ
 رکھتا ہے۔ اور اس امر کی ہمارے پاس کوئی خارجی دلیل نہیں کہ دنیا کے تمام انسان بھی اخلاقیات میں ایک
 نگاہ رکھتے ہیں۔ (صفحہ ۲۱۱)

یہاں تک اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ اخلاق کا معیار مستقل اور مطلق اقدار پر ہے۔ اور مطلق اقدار کو انسانی ذہن
 پیدا نہیں کر سکتا اس کے بعد راشدل لکھتا ہے۔

ایک مطلق اخلاقی قانون یا اخلاقی نصب العین کسی مادی شے کے اندر موجود ہو ہی نہیں سکتا۔ نہ ہی کسی انسان کے ذہن میں موجود ہو سکتا ہے۔ ایک اخلاقی قانون صرف کسی MIND کے اندر مل سکتا ہے۔ اور مطلق اخلاقی قانون صرف اُس MIND کے اندر مل سکتا ہے جو حقیقت کا سرچشمہ ہو۔ اسی کو خدا کہتے ہیں۔

(صفحہ ۲۱۲)

وحی کے متعلق ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ نبی کو خارج سے ملتی ہے۔ اس کے قلب کی گہرائیوں سے نہیں ابھرتی یعنی اس میں OBJECTIVITY ہوتی ہے۔ اسے قرآن نے "نزد" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ راشڈل لکھتا ہے کہ اخلاقی پابندیوں سے مراد وہ ضابطہ اخلاق ہے جو انسان کو خارج سے عطا ہو..... یہ عقیدہ درحقیقت خدا پر ایمان کے مترادف ہے۔ (صفحہ ۲۱۳)

H.N. WIEMAN کے نزدیک خدا کی DEFINITION یہی ہے کہ وہ کارگرِ فطرت میں اتوار کا سرچشمہ ہے۔

برگساں اس باب میں لکھتا ہے۔

انسان تنہا عقل کی روشنی میں صحیح راہ پر چل ہی نہیں سکتا..... عقل ایک خاص مقصد کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ جب ہم اسے اس مقصد سے بلند مقاصد کی طرف لے جانا چاہیں تو وہ اس بلند سطح کے متعلق ممکنات کا سراغ دے سکے تو دے سکے وہ حقیقت کا پتہ کسی صورت میں بھی نہیں دے سکتی۔

نظریہ اضافیت کے مفکر پروفیسر آن سٹائن نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام ہی OUT OF MY LATER DAYS ہے۔ وہ اس کتاب میں لکھتا ہے۔

سائنس ہمیں صرف یہ بتا سکتی ہے کہ "کیا ہے" وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ "کیا ہونا چاہیے"۔ اس لئے اقدار کی قیمت مقرر کرنا اس کے دائرے سے باہر ہے۔ اس کے برعکس مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ انسانی فکر و عمل کی قیمت مقرر کرے..... یہ اقدار تجربات کے بعد وضع نہیں کی جاتیں۔ یہ مقدّمہستیوں کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتی ہیں۔ ان کی بنیادیں عقل پر نہیں ہوتیں لیکن وہ تجربہ کی کسوٹی پر پوری اُترتی ہیں۔ اس لئے کہ صداقت کہتے ہی اسے میں جو تجربے سے درست ثابت ہو۔ (صفحہ ۱۱۲۳ و ۱۱۲۴) ۲۵

یہ اقدار وحی کے ذریعہ مل سکتی ہیں جس کی خصوصیات پروفیسر جوڈ کے نزدیک یہ ہوتی ہے کہ یہ اپنی سند آپ ہوتی ہے اس کے لئے ہم کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ یہ استدلالی طریق کا نتیجہ نہیں

ہوتی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم بعد میں وحی کی تائید میں عقلی دلائل پیش کر دیں۔ لیکن جس طریق سے وحی حاصل ہوتی ہے وہ استدلالی نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم جن علوم کو استدلالی کہتے ہیں ان کی اصل دنیا دہی بھی غیر استدلالی ہوتی ہے۔ مثلاً علم ریاضی کے بنیادی اصول۔

پروفیسر CASSIRER اپنی شہرہ آفاق کتاب AN ESSAY ON MAN میں لکھتا ہے:-

یہ حقیقت کہ دنیا میں عقل بڑی مبہم چیز ہے اور اس کے فیصلے کو نہی تسلیم کر لینے کے قابل نہیں ہو سکتے، انسان کو کبھی معلوم نہ ہو سکتی اگر اس کی طرف وحی کی روشنی نہ آتی۔ وحی نے ہی آکر اسے اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ عقل اس قابل ہی نہیں کہ وہ صداقت و حکمت کی طرف راہ نمائی کر سکے۔ اس لئے کہ وہ خود اپنے مفہوم و مطلق کے اعتبار سے مبہم ہوتی ہے۔ (صفحہ ۹)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ مطلق یا مستقل اقدار کا سرچشمہ علم خداوندی ہے اور ان کے حصول کا ذریعہ وحی۔ اب ایک قدم اور آگے بڑھیے۔ جو ضرب المثل ہمارے سامنے آچکی ہے (یعنی مال صدقہ، جان صدقہ، آبرو)۔ اس میں اس بات کو تو ہر شخص سمجھ لے گا کہ جان بچانے کی خاطر مال خرچ کر دینا چاہیے اس لئے کہ جان کا تعلق انسان کے جسم سے ہے۔ اسے ہر شخص محسوس کرتا ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ جان کے ضائع ہو جانے سے کیا نقصان ہوتا ہے۔ لیکن اس کا احساس ہر شخص نہیں کر سکتا کہ آبرو کے ضائع ہو جانے سے کیا نقصان ہوتا ہے۔ اس سے انسان کا کوئی مادی نقصان تو ہوتا نہیں اس نقصان کا تعلق کسی ایسی شے سے ہے جو غیر مادی ہے۔ اور یہ چیز انسان کی ذات PERSONALITY ہے۔ اگر کوئی شخص انسان کی ذات کو نہیں مانتا تو اس کے نزدیک آبرو کے ضائع ہو جانے سے کچھ نقصان نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ

آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس سے معاشرہ (سوسائٹی) میں بدنامی ہو جاتی ہے۔ لیکن بدنامی اُس معاشرے میں ہوتی

مستقل اقدار کا اثر انسانی ذات پر پڑتا ہے

ہے جو آبرو کو قیمتی متاع سمجھے۔ جس سوسائٹی میں آبرو کو قیمتی متاع نہ سمجھا جائے اس میں آبرو کے ضائع ہو جانے پر بدنامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (مثال کے طور پر) ہمارے ہاں اگر (بد قسمتی سے) کسی غیر شادی شدہ لڑکی کو حمل قرار پاجائے تو یہ چیز اس کے لئے اس قدر بدنامی کا باعث ہو جاتی ہے کہ وہ اس کی بجائے مرجانے کو ترجیح دے دیتی ہے لیکن یورپ میں اس قسم کا حمل معیوب قرار نہیں دیا جاتا۔ اس لئے وہاں بدنامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس سے یہ واضح ہے کہ مستقل اقدار وہ ہیں جن کا نفع اور نقصان (اصلاً اور اساساً) انسانی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ اس لئے مستقل یا مطلق اقدار کے لئے انسانی ذات کے وجود کو تسلیم کرنا ضروری اور اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کا تسلیم کرنا

بھی ضروری ہے کہ ان اقدار کے ضائع کر دینے سے (اگرچہ انسانی جسم کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا لیکن اس سے) انسانی ذات کو نقصان پہنچتا ہے۔ بالفاظ دیگر اسے ماننا ضروری ہے کہ انسان کے ہر عمل کا نتیجہ مرتب ہو کر رہتا ہے۔ اس کا کوئی عمل بلا نتیجہ نہیں رہ سکتا۔ اسے قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ جن اعمال سے انسانی ذات کو فائدہ پہنچتا ہے وہ اس کی نشوونما

DEVELOPMENT میں مدد و معاون ہوتے ہیں۔ اور جب انسانی ذات نشوونما پالیتی ہے تو وہ حیاتِ جاوید حاصل کر لیتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان کی طبعی موت کے بعد بھی حیات کا تسلسل تسلیم کیا جائے (اسے آخرت پر ایمان لانا کہتے ہیں)۔ بالفاظ دیگر اس کے لئے

ایمانیات کی ضرورت

(۱) خدا پر ایمان

(۲) انسانی ذات پر ایمان۔

(۳) زندگی کے تسلسل (آخرت) پر ایمان۔

(۴) قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان۔

(۵) اور اس بات پر ایمان کہ سلسلہ کائنات اور خود انسان کی تخلیق ایک خاص پروگرام کے مطابق بالمقصد ہوئی

ہے، ضروری ہے۔

دیکھئے اس باب میں مغربی مفکر کیا کہتے ہیں۔ راشڈل لکھتا ہے۔

اس مقصد کے لئے یہ ضروری ہے کہ کائنات کا کوئی مقصد ہو اور وہ مقصد حکمت پر مبنی ہو۔ (ایضاً صفحہ ۲۱۹)

دوسرے مقام پر وہ کہتا ہے کہ اس کے لئے یہ ماننا بھی ضروری ہے کہ

(i) انسانی ذات ایک مستقل حقیقت ہے۔

(ii) ذات کا سرچشمہ مادی نہیں روحانی ہے۔ یعنی اس کی زندگی مستقل ہے اور انسانی جسم کے تغیرات سے اس

میں تبدیلیاں نہیں ہوتیں۔

(iii) انسانی اعمال کا سرچشمہ اس کی ذات ہے۔ جس قسم کے اس کے اعمال ہوں گے اسی کیفیت کی اس کی

ذات سمجھی جائے گی۔ (صفحہ ۲۰۵، ایضاً)

نیز اس کے لئے

انسان کی حیات بعد المات یعنی حیاتِ جاویداں پر ایمان بھی ضروری ہے۔ (ایضاً صفحہ ۲۱۵)

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے دیکھئے کہ قرآن اسے دو آیات میں کس حین ایجاز سے بیان کرتا ہے۔ سورۃ جاثیہ میں ہے۔ وَخَلَقَ اللَّهُ

السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ بِالْحَقِّ (۲۵/۲۲) خدا نے اس سلسلہ کائنات (ارض وسموات) کو ایک مقصد کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ یونہی رائیگاں جانے کے لئے نہیں بنا یا۔ وَ لِيُخْزِيَ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُونَ اور اس لئے کہ ہر شخص کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب ہو جائے۔ اور اس میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ ہو۔ اس کے بعد ہے اَفَرَأَيْتَ مَنِ اخْتَدَا إِلَهًا هَوَاهُ "تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا معبود بنا لیا کہ جو ان کا تقاضا ہو اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ انہی کے پیچھے چلنے لگ جائے۔ جب انسان کی کیفیت یہ ہو جائے تو اس کی عقل و فکر وہ کام قطعاً نہیں دیتی جس کے لئے انہیں انسان کو دیا گیا تھا۔ اس میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی وَ أَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَى عِلْمٍ..... غَشَوَةً (۲۵/۲۳) "ایسا شخص علم و بصیرت کے باوجود غلط راستے پر چلتا ہے۔ اس کے کانوں اور دل پر مہر لگ جاتی ہے۔ اس کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ فَمَنْ يَهْدِيهِ مِنْ بَعْدِ اللَّهِ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ" ایسا شخص صرف اسی صورت میں صحیح راستے کی طرف آسکتا ہے کہ وہ اپنے جذبات کی پرستش چھوڑ کر قوانین خداوندی کا اتباع کرے۔ (اے رسول!) تم ان مخاطبین سے پوچھو کہ کیا تم نے اس سے کوئی سبق حاصل کیا؟

جذبات کے پیچھے چلنے والے لوگ وہ ہیں جو انسانی زندگی کو محض طبعی زندگی سمجھ رہے ہیں۔ اور انسانی ذات اور اس کی حیات بعد الممات پر یقین نہیں رکھتے۔ وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَ نَحْيَا وَ مَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ (۲۵/۲۴) "یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ انسان پیدا ہوتا ہے پھر مرد و زمانہ اس کے قوی کو مضعف کر دیتا ہے اور آخر الامر انسان مر کر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ ہے ان لوگوں کا تصور انسانی زندگی کے متعلق۔ وَ مَا لَهُمْ بِذَلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ (۲۵/۲۴) "لیکن ان کا یہ عقیدہ علم پر مبنی نہیں۔ محض قیاسات پر مبنی ہے۔ علم کی بارگاہ سے یہی فتویٰ ملے گا کہ انسان کے اندر یقیناً ایک شے ایسی بھی ہے جو اس کی موت کے ساتھ فنا نہیں ہو جاتی۔ اس میں باقی رہتا اور آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے۔

دوسرے مقام پر ہے فَأَعْرِضْ عَنْ... بِمَنْ أَهْتَدَى (۵۳/۳۰-۲۹) جو شخص ہمارے قوانین سے چلو تھی کرتا ہے تم اس سے اعراض بر تو۔ اس لئے کہ اس شخص کے سامنے صرف اس کی طبعی زندگی کے مفاد ہیں۔ وہ زندگی کے نسل اور ذات انسانی کی جاودانی کا قائل ہی نہیں۔ ان کا مبلغ علم بھی طبعی قوانین (PHYSICAL LAWS) تک محدود ہے۔ قرآن کریم نے ان مقامات پر واضح کر دیا کہ مستقل اقدار پر وہی شخص ایمان لا سکتا ہے جو زندگی کو طبعی زندگی ہی سمجھے بلکہ انسانی ذات، قانون مکافات عمل اور حیات بعد الممات کا قائل ہو۔ جو ان حقائق پر یقین نہ رکھے اس کے لئے نہ خدا

مستقل اقدار پر کون ایمان لا سکتا ہے؟

پرایمان لانا کوئی معنی رکھتا ہے۔ نہ ہی وہ کسی ضابطہ اخلاق (MORALITY) کا قائل ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ اخلاقی ضابطہ مستقل اقدار ہی کا دوسرا نام ہے۔ اور مستقل اقدار پر وہی یقین رکھ سکتا ہے جو انسانی ذات، قانونِ مکافات اور تسلسلِ حیات کا قائل ہو۔

جب انسانی عقل و بصیرت اس طرح مستقل اقدار کو تسلیم کر لے تو وہ جذبات کے پیچھے چلنے کے بجائے جذبات کو اپنے پیچھے چلاتی ہے۔ اور خود وحیِ خداوندی کی روشنی میں چلتی ہے۔ اسی کو اقبال عقلِ خود ہیں کے مقابلے میں عقلِ جہاں میں یا "خراب خوردہ دل" سے تعبیر کرتا ہے۔ وحی اور عقل کے اس امتزاج کو قرآن مومنین کی خصوصیت بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اِنَّ رِفْتْ خَلْقِ... هَذَا بِالْاِطْلَاقِ (۱۸۹۶-۱۹۰۳) "یقیناً کائنات کی بلندیوں اور پستیوں کی تخلیق اور ریل و ہنار کی گردش میں صاحبانِ عقل و بصیرت کے لئے حقیقت تک پہنچنے کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ یعنی ان اربابِ بصیرت کے لئے جو کھڑے بیٹھے، ایلٹے قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں اور یوں تخلیقِ ارض و سموات پر غور و فکر کر کے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ان کے نشوونما دینے والے نے اس کا رگہ کائنات کو نہ تو بیکار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج مرتب کرنے کے لئے" یہی وہ اربابِ بصیرت ہیں جن کے متعلق وہ کہتا ہے کہ فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا اُولِيْ الِاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَفْلَحُوْنَ (۵۱/۱۰۰) "اے اربابِ بصیرت تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو تاکہ تمہاری کھیتیاں پروان چڑھیں" ابھی کو وہ صاحبِ ایمان قرار دیتا ہے جب کہتا ہے فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا اُولِيْ الِاَلْبَابِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (۶۵/۱۰) "اے اربابِ بصیرت جو ان حقائق پر ایمان رکھتے ہو قوانینِ خداوندی کی

انگہداشت کرو" یعنی قرآن کی رُو سے مومن اور متقی اربابِ بصیرت ہی ایمان اور علم و بصیرت ساتھ ساتھ ہو سکتے ہیں۔ دوسری جگہ کہا ہے کہ قَالَ الَّذِيْنَ اٰوْتُوْا الْعِلْمَ وَاذْكُرْ الَّذِيْنَ لَمْ يَلْمِزْكَ

ایمان اور علم و بصیرت ساتھ ساتھ

اَلِاِيْمَانَ (۳۰/۵۶) "جن لوگوں کو علم اور ایمان دیا گیا ہے وہ یہ کہتے ہیں: یعنی ایمان اور علم و بصیرت لازم و ملزوم ہیں علم کے بغیر انسان ایمان تک پہنچ نہیں سکتا یقین اسی کا یقین ہے جس نے اے علیٰ وجہِ البصیرت حاصل کیا ہو۔ لاک (LOCKE) کا یہ قول اربابِ علم و فکر میں عام طور پر زبان زد ہے کہ

جو شخص وحی کے لئے جگہ بنانے کی خاطر عقل و بصیرت کو باہر نکال دیتا ہے وہ وحی اور عقل دونوں کے چراغ

(ESSAYS BOOK, IV)

گل کر دیتا ہے۔

لیکن آپ دیکھئے کہ قرآن کریم نے لاک سے کتنی صدیوں پہلے اس حقیقت کو بیان کر دیا تھا کہ علم اور ایمان (وحی اور عقل) ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے۔ ایمان وہی ایمان ہے جس کی تائید علم و بصیرت کرے۔ اس طرح ایمان لانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے جذبات ان کے اپنے ارادوں کے تابع چلتے ہیں۔ اگر کبھی ایسا ہو کہ کوئی غلط خیال گھومتے پھرتے ان کے قریب آجائے تو وہ فوراً قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے لاتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں کہ صحیح راستہ

کون سا ہے۔ جو نہی قانونِ خداوندی ان کے سامنے آتا ہے، تمام تاریکیاں یک لخت پھٹ جاتی ہیں اور صحیح راستہ ابھر کر ان کے سامنے آجاتا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا.... مُبْصِرُوْنَ (۷/۲۰۱) جو لوگ تو ان میں خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں۔ جب کوئی غلط خیال یا سرکش جذبہ یونہی پھرتے پھرتے ان کے قریب آجاتا ہے تو وہ فوراً قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے لاتے ہیں۔ جو نہی وحی کی روشنی ان کے سامنے آتی ہے ساری فضا جگمگا اٹھتی ہے اور وہ اس کی روشنی میں فوراً فیصلہ کر لیتے ہیں کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔

یہ ہے قرآن کا وہ طریق جس سے وہ عقل کو مستقل اقدار کی محکمت منواتا ہے اور جب اس طرح عقل ان حقائق کو تسلیم کر لیتی ہے تو وحی کی روشنی میں اس کا یہ قدم صحیح راستے کی طرف اٹھتا ہے اور انسانی جذبات اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ وحی، عقل اور جذبات کے اس حسین امتزاج کا نام اسلامی بیچ زندگی ہے۔ اس میں ہر فرد ذہن کے کامل یقین اور دل کے پورے اطمینان کے ساتھ اپنا جان و مال خدا کے ہاتھوں بیچ دیتا ہے (۹/۱۱۱) اور اس کی عقل اس کے اس سودے پر اسے مبارکباد دیتی ہے (۹/۱۱۱) اس لئے کہ اس نے علیٰ وجہ البصیرت اپنا اطمینان کر لیا ہوتا ہے کہ وہ مستقل اقدار جو وحی کے ذریعے سے متعین ہوئی ہیں ان کے اتباع میں نفع ہی نفع ہے۔ نقصان کا شائبہ تک نہیں۔ وَقِيلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَا ذَا آآ نَزَّلْنَا بِكُمْ قَانُوْا اٰمِنِيْنَ (۱۶/۲۰) ”متقیوں سے پوچھا جاتا ہے کہ تمہارے رب نے کیا نازل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ایسی چیز جو خیر ہی خیر ہے جس میں شر کا گزرتا ہے نہیں۔“ جب عقل ان اقدار کی حقیقت اور قیمت کو سمجھ لیتی ہے تو وہ ان ہلاکت انگیزوں کی طرف جانے کی بجائے جن کی طرف سرکش جذبات بلاتے ہیں، وحی کی اس آواز کے پیچھے لگتی ہے جو اس کے لئے فی الحقیقت نفع بخش ہوئی ہے۔ اس لئے کہ عقل کا تقاضا ہی اس طرف رُخ کرنا ہے جو اسے نفع بخش دکھائی دے۔

حاصل بحث (۱) عقل انسانی کی حیثیت ایک قوت کی سی ہے جسے جس طرح استعمال کیا جائے گا اسی طرح اس کے نتائج مرتب ہوں گے۔

(۲) جب انسانی عقل (جذبات سے الگ ہٹ کر) خارجی کائنات کے روز و اسرار کی تحقیق و تفتیش کرتی ہے تو وہ اپنے تجرباتی طریق سے صحیح نتیجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ اسے سائنسک طریق تحقیق کہا جاتا ہے، قرآن کریم اس طریق کی اہمیت پر بڑا زور دیتا ہے کیونکہ اس سے فطرت کی قوتیں مسخر ہوتی ہیں اور تسخیرِ فطرت ہی سے انسان مقامِ آدم تک پہنچتا ہے۔

(۳) لیکن انسانوں کے باہمی معاملات میں یہی عقل جب جذبات کے تابع چلتی ہے (یعنی جب اس قوت کو انسان کے

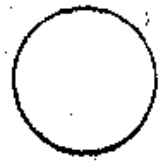
جذبات استعمال کرنے لگ جاتے ہیں) تو دنیا میں عقول کی جنگ شروع ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ یَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَيُفْسِدُ فِي الْأَرْضِ — خونریزیاں اور فساد انگیزیاں ہوتا ہے۔ اسی کا نام قرآن کی اصطلاح میں 'اتباع شیطان ہے۔

(۴) جذبات، انسانی عمل کے محرک ہوتے ہیں اس لئے یہ بھی انسان کی بڑی متاع اور عظیم قوت ہیں۔ لیکن یہ قوت اسی صورت میں تعمیری نتائج پیدا کر سکتی ہے جب اسے عقل پر غالب نہ آنے دیا جائے۔

(۵) اس کا طریقہ یہ ہے کہ عقل کو ان مستقل اقدار کا محافظ بنا دیا جائے جو انسان کو وحی کی رُو سے ملتی ہیں۔ جب انسان جذبات سے الگ ہو کر علم و بصیرت کی رُو سے غور و فکر کرے تو ان اقدار کی اہمیت اُبھر کر سامنے آ جاتی ہے اور یوں اس کی عقل، ان کی حفاظت اور نگہداشت کو اپنا فریضہ قرار دے لیتی ہے۔ عقل، انسانی کا اس طرح 'مستقل اقدار کی اہمیت کا قائل ہو جانا، ایمان کہلاتا ہے۔

(۶) یوں انسان کے جذبات اور اس کی عقل (دونوں عظیم قوتیں) ایمان کے متعین کردہ نصب العین کے حصول کا ذریعہ بن جاتے ہیں، اور اس طرح فطرت کی قوتیں، انسانیت کی تباہی کی بجائے اس کی تعمیر اور تہذیب کا موجب بنتی چلی جاتی ہیں۔ یہ مقام مومن ہے۔ یعنی اپنے جذبات کو عقل کے تابع اور عقل کو وحی کے ماتحت رکھنے والا انسان۔ اس طریق عمل سے اس کی ذات مناسب نشوونما حاصل کر کے زندگی کی ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ یہی قرآن کا منشاء ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ دین کی عمارت "مستقل اقدار" کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ ان اقدار کا تفصیلی بیان آئندہ ایک باب میں ملے گا۔



”قانون کی کارفرمائی“

ہم پہلے باب میں دیکھ چکے ہیں کہ خدا کا ایک تصور وہ ہے جسے ذہن انسانی نے تراشا تھا اور دوسرا وہ جسے وحی کے ذریعہ خود خدا نے دیا۔ انسانی ذہن کا تراشیدہ خدا، انسان کے اُس دور کی یادگار ہے جب اس کا شعور ناپختہ UN-DEVELOPED اور اس کی فکر عہد طفولیت میں تھی۔ اُس زمانے کے انسان کے سامنے سب سے بڑی صاحبِ اقتدار ہستی راجہ، حاکم یا بادشاہ کی ہوتی تھی۔ اس لئے اس نے خدا کو بھی بادشاہ کے قالب میں ڈھال دیا۔ وہ خدا کے متعلق اُس کے سوا کچھ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے بادشاہوں کے متعلق دیکھا کہ وہ کسی قاعدے اور قانون کے پابند نہیں ہوتے۔ وہ جو جی میں آئے حکم دے دیں، ہر ایک کو اس کی اطاعت کرنی پڑتی ہے۔ ان سے کوئی اتنا بھی نہیں پوچھ سکتا کہ اس حکم کی مصلحت اور غایت کیا ہے۔ اگر کوئی ان سے ایسی بات پوچھنے کی جرأت بھی کر لے اور وہ اس (MOOD) میں ہوں کہ اس کا جواب دے دیا جائے، تو ان کا جواب بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوگا کہ یہ ہماری مرضی ہے۔ ہم ایسا چاہتے ہیں۔ یہی وہ ”مزاج شاہاں“ ہے جن کے متعلق (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) سعدی کہتا ہے کہ ”گا ہے بہ سلائے برنجند و گلہے بہ دشنامے خلعت بہ بنشد۔“ کبھی ان کی کیفیت ہوتی ہے کہ کوئی سلام کرے تو اس سے بگڑ جائیں اور کبھی یہ عالم کہ کوئی گالی دے تو اسے جاگیر بخش دیں۔ ظاہر ہے کہ جب خدا کو اس شکل میں ڈھالا جائے اور اس کے ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی ہو کہ (بادشاہ کے مقابلہ میں) خدا کے اختیارات لامحدود ہوتے ہیں تو ایسا خدا آمر مطلق (DIRECTOR) ہوگا۔ اس کے متعلق یہ تصور کرنا بھی گستاخی (اور خدا، آمر مطلق) خدا کے لئے وجہ تذلیل سمجھا جائے گا کہ وہ کسی قاعدے اور ضابطے کا پابند ہے۔ کہا یہ جائے گا کہ وہ خدا کیا ہوا جو کسی قاعدے کا پابند ہو۔ پابندیوں میں گھرے ہوئے ہونا، شان خداوندی کے خلاف ہے۔ وہ خود حاکم مطلق ہے اور اس کے اوپر کوئی اور حاکم نہیں وہ کسی قاعدے اور قانون کا پابند کیسے ہو سکتا ہے اس کا ہر حکم قانون اور ہر اشارہ قاعدہ

ہوگا۔ وہ جو جی میں آئے کرے اور جو چاہے حکم دے۔ وہ جسے چاہے تباہ و برباد کرے اور جسے چاہے انعام و اکرام بخش دے۔ جو اس کی خوشنودی حاصل کر لے اسے سب کچھ مل جائے، جس سے وہ ناراض ہو جائے وہ کہیں کا نہ ہے۔ خدا کے متعلق اس تصور کا فطری اور منطقی نتیجہ یہ بھی تھا کہ انسان ہر وقت خدا سے ڈرتا رہے کہ معلوم وہ کب ناراض ہو جائے اور تباہ و برباد کر ڈالے۔

اس تصور کا دوسرا نتیجہ یہ تھا کہ (جس طرح بادشاہوں کی خوشنودی مزاج حاصل کرنے کے لئے مختلف طریقے اور ذریعے اختیار کئے جاتے ہیں) خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے (بھی) کچھ ایسے ہی طریقے وضع کئے جائیں اور اسی قسم کے ذرائع اختیار کئے جائیں۔ بادشاہوں کو خوش کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے حضور قہیدے پڑھے جائیں۔ ان کی مدح و ستائش کے گیت گائے جائیں۔ ان کی بارگاہ میں نذرانے پیش کئے جائیں۔ اگر ان حربوں سے بھی کام نہ چلے تو (امرار و دزرار میں سے) جو لوگ ان کے مقرب ہوں ان کے ذریعے ان تک سفارش پہنچائی جائے اور اس طرح اپنا کام نکلوا لیا جائے۔

آپ تاریخ انسانیت پر غور کیجئے۔ ذہن انسانی نے خدا کا جو تصور وضع کیا تھا اس میں خدا کی کیفیت ایسی ہی تھی اور یہی وہ تصور تھا جو نزولِ قرآن کے وقت ساری دنیا میں رائج تھا۔ ہم نے اوپر کہا ہے کہ خدا کا جو تصور وحی کی رو سے (بوطا انبیائے کرام) ملا تھا وہ اس تصور سے مختلف تھا۔ لیکن خدا کی طرف سے جو وحی (مختلف اوقات میں) مختلف اقوام کی طرف آتی رہی نزولِ قرآن کے وقت وہ اپنی اصلی (اور غیر منترہ) شکل میں کہیں موجود نہ تھی۔ اس لئے ان اقوام کے پاس بھی (جو آسمانی ہدایت کی حامل ہونے کی مدعی تھیں) خدا کا تصور اسی قسم کا تھا جو ذہن انسانی نے تراشا تھا۔

قرآن آیا اور اس نے خدا کے متعلق ذہن انسانی کے تراشیدہ تصور کی ہر گوشے سے تردید کی اور اس کی جگہ خدا کا صحیح

تصور پیش کیا۔ خدا کا یہی وہ (صحیح) تصور ہے جس پر دین کی ساری عمارت استوار ہے اور جس سے انسانی زندگی کا ہر گوشہ متاثر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ”خدا پر ایمان“ کو خشتِ اول قرار دیا،

اور اس تصور کے صحیح یا غلط ہونے کو کفر اور ایمان کا معیار ٹھہرایا ہے۔ بالفاظِ دیگر اگر کوئی شخص خدا کا وہ تصور رکھتا ہے جسے قرآن نے پیش کیا ہے تو قرآن اُسے مومن (خدا کو ماننے والا) قرار دیتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کسی شخص کا خدا کا وہ تصور نہیں جسے قرآن پیش کرتا ہے تو قرآن کی رو سے وہ مومن (خدا کو ماننے والا) قرار نہیں دیا جائے گا، خواہ وہ بزعمِ خویش اپنے آپ کو خدا کا پرتا ہی کیوں نہ سمجھتا ہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ دین (اسلامی نظامِ زندگی) میں خدا کے تصور کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔

اب دیکھئے کہ قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے۔

قرآن کی رو سے خدا کی کارفرمائی کے تین دائرے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک کی الگ الگ خصوصیات ہیں۔ ہم سب سے پہلے دائرہ اول کے متعلق گفتگو کرتے ہیں۔

اس وقت کائنات میں جو نظام چل رہا ہے اس پر غور کرنے سے یہ حقیقت نمایاں ہو کر سامنے آجائے گی کہ یہاں علت اور معلول (CAUSE AND EFFECT) کا سلسلہ جاری ہے۔ یعنی کائنات میں ہر حادثہ کے نمودار ہونے کے لئے کسی کسی سبب کی ضرورت ہوتی ہے۔ سبب (CAUSE) کے بغیر کوئی واقعہ نمودار نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب ہم اس سلسلہ علت و معلول کو پیچھے کی طرف لے جائیں گے تو آخر الامر ایک ایسا مقام آجائے گا جہاں تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس

پہلا گوشہ مشیت

زنجیر کی پہلی کڑی کسی نہ کسی طرح بلا سبب وجود میں آگئی تھی۔ اسے کہتے ہیں کسی شے کا عدم (NON-EXISTENCE) سے وجود (EXISTENCE) میں آجانا۔ یہ کس طرح سے ہوا تھا، یہ بات انسان کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ قرآن اس کے متعلق اتنا ہی کہتا ہے کہ خدا بدیع السموات والارض (۲/۱۱۴) ہے یعنی تمام سلسلہ کائنات کو عدم سے وجود میں لانے والا۔ ظاہر ہے کہ جس مقام میں علت اور معلول کا سلسلہ ہی نہ ہو وہاں آغاز کار کے لئے کسی قاعدے اور قانون کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ علت اور معلول قانون اور قاعدے ہی کا دوسرا نام ہے۔ قرآن نے اس مقام کو عالم امر سے تعبیر کیا ہے اور وہاں کی کارفرمائی کے متعلق بس اتنا بتایا ہے کہ اِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (۳۶/۸۲) اس گوشہ میں خدا کا امر اس طرح کام کرتا ہے کہ جب وہ کسی شے کا ارادہ کرتا ہے اور کہہ دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ جب کسی شے کو عدم سے وجود میں لایا جائے گا تو اس کے متعلق یہ بھی طے کیا جائے گا کہ اسے کیا ہونا چاہیے۔ اسے اپنی زندگی کی مختلف منازل طے کر کے آخر الامر کیا بنتا ہے۔ اس کی خصوصیات کیا ہوں گی، اس کے خواص و اثرات کیا ہوں گے۔ یہ بھی واضح ہے کہ جب کسی شے کا وجود ہی خدا کے امر (۱۱۴) مطابق ارادہ مشیت کے مطابق عمل میں آیا ہے تو اس کی خصوصیات وغیرہ بھی اس کی مشیت کے مطابق متعین ہوں گی۔ شہد کو شیرینی اور نمک کو نمکینی کیوں ملی؟ ہائیڈروجن اور آکسیجن کے ایک خاص نسبت سے باہم ملنے سے پانی کا قطرہ کیوں بنتا ہے؟ پانی نشیب کی طرف کیوں بہتا ہے۔ وہ ہمارے لئے محمد جاتا کیوں ہے اور سنکھیا قاطع زندگی کیوں؟ یہ وہ امور ہیں جنہیں ہم نہیں سمجھ سکتے۔ اشیاء کی خصوصیات، خدا کی مشیت اور اس کے ارادے کے مطابق متعین ہوتی ہیں۔ ان میں WHY کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔

یہ ہے وہ گوشہ (یعنی کائنات کو عدم سے وجود میں لانے اور اس کے خواص و اثرات متعین کرنے کا گوشہ) جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ يَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ "اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے" اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ (۲۲/۱۳) "اللہ اپنے اختیار و ارادہ کے مطابق جو چاہتا ہے" اِنَّ اللّٰهَ يَخْتَارُ مَا يُؤِيدُ (۵/۱) وہ اپنی مرضی کے مطابق جس قسم کا فیصلہ

چاہتا ہے کرتا ہے۔ کسی کو اس کا حق نہیں کہ پوچھے کہ اس نے فلاں چیز کو ایسا کیوں بنایا اور فلاں فیصلہ ایسا کیوں کیا۔ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُونَ (۲۱/۲۲) اس سے نہیں پوچھا جاسکتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا اور وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔ اس کے سوا اور سب سے پوچھا جاسکتا ہے۔

یہ ہے خدا کے امر کا وہ دائرہ جس میں اس کا اختیار و ارادہ مطلق حیثیت سے کار فرما رہتا ہے اور جہاں وہ کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہیں۔

اب دوسرے دائرے کی طرف آئیے جس میں کائنات سرگرم عمل ہے۔ ہم نے (دائرہ اول میں) دیکھا ہے کہ خدا نے اپنے اختیار مطلق سے اشیائے کائنات کے خواص و اثرات مرتب کئے ہیں۔ اور یہ سب کچھ اس کے امر کی رُو سے ہوا ہے۔ لیکن اشیائے کائنات کے خواص و اثرات مرتب کرنے کے بعد خدا نے اپنے

دوسرا گوشہ قوانین فطرت

امر کی کیفیت بدل دی ہے۔ گوشہ اول میں اس کا امر ضابطوں کا پابند نہیں تھا۔ لیکن اب وہی امر ضابطوں میں گھر گیا۔ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَّقْدُونًا (۳۲/۳۸) خدا کا امر مقررہ پیمانوں کا پابند ہو گیا۔ (قدر کے معنی اندازے اور پیمانے کے ہیں)۔ دوسری جگہ ہے کہ اس نے ہر شے کے لئے ایک پیمانہ مقرر کر دیا۔ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (۶۵/۴) یہ پیمانے اور اندازے وہی چیز ہیں جنہیں قوانین فطرت LAWS OF NATURE کہا جاتا ہے اور جو غیر متبدل ہیں۔ مثلاً پانی کے لئے یہ پیمانہ مقرر کیا گیا وہ عام حالات میں NORMALLY مائع (LIQUID) رہتا ہے جب اسے ٹھنڈک پہنچائی جائے تو وہ ایک خاص درجہ تک پہنچنے کے بعد ٹھوس (برف) میں تبدیل ہو جائے۔ اسی طرح جب اسے حرارت پہنچائی جائے تو ایک معین مقام پر پہنچ کر بخارات (VAPOURS) بن جائے۔ اس کا کیمیاوی تجربہ کیا جائے تو وہ پھٹ کر ہائڈروجن اور آکسیجن میں تبدیل ہو جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔ پانی کے لئے یہ قوانین (مقدرات) اس قدر محکم اور اٹل ہیں کہ ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوگا۔ انسان جہاں جی چاہے اس کا تجربہ کر لے۔ اس میں کہیں فرق نہیں پائے گا۔ ان محکم قوانین کو خدا نے "سنت اللہ" (اللہ کی عادت یا روش) کہہ کر پکارا ہے۔ اور ان کے متعلق کہا ہے کہ وَكَانَ تَحْدِثُ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا (۳۲/۶۱) "تم سنت اللہ میں کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے"

غور کیجئے کہ وہی خدا جو (دائرہ اول میں) کہہ رہا تھا کہ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ (وہ جو جی میں آئے کرتا ہے)۔ وَيَخْتَرُ مَا يُرِيدُ (جو کچھ اس کے ارادے میں آئے اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے) اب کہہ رہا ہے کہ تم اس کی روش، عادت، سنت، قانون میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ یہ کتنی بڑی پابندی ہے جسے خدا نے اپنے اختیار مطلق پر عائد کر لیا ہے۔ یاد رہے کہ جو

پابندی کوئی شخص اپنے اوپر از خود عائد کرتا ہے، اس سے اس شخص کے اختیار و ارادہ پر کوئی حرف نہیں آتا جب خدا نے از خود اپنے امر و مشیت کو قانون کے پیمانوں میں مقید کر دیا، تو اس سے اس کے صاحب اختیار و ارادہ ہونے میں کوئی کمی نہیں آگئی۔ نہ ہی اس کے یہ کہنے سے کہ ”ہم نے جو پابندیاں اپنے امر پر عائد کی ہیں ان میں ہم کوئی تبدیلی نہیں کریں گے“ اسے محکوم و مقید قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ اس کا اپنا فیصلہ ہے کہ کائنات، لگے بندھے قوانین کے مطابق سرگرم عمل رہے اور ان میں کوئی تبدیلی نہ ہو۔ یہ سب کچھ اس کے اپنے مقرر کردہ پروگرام کے مطابق ہو رہا ہے۔ اُس نے ایسا اس لئے کیا ہے کہ سلسلہ کائنات نظم و ضبط اور حسن و خوبی سے چلتا ہے۔ ذرا سوچئے کہ اگر ایسا ہو کہ پانی کبھی تو آگ بجھائے اور کبھی خود ہی شعلے بن کر بھڑک اُٹھے۔ آگ کبھی پانی کو کھولا دے اور کبھی یخ بستہ کرنے تو کائنات کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت سامنے آگئی کہ اس دوسرے گوشے (یعنی خارجی کائنات) میں خدا کا امر ایک غیر متبادل قانون کی شکل میں کار فرما ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ قوانین بھی خدا کے امر، ارادہ، مشیت کے مطابق ہی سرگرم عمل رہتے ہیں اس لئے ان قوانین کی کار فرمائی کو بھی مشیت اور امر ہی سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب اس گوشے میں یہ کہا جائے گا کہ ”اللہ یوں کرتا ہے“ تو اس سے مطلب یہ ہوگا کہ ”اللہ اپنے قانون کے مطابق یوں کرتا ہے“ یا ”اللہ کا قانون یوں کرتا ہے“ مثلاً قرآن میں ہے ”وَمَنْ مِّنْكُمْ لَمَّا آتَىٰ الْقِبْلَ..... بِأَمْرِ رَبِّهِ (۱۶/۱۲) خدا نے رات دن اور سورج اور چاند کو تمہارے لئے مسخر کر رکھا ہے اور (اسی طرح) ستارے بھی اس کے ”امر“ سے مسخر ہیں۔ ظاہر ہے کہ اجرام فلکی (چاند، سورج، ستارے) فطرت کے غیر متبادل قوانین کے مطابق مصروفِ نقل و حرکت ہیں۔ یہ قوانین ایسے محکم اور اٹل ہیں کہ معمولی سے حسابی قاعدے کی رو سے سینکڑوں برس پہلے بتایا جاسکتا ہے کہ چاند یا سورج کو فلاں وقت گھن لگے گا۔ اور فلاں وقت فلاں ستارہ زمین سے اتنے فاصلے پر ہوگا۔ یہی وہ غیر متبادل قوانین ہیں جن پر علم الافلاک (ASTRONOMY) کی ایسی مجید العقول عمارت استوار ہے لیکن ان قوانین کے لئے ”امر“ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ جس کے عام معنی ”حکم“ کے ہیں۔ دوسری جگہ اس کے لئے ”اذن“ کا لفظ آیا ہے (۲۳/۷۵) جس کے عام معنی ”اجازت“ کے ہیں۔

لہذا خارجی کائنات کے نظم و نسق کے سلسلے میں جہاں جہاں امر، اذن، مشیت وغیرہ کے الفاظ آتے ہیں، ان سے مفہوم غیر متبادل قوانین فطرت ہیں۔

اس مقام پر ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے۔ خارجی کائنات میں ہر شے کے لئے غیر متبادل قانون مقرر ہے جسے اس شے کی تقدیر کہتے ہیں۔ یعنی اُس چیز کے خواص و اثرات اور رنگ و ناز کا پیمانہ یا حلقہ۔ یہ قانون اٹل ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ کائنات کی کوئی شے اپنی تقدیر بدلنے پر اختیار نہیں رکھتی۔ اسے اس کا اختیار ہی نہیں دیا گیا کہ وہ جی چاہے تو ان قوانین کی اطاعت

کرے اور جی چاہے ان سے سرکشی برت لے۔ یا جی چاہے تو کسی حد تک ان قوانین کا اتباع کرے اور باقی ماندہ حصہ کے لئے کسی اور قانون کی اطاعت اختیار کر لے۔ بالکل نہیں۔ کائنات کی ہر شے اس قانون کی اطاعت کے لئے مجبور پیدا کی گئی ہے جو اس کے لئے خالق کائنات نے مقرر کر رکھا ہے۔ **وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (۱۶/۲۹)** "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب خدا کے قوانین کے سامنے سجدہ ریز ہے۔"

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ

(۱) پہلے دائرے میں خدا اپنے غیر محدود اور غیر مقتید اختیار و ارادہ کے تحت اشیائے کائنات کو پیدا کرتا ہے اور ان کے لئے قوانین متعین کرتا ہے۔ اس دائرہ میں وہ سب کچھ اپنی مرضی اور ارادے سے کرتا ہے۔

(۲) دوسرے دائرے میں خدا کے متعین کردہ قوانین محکم، اٹل اور غیر متبدل شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس دائرے میں ہر ہر شے ان متعین قوانین کے مطابق سرگرم عمل رہتی ہے کسی شے کو ان قوانین سے سر مو انحراف یا تجاوز کا اختیار نہیں دیا گیا۔ انسان ان قوانین کا علم حاصل کر سکتا ہے اور ان کے مطابق اشیائے کائنات کو اپنے کام میں لاسکتا ہے۔ اسے "تسخیرِ فطرت" کہتے ہیں جو مقامِ آدمیت کی بنیادی شرط ہے۔ "ملائکہ" کا آدم کے سامنے سجدہ ریز ہونا اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس دائرے میں خدا کی حکومت کی ایک آسرناطق (ڈکٹیٹر) کی حکومت نہیں رہی بلکہ قانون کی حکومت قرار پا جاتی ہے۔ البتہ اشیائے کائنات اس قانون کی پابندی پر مجبور ہوتی ہیں۔

تیسرا گوشہ — انسانی دنیا | اب تیسرے دائرے کی طرف آئیے۔ یعنی انسانی زندگی۔ انسانی زندگی کا ایک حصہ تو وہ ہے جس کا تعلق قوانینِ طبیعی (PHYSICAL LAWS) سے ہے۔

اس گوشے میں انسان اور دیگر حیوانات پر ایک ہی قسم کے قوانین کا اطلاق ہوتا ہے۔ لیکن انسانی زندگی کا دوسرا گوشہ وہ ہے جسے "عالمِ انسانیت" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کا تعلق انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) سے ہے جس طرح خدا نے انسان (اور دیگر حیوانات) کی طبیعی زندگی کی نشوونما کے لئے قوانین مقرر کر رکھے ہیں اسی طرح اس نے انسان کی ذات کی نشوونما کے لئے بھی قوانین متعین کر دیئے ہیں۔ (یہ قوانین وحی کے ذریعے ملتے ہیں اور مستقل اقدار کہلاتے ہیں)۔ یعنی انسان کی طبیعی زندگی ہو یا ذات سے متعلق زندگی، اس پر بھی خدا کی کار فرمائی اس کے مقرر کردہ قوانین کی رُو سے ہوتی ہے جن کا علم انسان

نے عالم (۲۱/۲۲) کے برعکس عالمِ خلق میں اللہ تعالیٰ اپنے وعدوں (قوانین) کے لئے جواب دہ ہے۔ (۲۵/۱۶)

کو دے دیا گیا ہے۔ طبعی زندگی سے متعلق علم، عقل و بصیرت اور تجربہ و مشاہدہ کی رُو سے اور انسانی ذات کے متعلق علم و وحی کی رُو سے انسان کی صورت میں ایک خصوصیت اور بھی ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اشیائے کائنات ان قوانین پر چلنے کے لئے مجبور پیدا کی گئی ہیں جو ان کے لئے متعین کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن انسان کو اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے ان سے انحراف اور سرکشی برت لے۔ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ لَئِنْ لَمْ يَأْتِ الْبُرْهَانَ لَسَوْفَ يَكْفُرُونَ (۱۸/۲۹) ان سے کہہ دو کہ تمہارے رب کی طرف سے محکم اور اٹل قانونِ حیات آچکا ہے۔ اب تم میں سے جس کا جی چاہے اسے اختیار کر لے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔

آپ نے دیکھا کہ ان تین دائروں میں کس قدر بنیادی فرق ہوتا چلا گیا ہے۔ گوشہ اول میں خدا کا مطلق اقتدار کارفرما تھا اور وہ کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہیں تھا۔ وہاں مشیتِ ایزدی کے معنی یہ تھے کہ جس طرح خدا نے اپنی مرضی کے مطابق چاہا کر دیا۔ دوسرے گوشے میں مشیتِ خداوندی نے خود اپنے اوپر پابندیاں عائد کر لیں اور ان پابندیوں نے غیر متبدل قوانین کی شکل اختیار کر لی۔ دوسری طرف جن اشیاء پر ان قوانین کا اطلاق ہوتا ہے انہیں بھی اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ ان سے سرتابی برت سکیں۔ تیسرے گوشے میں خدا کا قانون تو بدستور غیر متبدل رہا لیکن انسان کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ جو نسا راستہ جی چاہے اختیار کر لے۔

لیکن انسان کے اس اختیار کے ساتھ حیرت کا پہلو بھی ہے۔ انسان کو اس کا تو اختیار ہے کہ وہ سنکھیا کی ڈلی منہ میں ڈال لے وہ نتائج نہیں بدل سکتا | یا مصری کی۔ لیکن اسے اس کا اختیار نہیں کہ وہ سنکھیا کھانے کے نتائج کو بدل ڈالے۔ خدا کا وہ قانون (جس کی رُو سے اس نے سنکھیا کو قاطع حیات بنایا ہے) اپنا نتیجہ مرتب کر کے لے گا۔ اس لئے اس نے جہاں انسان سے یہ کہا کہ اِعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ۔ تم جس طرح جی چاہے عمل کرو۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ اِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (۲۱/۲۰) ”خدا کا قانون اچھی طرح دیکھ رہا ہے کہ تم کیا کرتے ہو“ عمل کا انتخاب تو تمہارے اختیار میں ہے لیکن یہ تمہارے اختیار میں نہیں کہ تم اس کا نتیجہ بدل ڈالو۔ نہ تم اس کا نتیجہ بدل ڈالو۔ نہ تم اس کا نتیجہ بدل سکتے ہو اور نہ ہی اس نتیجہ کی رُو سے بچ سکتے ہو۔ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ (۸۵/۱۲) یقیناً تیرے رب کے قانونِ مکافات کی گرفت بڑی سخت ہے۔

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ کائنات میں خدا کے بے شمار قوانین (تقدیرات) بکھرے پڑے ہیں۔ انسان کی مرضی ہے کہ جس قسم کا قانون (تقدیر) اپنے لئے چاہے اختیار کر لے۔ انسان کے اس اختیار میں خدا کبھی مغل نہیں ہوتا۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں۔

جب میرے سامنے ایک سے زیادہ راستے ہوں اور ان میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہو تو اس باب میں میرے لئے خدا بھی فیصلہ یا انتخاب نہیں کر سکتا۔ اس نے مجھے اس معاملہ میں آزاد چھوڑ دیا ہے۔

(خطبات انگریزی، صفحہ ۹۵)

جب میں زندگی کے کسی دور میں پرکھرا ہوں تو خدا کا قانون مکافات اس کا انتظار کرتا ہے کہ میں کونسا راستہ اختیار کرتا ہوں میں جس راہ پر چل پڑوں اس راستے سے متعلق قانون میرے پیچھے لگ جاتا ہے اور میرے عمل کا نتیجہ مرتب کرنا شروع کر دیتا ہے۔

تقدیر کے معنی | بالفاظ دیگر انسانی دنیا میں سررشتہ اختیار یا آغاز کار (INITIATIVE) انسان کے ہاتھ میں ہے۔ قرآن میں ہے: فَلَمَّا تَرَأَعْتُمَا نِسَاءً اللَّهُ فُلُوْبَهُمْ (۶۱/۵) جب انہوں نے بیڑھا راستہ اختیار کر لیا تو اللہ نے ان کے دلوں کو بیڑھا کر دیا: دوسری جگہ ہے: يُوَفِّكُ عَنْهُ مَنَ أُفِكَ (۵۱/۹) اس (صحیح راستے) سے اس کو پھیرا جاتا ہے جو خود اس سے پھیر جاتا ہے: فَيَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ (۲/۲۸۳) جو شخص تباہی سے محفوظ رہنا چاہتا ہے اسے خدا کا قانون تباہی سے محفوظ کر دیتا ہے اور جو تباہ ہونا چاہتا ہے اسے تباہ کر دیتا ہے۔ جو شخص جیسا اپنے لئے چاہتا ہے ویسا ہی خدا کا قانون اس کے لئے کر دیتا ہے۔ جو جیسا بن جاتا ہے اس کے مطابق اس کی تقدیر بن جاتی ہے۔ اقبال کے الفاظ میں

تو اگر دیگر شوی او دیگر است
سنگ شور بر شیشہ اندازد ترا
قلمی! پائیدگی تقدیرت

حرفے بار بیکش بہ رمزے مضمہ است
خاک شو نذر ہوا سازد ترا
شبہنی افگندگی تقدیرت

جب کیفیت یہ ہے تو ظاہر ہے کہ اگر ہم ایسے حالات میں گھبرائے ہیں جو ہمارے لئے نامساعد ہیں تو اس میں رونے کی کوئی بات نہیں ہم اپنے اندر تبدیلی پیدا کر لیں اور حالات کو سازگار بنالیں تو اس سے خدا کا دوسرا قانون ہم پر منطبق ہو جائے گا۔ ہماری تقدیر بدل جائے گی۔

خواہ از حق حکم تقدیرے دگر
زانکہ تقدیرات، حق لانتہا است

گر زیک تقدیر خون گرد و اجگر
تو اگر تقدیر نو خواہی رواست

سوال یہ ہے کہ یہ قوانین، یہ تقدیرات انسان کو ملیں گے کہاں سے؟ قرآن نے کہا ہے کہ: وہ وحی کے ذریعے ملیں گے۔ چنانچہ وحی کو "أَمْرٌ مُّبْتَلَىٰ مِنَ اللَّهِ" کہا گیا ہے۔ ذَلِكَ أَمْرٌ مِنَ اللَّهِ أَنْزَلَهُ إِلَيْكُمْ (۶۵/۵) یہ اللہ کا امر ہے جسے اس نے تمہاری طرف نازل کر دیا ہے۔ یعنی وہی امر جو گوشہ اول میں اللہ کے اختیار مطلق کی حیثیت سے فرمایا تھا پھر وہ گوشہ دوم میں مختلف

اشیائے کائنات کی اہل تقدیرات کی حیثیت سے نافذ ہو گیا۔ اور جس کا علم انسانی عقل و بصیرت اور تجربہ و مشاہدہ سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ تیسرے گوشے میں وہی امر وحی خداوندی کی حیثیت سے قرآن میں محفوظ کر کے دے دیا گیا۔ ایک ہی امر ہے جو کہیں (گوشہ اول) میں مشیت کہلاتا ہے۔ کہیں (گوشہ دوم میں) اشیائے کائنات کی تقدیرات بن جاتا ہے۔ اور کہیں (گوشہ سوم میں) احکام الہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ قرآن نے خدا کا جو تصور دیا ہے وہ خدا کے اس تصور سے یکسر مختلف ہے جسے ذہن انسانی نے تراشا تھا۔ اور جسے مختلف مذاہب نے (خدا کی طرف سے دی ہوئی ہدایت کو پس پشت ڈال کر) اپنا لیا تھا۔ اس تصور کی رُو سے خدا (معاذ اللہ) ایک امر مطلق (ڈکٹیشن) کی طرح جو جی میں آئے کرتا تھا اور انسان اُس کے سامنے مجبور تھا۔ خدا کا جو تصور قرآن نے دیا ہے اس کی رُو سے کائنات

خدا کا قرآنی تصور

میں خدا کا قانون کارفرما ہے۔ اور اس قانون میں وہ کبھی استثناء نہیں کرتا۔ نہ ہی اس میں تغیر و تبدل کرتا ہے۔ اس نے ہر عمل کا ایک نتیجہ مقرر کر دیا ہے اور اس کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھا ہے کہ وہ عمل متعینہ نتیجہ پیدا کرے رہے۔

”قانون کے مطابق نظم و نسق چلانے والا خدا“۔ یہ ہے قرآن کا عطا کردہ تصور۔ اس تصور کے مطابق آپ دیکھیں گے کہ اس قسم کے خدا پر ایمان رکھنے والی قوم خارجی کائنات اور خود انسانی دنیا میں کس قدر قانون کی پابند ہوگی۔ خارجی کائنات میں قانون کی کارفرمائی کو ”سائنس“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مذہب کی ایسیج سے قرآن کی آواز منفرد آواز تھی جس نے یہ بتایا کہ کائنات کا عظیم کارخانہ لگے بندھے قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ اس طرح اس نے دنیا کو سائنٹفک تحقیقات کی طرف متوجہ کیا۔ اور سائنس کی نے کہا تھا کہ

جو مذہب سائنس کی تکذیب کرے اور جو سائنس مذہب کی تکذیب کرے وہ دونوں باطل ہوتے ہیں۔

(TERTIUM ORGANUM)

قرآن کا ویا ہوا مذہب (الدرین) وہ ہے جو سائنس کی تکذیب نہیں کرتا بلکہ اس پر بڑی شدت سے زور دیتا ہے۔ یہ اس کی صداقت کی تین دلیل ہے۔ باقی رہا سائنس کا مذہب کی تکذیب کرنا۔ سو کائنات کے متعلق جو کچھ قرآن نے کہا ہے سائنس کی اس وقت تک کی تحقیقات نے اس کی تائید ہی کی ہے۔ تکذیب نہیں کی۔ ڈاکٹر (OTTO) نے کہا ہے کہ

جب تک کوئی مذہب عقل و بصیرت کے عناصر اپنے اندر رکھتا ہے وہ تعصب اور توہم پرستانہ باطنیت کی سطح پر گرنے سے محفوظ رہتا ہے۔ یہی وہ مذہب ہے جو انسانیت کا مذہب بن سکنے کے قابل ہے۔

(THE IDEA OF THE HOLY)

اس معیار پر وہی مذہب پورا اُتر سکتا ہے جس میں خدا کا تصور قانون کے مطابق حکومت کرنے والے کا تصور ہو اور یہ تصور قرآن کے سوا کہیں نہیں مل سکتا۔

یہ تو رہا کائنات میں قانون کی کارفرمائی کا تصور۔ جہاں تک انسانی دنیا کا تعلق ہے، جو قوم ایسے خدا پر ایمان رکھے جو ہر فیصلہ قانون کے مطابق کرتا ہو اس کے ہاں جس قدر قانون کا احترام اور عدل و انصاف کی پابندی ہوگی اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔

یہ ہے خدا کے متعلق اس تصور کا عملی نتیجہ جسے قرآن پیش کرتا ہے۔ یعنی خارجی کائنات میں سائنٹیفک تحقیقات اور مادی ترقی اور انسانوں کی دنیا میں قانون کا احترام اور عدل و انصاف کی کارفرمائی۔
 ”الذین“ اس نظام زندگی کا نام ہے جس کی بنیاد خدا کے اس تصور پر ہو۔



QUOTED IN "FOREIGN AFFAIRS, JULY 1952.

QUOTED BY "STEBBING" IN "IDEALS AND ILLUSION, P - 14

باب ششم

مکافاتِ عمل

سابقہ باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ دین کا سارا تصور اس محور کے گرد گردش کرتا ہے کہ انسان کا ہر عمل وحشی کہ دل میں گزرنے والا خیال بھی نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ اور یہ نتائج قوانین خداوندی کے مطابق مرتب ہوتے ہیں یعنی جس کام کے متعلق قانون خداوندی نے بتا دیا ہے کہ اس کا یہ نتیجہ ہوگا اس کام کا وہی نتیجہ ہوتا ہے۔ اس میں کبھی فرق نہیں آسکتا۔ مثلاً جو شخص سکھیا کھاتا ہے وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ خدا نے اپنے قانونِ طبعی کے مطابق سکھیا کو ہلاکت انگیز بنایا ہے۔ لہذا یہ ہو نہیں سکتا کہ آپ سکھیا کھائیں اور آپ پر اس کا کچھ اثر نہ ہو۔ یا آپ کے لئے وہ ممد حیات بن جائے۔ عمل اور اس کے نتیجے کا جو نظام، طبعی دنیا (PHYSICAL WORLD) میں جاری و ساری و ساری ہے اسی قسم کا نظام خود انسانی دنیا کے لئے بھی مقرر ہے۔ اس قانون کو جس کی رو سے انسان کا ہر عمل اور ارادہ ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے، خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔

قانونِ مکافاتِ کیا ہے؟

انسانی زندگی میں قانونِ مکافاتِ ایسی بنیادی اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے بغیر دنیا کا نظم و نسق چل نہیں سکتا۔ ایک غیر مہذب وحشی معاشرہ میں جس کی لاکھی اس کی بھینس کی کارفرما ہوتی ہے اور مہذب معاشرہ میں اس کا فیصلہ قانون کی رو سے ہوتا ہے کہ بھینس کس کی ہے اور جو شخص اس فیصلہ کی خلاف ورزی کرتا ہے اسے اس کی سزا ملتی ہے۔

بعض لوگ بہم مشق اور مہارت سے سکھیا کھانے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ انہیں اس مقدار تک سکھیا فوراً ہلاک نہیں کرتا۔ ان کی ہلاکت بتدريج ہوتی ہے، لیکن اگر وہ اس مقدار سے زیادہ سکھیا کھالیں تو وہ بھی فوراً ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر جس مقدار میں سکھیا دیتے ہیں وہ مفید نتیجہ پیدا کرتا ہے لیکن اس سے زیادہ مقدار مہلاک ہوتی ہے۔

لیکن انسانی نظم و نسق کے تحت قانونِ مکافات میں بہت سے رخنے رہ جاتے ہیں۔ مثلاً

(i) ایک شخص چوری کرتا ہے لیکن اس انداز سے کہ کسی کو اس کا پتہ نہ چلے۔ وہ اپنے جرم کی سزا نہیں پاسکتا یا

انسانی نظم و نسق میں قانونِ مکافات

(ii) اگر وہ پکڑا جائے لیکن وہ پولیس کو اپنے ساتھ ملائے۔ یا علالت تک رسائی حاصل کر لے تو اس صورت میں بھی وہ سزا سے بچ سکتا ہے۔ یا

(iii) اگر باوجود حکومت یا مجالس قانون ساز قوانین ایسے بنا لیں جو کسی خاص طبقہ کی بدعنوانیوں کو جرم ہی قرار نہ دیں۔ جیسے نظامِ سرمایہ داری میں (جب مجلس قانون ساز میں اس طبقہ کے نمائندوں کی اکثریت ہو۔ اور ایسے نظام میں بالعموم یہی ہوتا ہے)۔ قوانین اس قسم کے وضع کر لئے جاتے ہیں جن کی رو سے محنت کشوں کو ان کی محنت کا پورا پورا معاوضہ نہ دینا کوئی جرم قرار نہیں دیا جاتا یا

(iv) ایک قوم ایسے قوانین مرتب کر لے جن کی رو سے دوسری قوموں کو لوٹنا کھسوٹنا جرم قرار نہ پاسکے۔ اس دور میں جب انسانوں کی تقسیمِ پیشہ و کار کی رو سے ہوتی ہے دنیا کی ہر قوم اس قسم کے قوانین مرتب کر لیتی ہے جن کی رو سے ان کی اپنی قوم کی فلاح و بہبود "حسن عمل" قرار پائے، خواہ اس کے لئے دوسری قوموں سے کیا کچھ نہ کرنا پڑے۔ عصرِ حاضر کی "میکیاؤلی سیاست" کی بنیاد ہی اس اصول پر ہے۔ اس سیاست کی رو سے سب سے بڑا انسان وہ محبتِ وطن (PATRIOT) ہوتا ہے جو اپنی قوم کے مفاد کے تحفظ کے لئے دوسری اقوام کی کھال تک اتار لائے۔ جتنا پختہ اس باب میں اٹلی کا دہتر (CAVOUR) کہا کرتا تھا کہ

اگر وہی کچھ ہم اپنی ذات کے لئے کریں جو کچھ ہم نے مملکت کے لئے کیا ہے تو ہم کتنے بڑے شیطان کہلائیں۔

اور وال پول کا عقیدہ تھا کہ

نیک آدمی کبھی کسی بڑی سلطنت کو نہیں بچا سکتے۔ اس لئے کہ سلطنتوں کو بچانے کے لئے جس حد تک چلے

جانا بعض اوقات ضروری ہو جاتا ہے نیک آدمی وہاں تک جا نہیں سکتے۔

انسانی نظم و نسق کے ماتحت قانونِ مکافات کی یہ حیثیت رہ جاتی ہے۔ لیکن خدائی نظم و نسق میں قانونِ مکافات میں اس قسم

کا کوئی قسم یا رخنہ نہیں رہتا۔ طبیعی دنیا میں آپ دیکھئے۔ ایک شخص کبے کی تنہائی میں سکھیا کھا لیتا ہے۔ اُسے نہ کسی نے

خدائی نظم و نسق میں قانونِ مکافات

دیکھا۔ نہ پولیس نے پکڑا۔ نہ عدالت نے سزا دی۔ لیکن سکھیا کا اثر اس پر خود بخود ہو گیا۔ اُس کا یہ عمل اپنی نتیجہ خیزی کے لئے کسی

گواہ، معتب یا عدالت کا محتاج نہیں۔ یہ عمل خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے از خود نتیجہ خیز ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے کہ کائنات کا یہ بحرِ العقول سلسلہ اس لئے سرگرم عمل ہے کہ ہر عمل کا صحیح نتیجہ مرتب ہوتا چلا جائے۔

وَاللَّهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ أَسَاءُوا بِمَا عَمِلُوا وَأَلْيَجْزِيَ الَّذِينَ أَحْسَنُوا بِالْحُسْنَىٰ (۵۲/۲۱)

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب اللہ کے پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل ہے۔ اور اس سے مقصد یہ ہے کہ جو لوگ غلط روشِ زندگی اختیار کریں انہیں ان کے کاموں کا بدلہ ملے۔ اور جو لوگ حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کریں انہیں اس کا خوشگوار بدلہ ملے۔

دوسرے مقام پر ہے۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا (۱۷/۹)

اللہ وہ ہے جس نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو چھ مختلف ادوار میں تکمیل تک پہنچایا اور زندگی کے سرچشمے پر پورا پورا کنٹرول اسی کا ہے۔

یہ سب اس لئے دیکھا جائے کہ تم میں سے کون حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتا ہے۔

اس مقصد کے لئے ساری کائنات میں "خدا کے لشکر" (۲۸/۲) موجود ہیں جو ایک ایک فرد کے اعمال کی نگرانی کرتے ہیں۔ سورہ رعد میں ہے۔

عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيرُ الْمُتَعَالِ ۝ سَوَّأَوْ مَنَّكَم مِّنْ أَمْرِ الْقَوْلِ وَ مَن جَهَرَ بِهِ وَ مَن هُوَ مُسْتَخْفٍ بِأَلْسِنٍ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ ۝ لَهُ مُعَقِّبَاتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مَن خَلْفَهُ يَحْفَظُونَهُ مِّنْ أَمْرِ اللَّهِ ۝ إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِتَقْوَىٰ وَحَتَّىٰ يُغَيِّرَ ذَا مَا بِانْقِرَاطِ عُرْسِهِ (۱۱-۱۳۸)

خدا جانتا ہے جو کچھ تمہاری نگاہوں کے سامنے ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے۔ اس کا قانونِ مکافات بڑی قوتوں کا مالک ہے۔ اور ایسے بلند مقام پر متمکن کہ اس تک کسی کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا جو اس میں کسی قسم کا رد و بدلہ کر سکے۔ اس قانون کی نگاہ اس قدر باریک بین ہے کہ تم میں کوئی شخص کسی بات کو چھپاتے یا ظاہر کرتے۔ کوئی شخص دن کی روشنی میں چلے پھرے یا رات کی تاریکیوں میں کچھ کرے۔ اس کے نزدیک سب یکساں ہے۔ ہر شخص کے آگے پیچھے ایسی نگرانی تو میں تعینات کر دی گئی ہے جو اس کے ہر عمل کا بوجھا کر کے اسے اس کے نتیجہ تک پہنچا

دیتی ہیں اور اس طرح اس کا ہر کام خدا کی تدبیر کے مطابق محفوظ ہو جاتا ہے۔
جو کچھ افراد کے ساتھ ہوتا ہے وہی کچھ اقوام کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب تک کوئی قوم اپنے اعمال سے خود
اپنے اندر تبدیلیاں پیدا نہیں کر لیتی جو کچھ اس کے پاس ہوتا ہے اس میں کسی قسم کا رد و بدل نہیں ہوتا۔
یوں سمجھو کہ

وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِينَ ۝ (۹۱-۸۲/۱)

تم میں سے ہر ایک کے ساتھ ایسے معزز اور محترم منشی متعین ہیں جو تمہارے ایک ایک کام کو ضبط و تحریر میں لاتے چلے
جاتے ہیں۔

ظاہراً اعمال ہی نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں میں گزرنے والے خیالات تک بھی۔
وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعَلَهُ مَا تَوَسَّوَسُ بِهِ نَفْسُهُ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبَلٍ
الْوَسْبِئِ (۵۰/۱۶)

ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم جانتے ہیں کہ اس کے دل میں کس قسم کے خیالات گزرتے ہیں ہم اس سے اس
کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

اس ریکارڈ کا نام وہ اعمال نامہ ہے جو ہر ایک کے ساتھ چپکار رہتا ہے۔
وَكُلُّ إِنْسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرًا فِي عُنُقِهِ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنْشُورًا
إِثْرًا أَلَيْسَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا ۝ (۱۳-۱۴/۱۴)

اور ہم نے ہر انسان کا اعمال نامہ اس کی گردن کے ساتھ چپکار رکھا ہے۔ یہ لپٹی ہوئی کتاب ظہورِ نتائج کے وقت
کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اور اس شخص سے کہا جاتا ہے تو اپنی کتاب آپ پڑھ۔ آج خود تیری اپنی ذات تیرا
حساب لینے کے لئے کافی ہے۔

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ قانونِ مکافات کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے ہر عمل کا نتیجہ اس کی ذات پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے انسان
نظام میں تو یہ ہو سکتا کہ انسان اپنے جرائم پر کسی نہ کسی طریق سے پردہ ڈال لے لیکن خدا کے قانون کی رو سے ان جرائم کے جو
اثرات اس کی ذات پر مرتب ہوتے ہیں جب ان کے ظہورِ نتائج کا وقت آئے گا
ہر عمل اثر مرتب کرتا ہے | تو وہ کسی کے چھپائے چھپ نہیں سکیں گے۔ بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ

بَصِيرَةٌ ۝ وَ لَوْ أَلْفَىٰ مَعَاذِينَ ۝ (۱۳-۱۵/۵۱)

تیز ہو جاتی ہیں کہ بڑی سے بڑی رکاوٹ بھی ان کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ (۵۰/۲۲)

ان تصریحات سے جہاں یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے انسان کا کوئی عمل نتیجہ مثبت کے بغیر نہیں رہ سکتا، وہاں یہ چیز بھی واضح ہو گئی کہ اعمال کی جزایا سزا کہیں خارج نہیں ہوتی۔ یہ ان اعمال کا فطری اور لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ آپ

اعمال کی جزا اور سزا

کسی مزدور سے کہتے ہیں کہ وہ آپ کی چھٹی فلاں شخص کو دے آئے جس کا مکان تین میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کے لئے آپ اُسے آٹھ آنے کے میسے دیتے ہیں۔ اس مزدور کو نہ اُس چھٹی سے کوئی واسطہ ہے، نہ اس سے کوئی تعلق کہ آپ نے وہ چھٹی اُس شخص کے پاس کیوں تقسیم ہے۔ اُسے اپنی مزدوری سے واسطہ ہے۔ اس کے کام کا یہ معاوضہ ایسا ہے جو اسے خارج سے ملتا ہے۔ ان معاملات میں عمل اور اس کے نتیجے میں کوئی اندرونی ربط یا تعلق نہیں ہوتا۔

اس کے برعکس آپ صبح کی سیر میں تین میل کا چکر لگا کر آتے ہیں۔ اس سے آپ کی صحت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ یہ اُس عمل (یعنی تین میل کی سیر) کا فطری نتیجہ ہے۔ بالفاظِ دیگر اس عمل کا نتیجہ آپ کو کہیں خارج سے نہیں ملتا۔ یہ نتیجہ اس عمل کے اندر مضمر ہوتا ہے۔

دوسری طرف یہ مثال لیجئے کہ ایک طالب علم سکول سے غیر حاضر ہو جاتا ہے۔ اور ما سٹر اسے جرمانہ کر دیتا ہے۔ اسکول کی غیر حاضری سے اس بچے کی تعلیمی استعداد پر جو اثر پڑتا ہے اس جرمانے کا اس سے کوئی تعلق اور ربط نہیں۔ نیز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بچہ جرمانے کی رقم اپنے باپ سے لے کر ادا کرے۔ اس صورت میں وہ سزا بچہ کو نہیں بلکہ بچے کے باپ کو ملی۔ لیکن اگر ایک بچہ آگ میں ہاتھ ڈال لیتا ہے تو اس سے اسے جو تکلیف پہنچتی ہے وہ اس کے اس عمل کا براہِ راست، فطری اور لازمی نتیجہ ہے۔ اس کی یہ تکلیف اس کے باپ (یا کسی اور) کی طرف منتقل نہیں ہو سکتی۔ اس کے عمل کی یہ سزا خود اس کے عمل کے اندر پوشیدہ تھی اور خود اسے ہی بھگتنی پڑتی ہے۔

تیسری مثال یہ سمجھئے کہ ایک شخص اپنی محنت و مزدوری کر کے کچھ کما کر لاتا ہے۔ اور اس کمائی سے گھی خرید کر کھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ گھی سے اس کے جسم میں طاقت پیدا ہو جائے گی۔ اس کے برعکس ایک شخص گھی چرا کر کھاتا ہے۔ اس گھی کا اس کے جسم پر بعینہ وہی اثر ہو گا جو اس شخص کے جسم پر ہوتا ہے جو اپنی محنت کی کمائی سے گھی خرید کر کھاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں تک طبعی قوانین کا تعلق ہے ان پر اخلاقیات کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ انسانیت کی میزبان میں بھی حلال کی کمائی سے خریدے ہوئے اور چوری کے گھی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس عمل کا اثر انسان کی ذات پر پڑتا ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے اس قانونِ مکافات کا دائرہ شروع ہوتا ہے جس کا تعلق دنیائے انسانیت سے ہے۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ

(i) انسان کا کوئی کام بلا نتیجہ نہیں رہ سکتا۔

(ii) مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔

(iii) ان اقدار کی خلاف ورزی کرنے سے انسانی ذات تباہ ہو جاتی ہے۔

(iv) یہ نتائج انسانی اعمال کے اندر پوشیدہ ہوتے ہیں یعنی ان کا لازمی اور فطری نتیجہ ہوتے ہیں۔

(v) یہ نتائج کسی دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ اس باب میں قرآن نے واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ

مَنْ يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا يَكْسِبُهُ عَلَى نَفْسِهِ (۴/۱۱۱) **اعمال کے نتائج کوئی اور جگہ نہیں سکتا**

جس نے کوئی ایسا کام کیا جس سے اس کی ذات مضمحل

ہوتی ہو تو اس کا اثر خود اس کی اپنی ذات پر پڑے گا۔

دوسری جگہ ہے۔

إِن أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ وَإِن أَسَأْتُمْ فَلَهَا (۱۴/۷)

اگر تم نے حسن کارا نہ انداز سے (مستقل اقدار کے مطابق) زندگی بسر کی تو اس سے تمہاری اپنی ذات میں حسن

پیدا ہو جائے گا۔ اور اگر تم نے ناہمواریاں پیدا کرنے والی روش اختیار کی تو اس کا نقصان بھی تمہاری ذات کو ہوگا۔

بالفاظ دیگر :-

مَنْ عَمِلْ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا (۴۱/۳۶)

جو شخص صلاحیت بخش کام کرے گا اس کا فائدہ اس کی ذات کو پہنچے گا جو اس کے خلاف چلے گا وہ اس کی ذات پر پڑے گا۔

اس کی ذات پر پڑے گا۔

یہی وجہ تھی کہ زبان وحی نے واضح الفاظ میں کہہ دیا۔

قَدْ جَاءَكُمْ بَصَائِرٌ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا وَمَا

أَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيظٍ (۶/۱۰۶)

تمہارے پاس تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے واضح حقائق و دلائل آگئے جو کوئی ان کی روشنی میں

دیکھ کر راہ چلے گا تو اس کا فائدہ اس کی ذات کو ہوگا۔ جو آنکھیں بند کر لے گا اس کا نقصان اسی کو ہوگا جس

تم پر نگران مقرر نہیں کیا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ (جیسا کہ دوسرے باب میں بتایا جا چکا ہے) انسانی ذات (PERSONALITY) کی انفرادیت اور یکتائی (UNIQUENESS) کے معنی یہی ہیں کہ جو اثرات اس پر مرتب ہوں اس میں کوئی دوسرا شریک و سہیم نہ ہو۔ ہر شخص کی ذات اپنی جگہ منفرد ہے۔ یہ اس کی انفرادیت (INDIVIDUALITY) ہے جس سے اس کا وجود قائم ہے۔ اس لئے اس کے اثرات کسی کی طرف منتقل نہیں کئے جاسکتے۔ (ذات کے تاثرات و نقوش تو ایک طرف۔ کوئی کسی دوسرے کے سر درد کو بھی اپنی طرف منتقل نہیں کر سکتا)۔

لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (۶/۶۵)

کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔

اور ایسا حکم اور اہل قانون ہے جس پر وین کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس کے لئے آپ ایک بار پھر اس مثال کو سامنے لائیے جسے ابھی ابھی پیش کیا گیا تھا۔ آپ آگ میں ہاتھ ڈالتے ہیں اور آپ کا ہاتھ جل جاتا ہے جس سے آپ کو سخت درد ہوتا ہے۔ اگر آپ کے پاس دس ہمدرد دوست بھی ایسے ہوں جو آپ کی خاطر اپنی جان دینے تک سے دریغ نہ کریں، تو بھی ان میں سے کوئی دوست آپ کا درد بٹا نہیں سکتا۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ ہاتھ آپ کا جلے اور درد آپ کے دوست کو ہو جائے۔ اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ آپ ہزاروں روپے رشوت دے کر اپنے درد کو دور کرالیں۔ یا بڑی سے بڑی سفارش آپ کے حق میں فیصلہ کرادے۔ اور آپ کا درد دور ہو جائے۔ آپ نے آگ میں ہاتھ ڈالنے سے قانون کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس کی سزا آپ کو بھگتنی پڑے گی۔ یہی ہے وہ قانون مکافات جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا

يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ (۲/۲۸۱)

تم اعمال کے ظہور و نتائج کے وقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھو۔ جب صورت یہ ہوگی کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے کام نہیں آسکے گا۔ نہ ہی کسی کی سفارش قبول کی جائے گی۔ نہ ہی کوئی فدیہ دے کر چھٹکارا حاصل کر سکے گا۔ نہ ہی مجرم کی کوئی مدد کر سکے گا۔ یہ خدا کا اہل قانون ہے جس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔

•••

اس وقت ہم نے قانونِ مکافات کے اس گوشے کے متعلق گفتگو کی ہے جس کا تعلق انسان کی انفرادی زندگی (ذات) سے ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے ایک طرف فرد کی ذات کی نشوونما اجتماعی زندگی کے اندر ہوتی اور دوسری طرف افراد ایسا معاشرہ تشکیل کرتے ہیں جو نوعِ انسان کو اس کی منزل مقصود تک لے جانے کا فریضہ ادا کرتا ہے۔ لہذا قانونِ مکافات

قوموں کے اعمال افراد کی طرح اقوام کو بھی اپنے دائرے کے اندر لئے ہوئے ہے جو قومیں مستقل اقدار کے

استحرام و تنفیذ کے لئے سرگرم عمل رہتی ہیں انہیں زندگی کی خوشگواریاں اور سربندیاں نصیب ہوتی ہیں جو ان کے خلاف چلتی ہیں وہ ذلیل و رسوا اور تباہ و برباد ہو جاتی ہیں (تفصیل اس اجمال کی دوسرے مقام میں ملے گی) ایک فرد کی ذات پر مرسوم شدہ نقوش و اثرات دوسروں کی نظروں میں محسوس و مرئی نہیں ہوتے۔ (اگرچہ اس کی سیرت و کردار اس کے آئینہ دار ہو جاتے ہیں) لیکن قوموں کی روش زندگی کے نتائج محسوس و مرئی طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ چنانچہ (جیسا کہ باب چہارم عقل و ایمان — میں بتایا جا چکا ہے) قرآن اپنے تجویز کردہ پروگرام کی صداقت کی پہچان کے لئے طریقہ یہ تجویز کرتا ہے کہ ایک جماعت اس پروگرام کو عملاً متشکل کرے اور اس کے بعد دیکھ لے کہ اس کے نتائج وہی برآمد ہوئے ہیں جن کا وعدہ قرآن کرتا ہے یا وہ اس کے دعوے کی تکذیب کرتے ہیں؟ وہ نبی اکرم سے کہتا ہے کہ

قُلْ يُقَوْمِهِ اَعْمَلُوا عَلٰی مَا كَانَتْكُمْ اِتٰی عَامِلٌ فَاَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ لَا مَن يَكُوْنُ لَدٰٓ

عَاقِبَةُ الدَّارِط (۶/۱۳۵)

ان سے کہہ دو کہ تم اپنے پروگرام کے مطابق اپنی جگہ کام کرو۔ میں اپنے پروگرام کے مطابق اپنی جگہ کام کرتا ہوں۔ تمہیں (نتائج سے) خود معلوم ہو جائے گا کہ آخر الامر کامیابی کے نصیب ہوتی ہے۔

استنباحی طریق قانون مکافات کو اس کے نتائج سے پہچاننے کا طریق (جسے (PRAGMATIC TEST) کہتے ہیں) سب سے بہتر ہے۔ اس سے زیادہ حتمی اور یقینی طریق اور کوئی ہو نہیں سکتا۔ لیکن اس

میں وہ دشواری پیش آجاتی ہے جس کے متعلق باب اول — دین کی بنیاد — میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ یعنی اس قانون کو اگر کائناتی رفتار پر چھوڑ دیا جائے تو اعمال اور ان کے نتائج کے ظہور کے وقت میں کافی لمبا عرصہ لگ جاتا ہے جو ہمارے حساب و شمار سے ہزار ہزار برس بلکہ اس سے بھی زیادہ کا ہو سکتا ہے۔

پھر اس عرصہ کو کم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسانی جماعت، قانون خداوندی کی رفیق و معاون بن جائے۔ اس صورت میں وہ نتائج انسانی حساب و شمار سے مرتب ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔

جہاں تک فرد کی ذات کا تعلق ہے عمل اور اس کے نتیجہ کے ظہور کے درمیان کتنا ہی وقت کیوں نہ لگے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ انسانی زندگی جسم کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی اس کے بعد بھی آگے چلتی ہے۔ اس لئے ان اثرات کی نمود اگر یہاں نہیں ہوتی تو موت کے بعد ہو جاتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ہمارے سامنے بعض ایسے تصورات آتے ہیں جن کا مذہب کی دنیا میں عام طور پر چرچا ہوتا ہے۔ یعنی نجات، ثواب، مغفرت، توہ، جنت، جہنم وغیرہ۔

آئندہ باب میں ان کے متعلق گفتگو کی جائے گی۔

رحم کا تصور | اس مقام پر ایک نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ خدا کا قانونِ مکافاتِ خالص عدل کے اصول پر کارفرما ہوتا ہے جس میں کسی قسم کی رورعایت کی گنجائش نہیں ہوتی۔ سوال یہ ہے کہ اس میں "رحم" (یا معافی) کی بھی گنجائش ہے یا نہیں۔ اس کی گنجائش ضرور ہے لیکن اس "رحم" کا تصور مختلف ہے۔ "رحم" کا ایک تصور تو یہ ہے کہ قانون کی رُو سے مجرم سزا کا مستحق قرار پا چکا ہے لیکن وہ روتا ہے۔ گڑگڑاتا ہے۔ حاکم کو اس کی حالت پر رحم آجاتا ہے اور وہ اسے معاف کر دیتا ہے۔ یہ "رحم" کا جذباتی تصور ہے جس کا خدا کے قانونِ مکافات سے کچھ واسطہ نہیں۔ اس کا دوسرا (اور صحیح) تصور یہ ہے کہ آپ کا ہاتھ جل جانے سے آپ کو شدت کا درد ہوتا ہے۔ جس خدا نے یہ قانون بنایا ہے کہ آگ جلاتی ہے اور جلنے سے درد پیدا ہوتا ہے، اسی خدا نے اسی دوایتیاں بھی پیدا کی ہیں جن سے درد کو آرام آجاتا ہے۔ اگر آپ پہلے جرم (آگ میں ہاتھ ڈالنے) کے بعد خدا کے اس دوسرے قانون کی طرف رجوع کریں گے اور جو دوایتیاں اس نے پیدا کی ہیں ان کا استعمال کریں گے تو آپ کو جرم کی سزا سے "معافی" مل جائے گی۔ یہ ہے قرآنِ کریم کی رُو سے "خدا کے رحم" کا تصور۔ یعنی خدا کے قانون کی خلاف ورزی سے جو نقصان ہوتا ہے اس کی تلافی کے لئے خدا ہی کے دوسرے قانون کی طرف رجوع کرنا۔ جس طرح خدا کا پہلا قانون عالمگیر **UNIVERSAL** ہے۔ انفرادی نہیں۔ اسی طرح اس کا یہ دوسرا قانون بھی عالمگیر ہے۔ کسی قانون کی خلاف ورزی کے بعد خدا کے اس قانون کی طرف رجوع کرنا جس سے اس نقصان کی تلافی ہو جائے تو بہ، کہلاتا ہے۔ اور اس (دوسرے) قانون کی اطاعت سے پہلے قانون کی خلاف ورزی کی پیدا کردہ تباہی سے حفاظت مل جانا "معفرت" ہے۔ (معفرت کے معنی ہی حفاظت کے ہیں) خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے "جس او" نہیں معاف کیا "کا تصور غلط ہے۔

خدا کا یہ "توبہ اور معفرت" کا قانون جس طرح افراد کے حق میں کارفرما رہتا ہے اسی طرح اقوام پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ اگر کسی قوم سے خدا کے کسی قانون کی خلاف ورزی ہو جاتی ہے تو اس کے تباہ کن نتیجے سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ وہ خدا کے اس قانون کی اطاعت (جس کے نتائج تعمیری اور منفعت بخش ہوں) اور شد و مد سے کرے۔ اس قانون کے تعمیری نتائج، سابقہ لغزش کے تخریبی نتائج سے حفاظت (معفرت) کا سامان بہم پہنچادیں گے۔

اس مقام انہی اشارات کو اکٹھا کیا جاتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی آئندہ باب میں ملے گی۔

-
1. QUOTED IN "FOREIGN AFFAIRS", JULY 1952
 2. QUOTED BY "STEBBING" IN "IDEALS AND ILLUSIONS" , P - 14

نجات

دنیا میں آپ کسی سے پوچھتے کہ وہ مذہبی احکام و رسوم کی بجا آوری میں اس قدر مشقتیں کیوں اٹھاتا اور اس قدر تکالیف کیوں برداشت کرتا ہے؟ وہ جاڑے کی راتوں میں پچھلے پہر اٹھ کر سب سے پہلے غسل کر کے ننگے فرش پر بھگتی کے لئے کیوں بیٹھتا ہے؟ وہ گرمی کے زمانے میں پہاڑ جیسے لمبے دنوں میں بھوک اور پیاس کی مشقت کیوں برداشت کرتا ہے؟ وہ اپنی مفلسی اور ناداری کے باوجود اپنی کمائی میں سے خیرات کر کے اپنے آپ کو تنگی میں کیوں رکھتا ہے۔ وہ انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں کسی خاص مقدس مقام کی زیارت (یا یا ترا) کے لئے سینکڑوں میل کا سفر کیوں کرتا ہے؟ ان تمام جانکاہ مشقتوں اور صبر آزما مرحلوں سے بالآخر مقصود کیا ہے؟ آپ دیکھیں گے کہ مذہب کے ہر گوشے (یعنی ہر مذہب کے پیرو کی طرف سے) ان سوالات کا ایک ہی جواب ملے گا۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم یہ کچھ اس لئے کرتے ہیں کہ ہماری نجات ہو جائے۔ ہمیں مکتی مل جائے۔ ہماری (SALUATION) ہو جائے۔ زبانوں کے اختلاف کی وجہ سے یہ الفاظ مختلف ہیں۔ لیکن ان سب کا مفہوم ایک ہی ہے۔ یعنی انسان مذہبی احکام کی فرماں پذیری میں اس قدر مشقتیں اس لئے اٹھاتا ہے کہ اس کی نجات ہو جائے۔

نجات کس سے؟

ہندو شاستر (شریعت) کی رُو سے ہر انسانی بچہ اپنی پیدائش کے وقت اپنے سابقہ جنم کے گناہوں کا بوجھ اپنے ساتھ لاتا ہے۔ وہ عمر بھر ان گناہوں کی آلودگی سے نجات حاصل کرنے کے لئے کوشش کرتا ہے لیکن اکثر و بیشتر ہوتا یہ ہے کہ اس آلودگی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ مر جاتا ہے تو پھر اپنی آلودگیوں کو لئے ہوئے دوسرا جنم لیتا ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اسے آواگون (تناسخ) کا چکر کہتے ہیں۔ زندگی کا

نجات کا مفہوم

مقصد و منتہی یہ ہے کہ انسان آواگون کے اس چکر سے مکتی (نجات) حاصل کر لے۔ اس کے لئے مذہبی احکام و رسوم کی جانکاح مشقتیں اٹھائی جاتی ہیں۔

(ہندو) ویدانت (یعنی طریقت یا معرفت) کی رُو سے انسان کی آتما (روح) پر ماتما (خدا) کی روح کا جزو ہے جو اپنے گل سے جدا ہو کر پراکرتی (مادہ) کی کثافتوں میں جکڑے ہوئے مصروفِ آہ و فغاں ہے۔ زندگی کا مقصد آتما کو مادہ کی ان بندھنوں سے نجات دلانا ہے۔ یہ مقصد یوگ کی صبر آزما اور جانگسلی ریاضتوں کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ بدھ مت کی رُو سے انسان کی ہر آرزو ایک نئی تکلیف کا پیش خمیہ بنتی ہے۔ انسان کے دل کو آرزوؤں کے فریب سے نجات دلانا مقصودِ حیات ہے۔ اس سے اُسے نردان حاصل ہو جاتا ہے جس کے معنی کلی فنا کے ہیں۔

عیسائیوں کے عقیدہ کی رُو سے ہر انسانی بچہ اپنے اولین ماں باپ (آدم و حوا) کے گناہ کا بوجھ اپنی پشت پر لاد کر پیدا ہوتا ہے۔ اُسے اس بوجھ سے نجات دلانا مذہب کا مقصد ہے جو حضرت عیسیٰ کی "صلیب اور کفارہ" پر ایمان لانے سے حاصل ہو سکتی ہے۔

یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ بنی اسرائیل کا ہر بچہ نعتی کے بعد جنتی ہو جاتا ہے۔ لیکن کسی زمانے میں اس قوم کے آباؤ اجداد سے کچھ گناہ سرزد ہو گئے تھے۔ ان کی پاداش میں یہ قوم کچھ دنوں کے لئے جہنم میں بھیج دی جائے گی۔ اس جہنم کے عذاب سے چھوٹ جانے کا نام نجات ہے۔

نجات کے اس تصور کو سامنے رکھتے اور دیکھتے کہ اس کی اصل و بنیاد میں ایک عنصر ہر جگہ بطور قدر مشترک موجود ہے۔ وہ یہ کہ انسان اچھا بھلا کہیں تھا۔ اسے بعض وجوہات کی بنا پر دنیا کے جیل خانے میں بھیج دیا گیا۔ جب وہ اس جیل خانے میں جکتی پیتے پیتے اپنے آپ کو "شریف انسان" ثابت کرنے لگا تو اسے جیل خانے سے نکال کر پھر اس کے اصلی مقام میں بھیج دیا جائے گا۔ یہی نجات ہے۔ زیادہ محسوس مثال میں یوں سمجھئے کہ ایک شخص صبح کو اچھا بھلا اٹھا، اُس وقت اس کا ٹمپریچر ۹۵ درجہ تھا، دس بجے کے قریب اُسے بخار ہوا۔ دن بھر بخار رہا۔ ڈاکٹر نے دوائی دی۔ شام کو اسے نجات مل گئی۔ اس کا درجہ حرارت پھر ۹۵ ہو گیا۔ یعنی وہ پھر ویسا ہی ہو گیا جیسا صبح کے وقت اٹھا تھا۔ اس دن بھر کی محنت اور مشقت اور تگ و دو سے اسے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ وہ پھر ویسے کا ویسا ہو گیا۔ یہی ہے وہ تصور (یعنی انسان کا (AS YOU WERE) ہو جانا) جو نجات کی اس نکتہ

لے رومی کا یہ پیغام کہ بشنوا ز نے چوں حکایت می کند از جدا یہا شکایت می کند
اسی عقیدہ کی صدائے بازگشت ہے۔

بنیاد ہے۔ کپڑا سفید تھا۔ گرد و غبار سے میلا ہو گیا۔ اسے دھو بی کی بھٹی چڑھایا گیا۔ میل کٹ گیا۔ کپڑا پھر ویسے کا دیا سفید ہو گیا۔ یہ ہے نجات کا مفہوم۔

آپ سوچئے کہ کیا یہ بات عقل و بصیرت کو اپیل کرتی ہے کہ یہ عظیم الشان کارگہ کائنات — انسانی پیدائش کا محیر العقول پروگرام — آسمانی رشد و ہدایت کا ایسا بلند و بالا سلسلہ محض اس لئے ظہور میں لایا گیا ہو کہ انسان جیسا پہلے تھا پھر ویسا ہی بن جائے۔ اس سے کوئی ترقی (PROGRESS) کوئی مفاز (ACHIEVEMENT) کوئی تعمیری مقصد

(CONSTRUCTIVE PURPOSE) مقصود نہ ہو۔ ہر صاحب بصیرت پکار اٹھے گا کہ یہ بچوں کا کھیل ہے جو خدائے حکیم و

نجیر کے قطعاً شایان شان نہیں۔ سُبْحَانَ اللَّهِ تَعَالَى عَمَّا يُصِفُونَ۔ قرآن کی رُو سے انسانی زندگی کا منتہی امکانی نہیں دین سے مقصود ”نجات“ نہیں۔ انسان نہ اس دنیا کے جیل خانے میں پھنسا ہوا اچھی پس رہا ہے۔ نہ اس سے نجات اس کی

قرآن کی رُو سے انسانی زندگی کا مقصد | تاک و دو کا مقصود ہے۔ نہ اس کی روح اپنی اصل سے جدا ہو کر مادہ کی کثافت میں طوٹ ہو گئی ہے۔ نہ یہ اپنی پشت پر کسی

سابقہ جنم کے گناہوں کا بوجھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ نہ اپنے اولین ماں باپ کے جرائم کی پاداش میں یہاں بھیجا جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ہر انسانی بچہ ایک صاف اور سادہ لوح (CLEAN SLATE) لے کر دنیا میں آتا ہے۔ اسے کچھ امکانی صلاحیتیں (REALISEABLE POSSIBILITIES) دی جاتی ہیں جن کی نشوونما اس کا مقصود زندگی ہوتا ہے۔ آئندہ سطور میں آپ کو اس اجمال کی تفصیل ملے گی۔

یونانی حکماء کے نزدیک کائنات کی حرکت دوری (CYCLIC) تھی یعنی وہ کولہو کے میل کی طرح ایک ہی دائرے میں گردش کئے چلی جاتی تھی۔ اس مسلسل سفر میں اس کا کوئی قدم آگے نہیں بڑھتا تھا۔ آپ ذرا بنظر تعمق دیکھیں گے تو یہ حقیقت نمایاں طور پر سامنے آجائے گی کہ ہندوؤں کا آواگون کا چکر یا نجات کا عقیدہ کائنات کے متعلق اسی حرکت دوری کے نظریہ کے نتائج ہیں۔ ہندو فلسفہ زندگی، بیشتر یونانی فکر سے مستعار لیا گیا ہے۔ قرآن نے آکر اس تصور کو باطل قرار دیا اور کہا کہ زندگی ایک دائرے میں گردش نہیں کرتی بلکہ وہ سیدھی اور متوازن راہ پر جا رہی ہے۔ اِنَّ مَآبِيَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۱۱/۵۶) ”ان سے کہہ دو کہ میرا نشوونما دینے والا ایک سیدھی اور متوازن راہ پر جا رہا ہے“ یعنی خدا اپنے قانون کے مطابق کائنات کو سیدھی راہ پر لئے جا رہا ہے۔ صِرَاطِ اللَّهِ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (۱۲/۵۲) ”یہ اس خدا کی راہ ہے جس کے پروگرام کی تکمیل کے لئے ماری کائنات سرگرم عمل ہے“ لہذا کائنات بھی ایک سیدھی اور

توازن بدوش راہ پر چل رہی ہے۔ سیدھی اور توازن بدوش ہی نہیں بلکہ بلند یوں کی طرف جانے والی۔ اس خدا کی راہ جو ذی المعارج (۷۰/۳) ہے۔ یعنی بلند یوں کی طرف جانے والا۔ ”سیرتھیوں والا“۔ لہذا کائنات سیدھی اور توازن بدوش راہ پر بھی چل رہی ہے اور اس کے ساتھ اوپر کو بھی اُٹھتے جا رہی ہے۔ یہ اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اپنے نصب العین کی طرف بڑھے جا رہی ہے۔ بالفاظ دیگر، قرآن کی رو سے کائنات (PROGRESSIVE) اور (DYNAMIC) ہے۔ جامد (STATIC) اور ایک ہی جگہ میں گردش کرنے والی نہیں۔ یہی وہ راہ ہے جس پر چلنے کے لئے انسان کو تاکید کی جاتی ہے۔ چنانچہ سورہ فاتحہ میں نوع انسانی کو دعا ہی یہ سکھائی گئی ہے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (۱/۵) ”ہمیں سیدھی اور متوازن راہ کی طرف راہ نمائی عطا کر دے“ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کی رو سے انسانی زندگی کی تگ تاز سے مقصود کسی مصیبت سے نجات حاصل کر کے (AS YOU WERE) ہو جانا نہیں بلکہ شاہراہ حیات میں آگے بڑھنا اور بلند ہونا ہے۔ اسے ارتقاء (EVOLUTION) کہتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے، قرآن کی رو سے انسان

(i) کسی قسم کا کوئی بوجھ لادے دنیا میں نہیں آتا۔ وہ صاف اور سادہ لوح (CLEAN SLATE) لے کر آتا ہے۔

(ii) اسے فطرت کی طرف سے بہت سی ممکنات (REALISEABLE POTENTIALITIES) ملی ہیں۔

(iii) اس کی زندگی کا مقصود ان ممکنات کو مشہود بنانا۔ اپنی مضمحل صلاحیتوں کو نمودار کرنا۔ اپنی ذات کی نشوونما کرنا۔ اور

اس طرح اس زندگی سے بلند و بالا زندگی بسر کرنے کے قابل بن جانا ہے۔ زندگی کی ان ارتقائی منازل کے متعلق قرآن نے

کہا ہے کہ لَتَرَكُنَّ طَبَقًا عَن طَبَقٍ (۸۴/۱۹) ”تم طبقاً طبقاً“ درجہ بدرجہ ‘

زندگی کے ارتقائی منازل

زینہ بہ زینہ STAGE BY STAGE اوپر چڑھتے چلے جاؤ گے۔ لہذا زندگی کا

مقصد کسی بندھن سے چھٹکارا حاصل کرنا نہیں، ارتقائی منازل طے کر کے بلند سے بلند تر ہوتے جانا ہے۔ اس کے لئے دین

ایک عملی پروگرام دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر پروگرام کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک وہ نظریہ، وہ قانون، وہ فارمولا جو اس

پروگرام کی بنیاد ہے اور دوسرے وہ طریق کار جس کے مطابق وہ پروگرام تکمیل تک پہنچ سکتا ہے۔ پروگرام کی کامیابی کے

لئے پہلی شرط یہ ہے کہ جس فارمولا پر وہ مبنی ہو، خود اس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت موجود ہو۔ اگر وہ فارمولا ہی غلط یا منافی

نتیجہ پیدا کرنے کا حامل ہے تو اس پر متفرع پروگرام کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد اس طریق کار میں یہ صلاحیت ہونی

چاہیے کہ وہ اس فارمولا کو پروان چڑھائے۔ دیکھئے! قرآن نے اس بنیاد اور اس پر اٹھی ہوئی عمارت کو چند الفاظ میں کس

حسن و خوبی سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ. خوشگوار نظریہ زندگی (جو وحی کی رو سے ملتا ہے)

اس میں اُبھرنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ **وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ** (۳۵/۱۰) ”اور عمل صالح اسے اوپر کو اٹھاتا ہے“ قرآن اس مجرّد حقیقت کو کھیتی کی محسوس مثال سے سمجھاتا ہے۔ (یہ قرآن کا عام انداز ہے)۔ کھیتی میں بنیادی چیز وہ تخمِ طیب ہے جس میں بڑھنے اور پھولنے پھلنے کی صلاحیت موجود ہو۔ (یہ وہ آئیڈیالوجی ہے جسے قرآن کی اصطلاح میں ایمان کہتے ہیں)۔ اس کے بعد وہ طریق کار ہے جس سے اس تخم کی نشوونما اس انداز سے ہوتی ہے کہ وہ اپنے وقت پر برگ و بار لاتا اور ثمر دار ہوتا ہے۔ اگر وہ تخم (بیج) مٹی کے تودے

کے نیچے دبا ہے تو اس سے کوئیل تک بھی نہیں پھوٹتی۔ اس مثال کی رو سے قرآن انسانی زندگی کے مقصود و منتہی کے متعلق کہتا ہے کہ **قَدْ أَفْلَحَ مَنْ ذَكَرَهُمْ** ”جس نے اپنی ذات کی نشوونما کر لی اس کی کھیتی پر واں چڑھ گئی“ **وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّهَا** (۹۱/۱۰-۹) ”لیکن جس نے اسے دبائے رکھا وہ تباہ و برباد ہو گیا“ لہذا (جیسا کہ سابقہ عنوان میں کہا جا چکا ہے) انسان کو اس کے اعمال کے بدلے میں خارج سے دی جانے والی جزایا سزا کا سوال ہی نہیں۔ اعمال کی جزا اور سزا خود ان اعمال کے اندر پوشیدہ اور ان کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ اچھے اعمال کا نتیجہ انسانی ذات کی نشوونما اور بُرے کاموں کا نتیجہ اس میں ضعف و اضمحلال یا انتشار (DISINTEGRATION) ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے اظہار کے لئے قرآن نے کہا ہے کہ **هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ** (۴/۱۳۴) ”ان کے اعمال خود اپنا بدلہ آپ بن کر ان کے سامنے آجاتے ہیں۔“

انسانی ذات کی نشوونما یا یوں کہئے کہ انسانی معاشرہ میں مستقل اقدار کو نافذ العمل کرنے کے راستے میں تخریبی قوتیں اور مفاد پرست عناصر روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں، ان قوتوں کا مقابلہ ضروری ہے۔ اسی کو کشمکشِ حق و باطل کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان سرکش عناصر کو راستے سے ہٹانے کے لئے

قوت صرف ہوگی۔ اب اگر صورت یہ ہو کہ جمع شدہ قوت صرف ہوتی رہے لیکن نئی قوت پیدا نہ ہو تو کچھ وقت کے بعد انسان میں تخریبی قوتوں کے مقابلہ کی تاب ہی نہیں رہے گی۔ قرآن کہتا ہے کہ جو نظامِ عمل اس نے تجویز کیا ہے اس میں اس کی صلاحیت ہے کہ جس قدر قوت اس مقصد کے حصول میں صرف ہو وہ اسے واپس لے آئے۔ عربی زبان میں **ثواب کے معنی** اسے ”ثواب“ کہتے ہیں۔ ثواب کے معنی ہیں لوٹ آنا۔ جتنا خرچ ہوا اتنا ہی واپس آجانا۔ استنباب

کا انگریزی میں ترجمہ (RESTORATION) ہوگا۔ لہذا قرآنی نظامِ عمل میں جس قدر توانائیاں حق کی مدافعت اور باطل کی شکست کے لئے صرف ہوتی ہیں وہ ساتھ ہی ساتھ (RESTORE) ہوتی رہتی ہیں۔

اب ایک اور مثال لیجئے۔ وبائی امراض (مثلاً انفلوئنزا وغیرہ) میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض لوگ اس کا فوراً شکار ہو جاتے ہیں اور بعض اس سے مامون رہتے ہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ جن لوگوں میں قوتِ مدافعت کمی ہوتی ہے وہ مرض

کے جرائم سے بہت جلد مغلوب ہو جاتے ہیں۔ جن میں یہ قوت زیادہ ہوتی ہے، تخریبی جرائم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ایسے وہابی امراض کی صورت میں ڈاکٹر کیا کرتا ہے؟ وہ ایسی تدابیر تجویز کرتا ہے جن سے لوگوں کی قوت مدافعت بڑھ جائے اور وہ تخریبی جرائم کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے۔ اسی طرح جب کوئی شخص ان جرائم سے مغلوب (یعنی بیمار) ہو جاتا ہے تو **مغفرت کے معنی** | ڈاکٹر اس کی قوت مدافعت کو بڑھاتا ہے۔ یہ قوت اس مریض کی تخریبی عناصر سے حفاظت کرتی ہے۔ اس عمل کو قرآن کی اصطلاح میں "مغفرت" کہتے ہیں۔ مغفرت کے معنی حفاظت کے

میں۔ مغفرت اس خود (HELMET) کو کہتے ہیں جسے سپاہی سر کی حفاظت کے لئے میدان جنگ میں پہنتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک اور مثال سامنے لائیں۔ آپ کسی گاؤں کی طرف جا رہے ہیں۔ راستے میں ایک مقام پر ایک دورا بنا آتا ہے جہاں سے آپ کا قدم غلط سمت کی طرف اٹھ جاتا ہے۔ میل بھر چلنے کے بعد آپ کو پتہ چلتا ہے کہ آپ غلط راستے پر جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آپ کی جس قدر توانائی اور وقت اس میل بھر کی مسافت طے کرنے میں صرف ہوا وہ سب رائیگاں گیا۔ قرآن سفر حیات میں انہی غلط رو مسافروں کے متعلق کہتا ہے: فَحِطَّتْ أَعْمَالُهُمْ (۱۸/۱۰۵) "یہ وہ ہیں جن کے کام بے نتیجہ رہے۔ رائیگاں گئے۔"

توبہ کے معنی | اپنی غلطی معلوم ہو جانے کے بعد آپ کیا کرتے ہیں؟ آپ پھر اُسی دورا سے پر واپس آجاتے ہیں جہاں سے آپ کا قدم غلط راستے پر پڑ گیا تھا۔ عربی زبان میں اس قسم کی واپسی کو توبہ کہتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ میل بھر کی واپسی کا یہ عمل منفیانہ (NEGATIVE) ہے۔ اس کا مثبت پہلو اس وقت شروع ہو گا جب آپ اُس دورا سے پر پہنچ کر صحیح سمت کی طرف چلنا شروع کر دیں گے۔ اگر آپ پہلے پیدل چلتے تھے اور اب کوئی سواری لے لیں، تو جو وقت اور توانائی غلط راستے پر چلنے میں صرف ہوئی تھی اس کی بچت ہو جائے گی۔ اب پورے طریق کار PROCESS کو قرآن تَابَ وَاصْلًا سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی غلط روش سے باز آ جانا اور اپنے اندر صحیح راستے پر چلنے کی مزید صلاحیت پیدا کر لینا۔

اگر ہم اسے مرض کی مثال کی رو سے سمجھنا چاہیں تو کہا جاسکتا ہے کہ "مغفرت" حفاظتی تدبیر (PREVENTIVE) اور "توبہ" اصلاحی تدبیر (CURATIVE) ہوتی ہے۔ یا مناسب تدبیر سے مرض کے حملہ کے بعد اس کے نقصان رساں اثرات سے محفوظ ہو جانا، بھی مغفرت کہلاتے گا۔ یہ ظاہر ہے کہ اس تمام طریق کار کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ اگر تعمیری نتائج مرتب کرنے والی تدابیر زیادہ موثر ہوں گی تو وہ تخریبی نتائج پیدا کرنے والے عناصر پر غالب آجائیں گی اور ان کے مضرت رساں اثرات کا ازالہ کر دیں گی۔ اس حقیقت کو قرآن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ الشَّرَّاتِ (۱۱/۱۱۳) "یاد

رکھو حُسن پیدا کرنے والے اعمال بگاڑ پیدا کرنے والی تدابیر کے اثرات کا ازالہ کر دیتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے۔
 اِنْ تَجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّمَّا تَنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُدْخِلَ
 كَرِيمًا (۴/۳۱)

اگر تم ان بڑے بڑے غلط کاموں سے بچتے رہو گے جن سے ہم نے تمہیں منع کیا ہے تو ہم تمہاری چھوٹی چھوٹی لغزشوں
 کے مضر اثرات کا ازالہ کر دیں گے اور تمہیں باشرط مقام میں داخل کر دیں گے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کی رو سے

(i) مقصد زندگی کسی عذاب سے بچھٹکارا (نجات) نہیں بلکہ انسانی ذات کی نشوونما سے موجودہ سطح زندگی سے بلند تر
 سطح کی طرف عروج و ارتقاء ہے۔

(ii) اس مقصد کے لئے انسان کو فرشتہ تصور نہیں کیا جاتا کہ اس سے کوئی لغزش سرزد نہ ہو۔ وہ انسان کے کمزور پہلوؤں
 پر نگاہ رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر تمہاری صلاحیتوں کا پلڑا جھکتا رہا تو وہ تمہاری کمزوریوں کا ازالہ کرے گا اور تم زندگی کی
 سیر بھی کے ایک درجہ اور اوپر چڑھ جاؤ گے۔ اس باب میں وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے۔

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ
 الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ فِي جَهَنَّمَ خَالِدُونَ ۝ (۲۳/۱۰۳-۱۰۴)

جس کسی کا پلڑا جھک جائے گا تو اس کی کھیتی پروان چڑھ جائے گی اور جس کا پلڑا اہلکال ہے گا تو یہ وہ لوگ
 ہوں گے جن کی ذات میں کمی ہے گی۔ یہ اگلے درجہ میں جانے کے قابل نہیں ہوں گے۔ اس لئے جہنم میں رہیں گے۔

اس حقیقت کو طالب علم کی مثال سے سمجھنا چاہیے۔ اگر سالانہ امتحان میں (مثلاً) ساٹھ فی صد پاس مارکس رکھے گئے ہیں تو جو
 لڑکا ساٹھ فی صد نمبر حاصل کر لیتا ہے اسے اگلی جماعت میں ترقی مل جاتی ہے۔ اس کی چالیس فی صد غلطیاں اس کی ترقی
 کی راہ میں حائل نہیں ہوتیں۔ لیکن جو لڑکا پچاس فی صد نمبر حاصل کرتا ہے اسے ترقی نہیں ملتی۔ اس کے حاصل کردہ نمبر اسے کچھ
 فائدہ نہیں دیتے۔ یہ اس لئے کہ آئندہ درجہ میں جانے کے لئے جو معیار مقرر کیا گیا ہے وہ اس پر پورا نہیں اترتا۔ اسے وہیں روک
 دیا جاتا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ اسکول کی مثال میں فیل شدہ طالب علم کے لئے اس کا موقع ہوتا ہے کہ وہ اسی کلاس میں
 رہ کر آئندہ سال کامیابی حاصل کر لے لیکن انسانی ذات کے سلسلے میں صورت یہ نہیں۔ اس میں بنیادی شرط یہ ہے کہ جس شخص
 نے اس ارضی زندگی میں اتنی صلاحیت حاصل کر لی جس سے وہ اگلی زندگی میں سفر کرنے کے قابل ہو گیا اسے ترقی مل جائے
 گی۔ جس نے اتنی صلاحیت حاصل نہ کی وہ ہمیشہ کے لئے رُک جائے گا۔

جنت اور جہنم | قرآن نے آگے بڑھ جانے والوں کی کیفیت کو "جنت" سے تعبیر کیا ہے اور رُک جانے والوں کی حالت کو "جہنم" سے۔ جہنم تو عبرانی لفظ ہے (اس کے معنی ہیں وہ وادی جس میں انسان ذبح کئے جاتے تھے)۔ عربی زبان میں جہنم کے لئے (قرآن نے) "جحیم" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جس کے بنیادی معنی روک دینے کے ہیں۔ کائنات میں نظریہ ارتقار کی رو سے بھی یہی ہوتا ہے۔ جو نوع (SPECIES) کسی منزل میں پہنچ کر آگے بڑھنے کی صلاحیت کھودیتی ہے، وہیں رُک جاتی ہے۔ لہذا یہ تصور کہ مگر میں کو کچھ عرصہ جہنم میں بھیج کر مرادی جائے گی اور وہ اپنی سزا کی مدت ختم کر لینے کے بعد جنت میں چلے جائیں گے، غیر قرآنی ہے۔ قرآن کی رو سے جہنم سے نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سو وُجوح میں ہے کہ

كَلِمًا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ أُعِيدُوا فِيهَا (۲۲/۲۲)

جب اہل جہنم اس مصیبت سے نکلنے کا ارادہ کریں گے تو انہیں اُسی میں لوٹا دیا جائے گا۔

اس کے برعکس "اہل جنت" کو شروع ہی سے اس سے دُور رکھا جائے گا۔ وہ جہنم کی سنسناہٹ تک نہیں سُن پائیں گے (۱۱-۲۱/۱۰۲)۔ یعنی جو لوگ اپنی ذات کو اس قدر نشوونما دے لیں گے جس سے وہ موجودہ زندگی سے اگلی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائے گی وہ اہل جنت ہوں گے۔ جن میں اتنی صلاحیت نہیں ہوگی وہ آگے بڑھنے سے روک دیئے جائیں گے۔ انہیں اہل جہنم کہیں گے۔

•••

تصریحات بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ قرآن کی رو سے

(i) یہ تصور غلط ہے کہ زندگی کا مقصود انسان کا کسی عذاب سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے۔

(ii) جو اور سزا کا یہ تصور بھی صحیح نہیں کہ جو اسے مراد کہیں خارج سے کوئی انعام ملنا اور سزا سے مراد

(PUNISHMENT) ہے۔ جو اور سزا اعمال کے فطری نتائج ہیں۔ ان کا اثر انسانی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔

(iii) جحیم سے مراد یہ ہے کہ انسان زندگی کے ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل نہیں ہوگا۔ اس لئے اس کی نشوونما رُک جائے گی۔ اور چونکہ وہ اس نقصان کے نتائج کو بڑی شدت سے محسوس کرے گا اس لئے اس کی زندگی عذاب میں ہوگی۔

(iv) اہل جنت وہ ہوں گے جو اپنے اندر زندگی کے مزید ارتقائی منازل طے کرنے کی صلاحیت پیدا کر چکے ہوں گے۔ یہ

اتنی بڑی کامیابی و کامرانی ہوگی جسے دیکھ کر ان کی روح میں بالیدگی پیدا ہو جائے گی۔

جو اور سزا کے اس فلسفہ کے مطابق کسی کا کسی کی سفارش سے چھوٹ جانا، یا کسی کا دوسروں کے گناہوں کا کفارہ

بن جانا۔ یا محض ایمان (بلا عمل) سے نجات حاصل ہو جانا۔ یا خدا کا "گناہوں کو بخش دینا" غیر قرآنی تصور ہے۔ زندگی کی سرفرازی یا انسانی اعمال کے فطری نتائج کا نام ہیں۔ یہ بطور "بخشش" کہیں سے نہیں مل سکتیں۔

اں ہشتے کہ خدائے بہ تو بخشد ہمہ ریح

تاجزلے عمل نشت جتاں چیزے ہست

"سفارش" اور "بخشش" کا تصور اس ذہنیت کا پیدا کردہ ہے جس کی رو سے خدا کوارضی بادشاہوں کے قالب میں ٹھالا جاتا ہے۔ قرآن نے جس خدا کا تصور دیا ہے اس کی ہر بات قاعدے اور قانون کی رو سے ہوتی ہے۔ اور قاعدے اور قانون میں سفارش اور بخشش کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔

گندم از گندم بر وید، جو ز جو

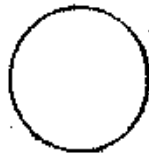
کا اہل قانون کا فرما رہتا ہے۔

اس قانون کی رو سے بخشش نہیں بلکہ "مغفرت" ہو سکتی ہے۔ اور جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے مغفرت سے مراد یہ ہے کہ انسان بڑے بڑے اعمالِ حسنہ کے ذریعے چھوٹی چھوٹی لغزشوں کے مضر اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیتا ہے۔ لہذا جسے عرف عام میں "بخشش" کہا جاتا ہے وہ بھی انسان کے اپنے اعمالِ حسنہ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ (اسے بخشش کے بجائے حفاظت کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ بلکہ "بخشش" کہنا ہی نہیں چاہیے۔ مغفرت بمعنی حفاظت کہنا چاہیے)۔

اس مقام پر اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ قرآن کریم نے بھی "نجات" کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن نجات کے معنی کسی عذاب سے چھوٹ جانے کے ہی نہیں کسی عذاب (تباہی) سے بالکل محفوظ رہنے کے بھی ہیں۔ اور یہی مفہوم قرآنی نجات کا ہے یعنی انسان کا اعمالِ صالحہ کے ذریعے تباہی سے محفوظ رہنا۔

قرآن کریم نے جنت کی زندگی کو "حیاتِ جاوداں" سے بھی تعبیر کیا ہے۔

آئندہ باب میں اس کے متعلق گفتگو کی جائے گی۔



باب ششم

حیات جاوداں

دُنیا میں کوئی انسان (سوائے اس کے جو اپنا دماغی توازن کھوے) مرنا نہیں چاہتا۔ وہ ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ تحفظِ خویش (PRESERVATION OF SELF) حیوانی جبلت کا تقاضا ہے۔ حیوانات کو چونکہ موت کا تصور ہی نہیں ہوتا اس لئے ان کے دل میں ہمیشہ زندہ رہنے کا خیال پیدا نہیں ہوتا۔ وہ صرف تحفظِ خویش چاہتے ہیں۔ انسان موت کا احساس رکھتا ہے اس لئے ہمیشہ زندہ رہنے کی آرزو اس کے دل میں چٹکیاں لیتی رہتی ہے۔ قرآن نے قصہ آدم میں بتایا ہے کہ ابلیس نے انسان کے اس جذبہ کو (EXPLOIT) کیا۔ ضمناً اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ قرآن میں بیان کردہ قصہ آدم کسی خاص فرد (آدم نامی کسی انسان) کی سرگزشت نہیں۔ وہ نمٹسی انداز میں خود آدمی کی سرگزشت ہے۔ وہ داستان ہے اس کے احوال و کوائف، جذبات و عواطف اور اس کی نفسیاتی اور تمدنی زندگی میں متضاد قوتوں کی کشمکش کی جسے قرآن نے نہایت خوبصورت استعاروں میں نہایت دل نشین پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس داستان میں ابلیس انسان کے ان جذبات کا ترجمان ہے جو اُسے قوانین خداوندی (یا مستقل اقدار) کے سامنے بھگنے سے روکتے ہیں اور یوں اسے تباہیوں اور بربادیوں کے جہنم میں کھینچ کر لے جاتے ہیں۔ اس قصہ کے ضمن میں قرآن نے استعارہ کے انداز میں بیان کیا ہے کہ۔

قَالَ يَا أَدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَى شَجَرَةٍ تَوَالِحُهَا وَمُلْكٌ لَّيْسَ لِي هَا فَكَلَّا مِنْهَا فَبَدَأَتْ
لَهُمَا سَوَاتِنُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفْنَ عَلَيْهِمَا مِنْ ذَمْرٍ الْجَنَّةِ ن (۲۰/۲۱)

لہذا ان امور کی تفصیل میری کتاب "ابلیس و آدم" میں ملے گی۔

ابلیس نے آدم سے کہا۔ کیا میں تمہیں ایک درخت کا پتہ نشان بتاؤں جس سے تمہیں حیاتِ جاوداں اور ایک ایسی مملکت مل جائے جس پر کبھی زوال نہ آئے؟

آدم اور اس کی بیوی نے اس درخت کا پھل کھایا۔ اس سے ان کا جنسی شعور پیدا ہو گیا جس سے انہیں شرم محسوس ہوئی اور وہ اپنے بدن کو باغ کے درختوں کے پتوں سے ڈھلپٹے لگ گئے۔

اولاد کی شکل میں حیاتِ جاوید | قرآن نے اس تمثیل میں بتایا ہے کہ انسان کے دل میں ہمیشہ زندہ رہنے کی آرزو مچلتی رہتی ہے۔ وہ کبھی مرنا نہیں چاہتا۔ لیکن وہ اپنی ہزار کوششوں

کے باوجود موت کی گرفت سے نہیں بچ سکتا۔ اس لئے وہ موت کے بعد زندہ رہنے کی ہوس کی تسکین اولاد کی شکل میں حاصل کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میرے مرنے کے بعد میرا نام میری اولاد کے ذریعے روشن رہے گا۔ اس درخت کے پھل پھول میرے ہی پھل پھول ہوں گے۔ (چنانچہ خاندانی تسلسل کے نقشے کا نام ہی "شجرہ نسب" ہوتا ہے)۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ فریب ہے جس سے انسان اپنے دل کو مطمئن کر لیتا ہے۔ ہر شخص کی زندگی منفرد (INDIVIDUAL) ہے۔ اس لئے کسی دوسرے فرد کے زندہ رہنے سے وہ شخص خود زندہ نہیں رہ سکتا خواہ وہ اس کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ حیاتِ جاوداں انسانی ذات کی نشوونما سے حاصل ہوتی ہے۔

اس مقام پر اتنی وضاحت ضروری ہے کہ قرآن نے جو کہا ہے کہ حیاتِ جاوید اولاد کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتی تو اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن بیوی بچوں کی محبت کو قابلِ نفرت قرار دیتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ وہ ان چیزوں کو وجہِ جاذبیت بتاتا ہے۔ سورہ آل عمران میں ہے:-

ثُمَّ يَنْزِلُ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَ الْبَنِينَ وَ الْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ
الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْأَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ ذَلِكَ مَتَاعَ الْحَيَاةِ
الدُّنْيَا ۗ وَ اللَّهُ بِعِنْدَآءِ حَسْبِ الْمُنَآبِ ۝ (۳/۱۴)

انسانوں کے لئے بیوی بچوں کی محبت، مال و دولت، پٹے ہوئے گھوڑے، مویشی، کھیتی باڑی، (غرضیکہ دنیا کی متاع و زیبائش کی چیزوں) کو وجہِ جاذبیت بنایا ہے۔ (لیکن اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ یہ چیزیں زندگی کا مقصود و منتہی نہیں ہیں) طبعی زندگی کی متاع میں، لیکن حقیقی زندگی کا خوشگوار ٹھکانہ تو انہیں خداوندی کی رُو سے حاصل ہوتا ہے (نہ کہ طبعی قوانین کے ذریعے)۔

وہ اس سے واضح یہ کرنا چاہتا ہے کہ بیٹے کی زندگی سے باپ کو حیاتِ جاوید نہیں مل سکتی حیاتِ جاوید حاصل

ارتقاءِ ذاتِ حیات جاوید | کرنے کا طریقہ اور ہے۔ یہ انسانی ذات کی نشوونما سے حاصل ہوتی ہے، اور موت اس کا ٹسٹ TEST ہے۔ قرآن میں ہے۔

الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا (۲۴/۲)

ہم نے موت اور زندگی کو اس لئے بنایا ہے تاکہ تمہیں نمود (ذات) کے مواقع مل جائیں۔ اور یہ دیکھا جاسکے کہ تم میں کون ایسے اچھے کام کرتا ہے جس سے اس کی ذات کی نشوونما ہو جائے۔

موت انسان کے طبعی جسم کو منتشر (DISINTIGRATE) کر دیتی ہے، لیکن اگر انسانی ذات کی مناسب نشوونما ہو جائے تو وہ جسم کی طبعی موت سے فنا نہیں ہوتی۔ سورہ نمل میں ہے:-

مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِمَّا يَحْتَسِبُ وَهُمْ مِنْ فَزَعٍ يَخْفَى أُولَئِكَ (۲۴/۸۹)

جو حسن عمل کو ساتھ لائے گا اسے (اس کے عمل سے) بہتر بدلہ ملے گا۔ یعنی یہ لوگ جسم کی موت کے وقت فنا کی دستبرد سے محفوظ رہیں گے۔

اس میں شبہ نہیں کہ موت کا جھٹکا بہت بڑا جھٹکا ہے۔ اس سے انسان کی حیات طبعی کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے منقطع ہو جاتا ہے (کیونکہ اس دنیا میں دوبارہ آنا نہیں)۔ لیکن جس کی ذات کی صلاحیتیں بیدار ہو چکی ہوں، یہ جھٹکا اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ لَا يَخْزُهُمُ الْفَرَاغُ الْأَكْبَرُ (۲۱/۱۰۳) اتنا بڑا انقلاب انگیز حادثہ نہیں افسردہ نہیں کر سکے گا۔

ان تصویحات سے واضح ہے کہ حیات جاوداں (IMMORTALITY) عمل اور ارادہ سے حاصل کی جاتی ہے، یونہی ہر فرد کو بطور استحقاق نہیں مل جاتی۔ صحیح عمل اور ارادہ (یعنی بطیب خاطر، بلند اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنا) حیوانی سطح زندگی کی چیز نہیں، اس لئے اس سطح پر حیات جاوداں کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ پروفیسر گیلووسے اس باب میں لکھتا ہے کہ:-

یہ خیال کہ ہر وہ مخلوق جو انسانی پیکر میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی غیر نشوونما یافتہ یا وحشی کیوں نہ ہو، حیات جاوید کی مستحق ہے، ایسا ہے جس کی ہم تائید نہیں کر سکتے۔ ایسا خیال کرنے کے لئے، خدا کی "اقتصادی اسکیم" کے متعلق اس علم سے کہیں گہرے علم کی ضرورت ہوگی جتنا علم انسان کو حاصل ہے ہم (LOTZE) کے اس خیال سے متفق ہیں کہ ہر مخلوق اس وقت تک زندہ رہے گی جب تک اس کا زندہ رہنا کائنات کے مفہوم و مدعا کے لئے ضروری ہو۔ جن چیزوں کا وجود کائناتی اسکیم کے محض عبوری دور کے لئے ضروری ہو گا وہ بالآخر

ختم ہو جائیں گی۔ (صفحہ ۵۴۲ - ۵۴۳)

موت کے بعد کی زندگی قرآن کی رو سے ایک حقیقت ثابتہ ہے۔ لیکن اس زندگی کی نوعیت و کیفیت کس قسم کی ہوگی، اسے انسانی شعور کی موجودہ سطح پر سمجھا نہیں جاسکتا۔ سورہ واقعہ میں ہے:-

فَمَنْ قَدَّرْنَا بِأَبْنَائِكُمُ الْمَمَاتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ ۖ عَلَىٰ أَنْ نُبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ وَ
نُنشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ (۶۰-۵۶/۶۱)

ہم نے تمہارے درمیان موت کے اندازے مقرر کر دیئے ہیں اور ہم اس سے عاجز نہیں کہ تمہاری موجودہ ہیئت کو بدل کر تمہیں ایسی صورت میں پیدا کریں جس کا تمہیں علم نہیں۔

جسم کے گل سڑ جانے سے انسانی ذات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ انسانی ذات جسم کا حصہ ہے نہ ہی قوانین طبعی کے تابع۔ چنانچہ قرآن مادی تصور حیات کو سامنے لاتے ہوئے کہتا ہے:-

قَالُوا إِذَا كُنَّا عِظَامًا وَرُفَاتًا ۖ إِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا ۗ قُلْ كُونُوا حِجَارَةً
أَوْ حَدِيدًا ۖ أَوْ خَلْقًا مِمَّا يَكْبُرُ فِي صُدُورِكُمْ فَسَيَقُولُونَ مَن يُعِيدُنَا ۖ قُلِ
الَّذِي فَطَرَ كُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ (۳۹-۱۴/۵۱)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم گل سڑ کر ہڈیوں کے ڈھانچے رہ جائیں گے اور اس طرح ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہم پھر بھی از سر نو پیدا کئے جائیں گے؟

ان سے کہو کہ تم (ہڈیاں تو ایک طرف) اگر پتھر ہو جاؤ یا لوہا یا ان سے بھی زیادہ کسی سخت شے میں تبدیل ہو جاؤ جس کے متعلق تم خیال کر سکتے ہو کہ اس کا زندہ ہونا بہت مشکل ہے تو پھر بھی زندہ کئے جاؤ گے۔

وہ کہتے ہیں کہ میں کون از سر نو زندہ کرے گا؟ ان سے کہو کہ وہی خدا جو تمہیں پہلی بار عدم سے وجود میں لایا تھا۔

یہ ظاہر ہے کہ زندگی پہلی بار طبعی قوانین کے مطابق عدم سے وجود میں نہیں آئی تھی۔ یہ اس تدبیر کے ماتحت وجود میں آئی تھی جس کا تعلق خدا کے عالم امر سے ہے۔ یعنی حیات (LIFE) مادی قوانین کی پیداوار نہیں۔ یہ خدا کے امر سے وجود میں آئی تھی۔ اسی طرح مرنے کے بعد کی زندگی بھی طبعی قوانین کے مطابق وجود میں نہیں آئے گی۔ خدا کے امر کے مطابق ظہور میں آئے گی۔ یہ سلسلہ ارتقاء کی اگلی کڑی ہے۔ جس میں انسانی ذات میں مزید استحکام اور ارتقاء پیدا ہو جائے گا۔ اور وہ موجودہ سہاروں سے بے نیاز ہو جائے گی۔ سورہ نوح میں ہے کہ خدا نے تمہیں مختلف منازل سے گزارتے ہوئے پیدا کیا ہے۔ اب زندگی کی موجودہ سطح کے بعد تم اس میں مزید وقار کے خواہاں کیوں نہیں ہوتے (۱۳-۱۴/۶۱)۔ وقار کے معنی بھاری پن کے ہوتے ہیں۔

یعنی ذات کا ارتکاز (CRYSTALLISATION) یا استحکام (SOLIDARITY)۔ یہ چیز مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ یعنی یہ نتیجہ ہوگی انسان کے اپنے حسن عمل کا۔

عمل اور ارادہ (MANIFEST) کرنے کا۔ جس میں ارادہ نہیں اس کا عمل، عمل ہی نہیں یا جس عمل کے پیچھے ارادہ نہیں اس کے نتائج کا وہ شخص ذمہ دار نہیں۔ نہ مجبوری کی نیکی، نیکی ہوتی ہے، نہ بدی، بدی۔ لہذا جو صاحب ارادہ نہیں، اس کی ذات کے ضعف و استحکام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو صاحب ارادہ، اپنے اختیار و ارادہ سے غلط روش اختیار کر لیتا ہے اور اس طرح اس کی ذات کی نشوونما نہیں ہو پاتی۔ طبعی موت کے بعد وہ بھی زندہ ہوگا لیکن جیسا کہ سابقہ باب میں بتایا جا چکا ہے اس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں ہوگی۔ اسے جہنم کی زندگی کہا گیا ہے جس کے متعلق قرآن میں ہے کہ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ (۸۴/۱۳) اس میں نہ وہ مردوں میں شمار ہوں گے نہ زندوں میں نہ موت آئے گی نہ زندگی نصیب ہوگی۔ موت اس لئے نہیں کہ وہ طبعی موت کے بعد زندہ کر دیئے گئے۔ زندگی اس لئے نہیں کہ زندگی نام ہی حرکت و ارتقار کا ہے۔ جس زندگی میں نشوونما نہیں وہ زندگی، زندگی نہیں۔ قرآن میں ہے کہ ایسا شخص حسرت سے کہے گا کہ يَلَيْتُنِي قَدَّامْتُ لِحَيَاتِي (۸۹/۲۳) ”اے کاش! میں نے اپنی زندگی کے لئے پہلے سے کچھ بھیج دیا ہوتا!“ ان کے برعکس اہل جنت حیات جاوداں کے مالک ہوں گے۔ وہ کہیں گے کہ

أَفَمَا نَحْنُ بِمَعْدَتَيْنِ (۳۷/۵۸)

ہم پہلی موت کے بعد (جو دنیا کی زندگی میں آگئی) مرنے والے نہیں۔

وہ زندہ اور متحرک ہوں گے اور زندگی کی مزید ارتقائی منزلیں ان کے سامنے روشن ہوتی چلی جائیں گی۔ يَسْعَىٰ نُورُهُمْ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ (۵۷/۱۲) ”ان کا نور آگے آگے اور دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا۔“ انگریزی زبان میں یوں سمجھو کہ اہل جہنم کی زندگی محض (SURVIVAL AFTER DEATH) ہوگی اور اہل جنت کی زندگی

(IMMORTALITY) جو ہر انسان کو بطور استحقاق نہیں ملے گی بلکہ اسے اپنے حسن عمل سے حاصل کرنا ہوگا

(SURVIVAL) غلط روش زندگی کے تباہ کن نتائج کے احساس شدید کے لئے ہے اور (IMMORTALITY)

زندگی کی مزید اور نہایت خوشگوار ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جانے کے لئے۔

مادی تصور حیات انسان کو یہی بتاتا ہے کہ

مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ (۲۵/۲۳)

زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے ہم مرتے ہیں اور پیدا ہوتے ہیں اور مرد و زمانہ ہمیں ہلاک کر دیتا ہے۔
لیکن قرآنی تصور حیات یہ دکھاتا ہے کہ اگر تم اپنی ذات کی قوتوں کو بیدار کر لو تو تم "مادی چار دیواریوں سے نکل کر بہت آگے
جاسکتے ہو" (۵۵/۳۳)

دونوں زندگیاں یکساں نہیں | یہ بنیادی وجہ ہے کہ ان دو متضاد نظریاتِ زندگی رکھنے والوں کی نہ
زندگی ایک جیسی ہو سکتی ہے نہ موت۔

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
سَوَاءً مَحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ (۲۵/۲۱)

جو لوگ ناہمواریاں پیدا کرتے ہیں وہ خیال کئے بیٹھے ہیں کہ ہم انہیں ان لوگوں جیسا بنا دیں گے جو مستقل
اقدار پر یقین رکھتے ہیں اور ہمارے تجویز کردہ صلاحیت بخش پر دو گرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔

قطعاً نہیں! ان کی زندگی ایک جیسی ہو سکتی ہے نہ موت۔ لکننا غلط اور بُرا ہے وہ فیصلہ جو یہ لوگ اپنے
متعلق کرتے ہیں۔

یہ وجہ ہے کہ مومن کے نزدیک موت کوئی خوف کی چیز نہیں ہوتی۔ وہ جانتا ہے اور اس پر یقین رکھتا ہے کہ سانس کے بند
ہو جانے سے انسان مر نہیں جاتا اس کے سامنے زندگی کی مزید ارتقائی منازل
مومن موت سے نہیں ڈرتا | کے راستے کھل جاتے ہیں۔ لہذا، موت اس کے نزدیک بندیوں کا زینہ ہوتی

ہے۔ اقبال کے الفاظ میں

دل اندر سینہ گوید دلبرے ہست متاعِ آفریں غارت گرے ہست
بگو شم آند از گردوں دم مرگ شگوفہ چوں فروریز و برے ہست

اور یہی وجہ ہے کہ قرآن نے موت کو معیارِ صداقت قرار دیا ہے۔ وہ یہود (مخالفین) سے کہتا ہے کہ فَتَمَنُّوا الْمَيِّتَ إِنَّ
كُنْتُمْ صَادِقِينَ (۲/۹۳) "اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو حق کی مدافعت میں مرجانے کی تمنا کر کے دکھاؤ" کسی مستقل
قدر کی حفاظت میں جان وہی دے سکتا ہے جسے اس امر کا یقین ہو کہ اس طرح مرجانے سے انسان کو حیاتِ جاوید حاصل ہو
جاتی ہے یہی جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ ۚ وَ لَكِن لَّا تَشْعُرُونَ (۲/۱۵۲)

جو اللہ کی راہ میں جان سے دیں ان کے متعلق یہ مت کہو کہ وہ مر گئے۔ وہ زندہ ہیں لیکن تم اپنے شعور کی موجودہ

سطح پر ان کی زندگی کی کیفیت و ماہیت کو نہیں سمجھ سکتے۔

یہ ہے وہ طریق جس سے انسان کی ہمیشہ زندہ رہنے کی آرزو پوری ہوتی ہے۔ اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ انسان کی حیات جاوداں اس طرح ابدی نہیں ہو سکتی جس طرح ذات خداوندی ابدی ہے۔ لیکن اپنے شعور کی موجودہ سطح پر ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ انسانی ذات کا منتہی کیا ہوگا۔ اور جب یہ ذات خداوندی کی طرح ابدی نہیں اور نہ ہی خدا کی ذات کا جزو ہے۔ تو پھر اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس سلسلے میں قرآن کریم صرف اتنا بتاتا ہے کہ انسانی جسم کے فنا ہو جانے کے بعد انسانی زندگی اپنے مزید ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔ اس کے بعد کی کیفیات سے نہ وہ بحث کرتا ہے اور نہ ہی ہم کچھ کہہ سکتے ہیں۔ یہ سوال ہمارے ادراک کی موجودہ حد سے ماورا ہے۔ ایسے ہی جیسے زندگی اور کائنات کے آغاز کا مسئلہ ہمارے سرحد ادراک سے ماورا ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ حیات بعد الممات ایک حقیقت ہے جس پر ایمان اسلام کا بنیادی مطالبہ ہے۔ یہ درحقیقت قانون مکافاتِ عمل ہی کی بڑھی ہوئی شکل کا نام ہے۔ زندگی اگر اسی دنیا کی زندگی ہو تو پھر دین کا سارا قصور بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی عمارت اٹھتی ہی انسانی ذات، قانون مکافاتِ عمل اور تسلسل حیات کے ایمان پر ہے۔

اس وقت تک ہم زندگی کے اس گوشے کے متعلق بحث کر رہے ہیں جس کا تعلق مرنے کے بعد کی دنیا سے ہے لیکن قرآن کہتا ہے کہ انسانی اعمال کے نتائج کی نمود اسی دنیا کی زندگی میں شروع ہو جاتی ہے۔ یعنی جنت اور جہنم کی تعمیر کے اس دنیا میں جنت اور جہنم | سلسلہ کا آغاز یہیں سے ہو جاتا ہے۔ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے اس دنیا میں بھی جنتی معاشرہ قائم ہو جاتا ہے اور یہ وہ جنت ہے جسے قرآن کم اہمیت نہیں دیتا۔ لیکن یہ ان لوگوں کے ہاتھوں سے متشکل ہوتا ہے جن کی ذات کی صلاحیتیں ابھرنا شروع ہو جاتی ہیں۔ لہذا ہم آئندہ باب میں بتائیں گے کہ انسانی ذات کی نشوونما کس طرح سے ہوتی ہے۔ اور جن افراد کی ذات کی نمود شروع ہو جاتی ہے ان کے ہاتھوں جنتی معاشرہ کا قیام کس طرح عمل میں آتا ہے۔



انسانی ذاکہ نشوونما کا اصول

سابقہ ابواب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ دین کا نقطہ ماسکہ ہے انسانی ذات پر یقین اور اس کا مقصود ہے اس ذات کی نشوونما۔ عربی زبان میں نشوونما کو ربوبیت کہتے ہیں۔ اس سے مراد وہ تدبیر یا طریق کار ہوتا ہے جس کی رُف سے کسی شے کو اس کے نقطہ آغاز سے آہستہ آہستہ بتدریج اس کے نقطہ تکمیل تک پہنچا دیا جائے۔ آپ خارجی کائنات میں دیکھئے، ہر طرف اس قانون ربوبیت کی کار فرمائی نظر آئے گی۔ (قرآن کی پیش کردہ کھیتی کی مثال میں) ایک بیج میں اسی قسم کا درخت بن جانے کی صلاحیتیں مضمر ہوتی ہیں جس کا وہ بیج ہے۔ اگر اس بیج کی مناسب نشوونما (ربوبیت) کی جائے تو یہ مضمر صلاحیتیں مشہود ہوتی چلی جائیں گی۔ بیج سے کوئی پھول پھوٹے گی۔ کوئی پھول سے پودا بنے گا۔ پودا پروان چڑھ کر تناور درخت کی شکل اختیار کر لے گا۔ اس کے بعد — (اس کے لئے مختلف بیجوں کے فرق کے سمجھنے کی ضرورت ہے)۔ پھول کے بیج کا منتہی پھل بن جانا ہے۔ جس میں صرف پتے ہی پتے ہوتے ہیں۔ چنبیلی میں پتوں کے علاوہ پھول بھی ہوں گے۔ آم کے پیر میں پھل بھی لگیں گے۔ اس طریق عمل کا منتہی یہ ہوگا کہ ان پیروں میں پھر بیج پیدا ہوں جن سے یہ سلسلہ بدستور قائم رہے۔ یعنی بیج کا منتہی اپنے جیسے بیج بنانا ہے۔ نباتات سے آگے بڑھے تو حیوانات کی بھی یہی کیفیت ہے۔ حیوانی زندگی کا منتہی بھی یہی ہے کہ ایک حیوان اپنے جیسا اور حیوان پیدا کرے۔ گویا زندگی کی حیوانی سطح تک ایک گردشِ دو لابی (CYCLIC ORDER) قائم رہتا ہے۔ یہی اس سلسلہ کی آخری حد ہے، کوئی شے اس حد سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ (۱۷/۸۴) ”ہر شے اس حد تک جاسکتی ہے جس تک جانا اس کے لئے مقصود ہے۔“ یہی حد اس شے کی (DESTINY) کہلاتی ہے۔

جہاں تک انسان کا تعلق ہے جب اس کی زندگی محض حیوانی سطح تک رہے تو اس میں بھی سلسلہ تولید و تناسل

(PROCREATION) سے ایک چکر (CYCLE) قائم ہو جاتا ہے۔ جس میں ہر فرد کی زندگی کا منتہی اپنے جیسا فرد (بیٹا یا بیٹی) پیدا کرنا رہ جاتا ہے۔ لیکن جب زندگی کو (حیوانی سطح سے بلند کر کے) انسانی سطح پر لائیں تو اس میں مقصود و منتہی عمل تولید کے ذریعے اپنے جیسا اور فرد

انسانی زندگی کا مقصود

پیدا کرنا نہیں ہوتا، انسانی ذات کی نشوونما کے آگے بڑھنا اور بلند ہوتے چلے جانا ہوتا ہے۔ خدانے جب اپنے متعلق کہا تھا کہ لَعَلَّ يَذَّكَّرُ ۝۵۰ لَعَلَّ يُؤْتُوا لَكَ ۝۵۱ (۱۱۲/۳-۲) نہ وہ سلسلہ تولید سے اپنے جیسا اور پیدا کرتا ہے اور نہ خود سلسلہ تولید کی پیداوار ہے۔ تو اس سے ذات کی اسی خصوصیت کی طرف اشارہ مقصود تھا۔ لہذا، جب زندگی، انسانی سطح پر پہنچ جاتی ہے تو اس میں کاروانِ حیات کسی چکر میں سفر نہیں کرتا۔ صراطِ مستقیم (سیدھی اور توازن بدوش راہ) پر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

کائنات میں نظامِ ربوبیت کے سلسلہ میں ایک بات اور بھی غور طلب ہے۔ بیج کی نشوونما کے لئے مٹی، پانی، ہوا، حرارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اگر آپ کسی بیج کو میز پر ایک طرف رکھ دیں۔ دوسری طرف تھوڑی سی مٹی ڈال دیں۔ ایک کٹورے میں پانی بھر کر رکھ دیں۔ ہوا اور حرارت (سورج کی روشنی) کمرے میں موجود ہی ہوگی۔ ان تمام عناصر کی موجودگی کے باوجود اس بیج سے کوئی نپل نہیں پھوٹے گی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ عناصر ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں۔ اس سے واضح ہے کہ نظامِ ربوبیت میں کسی شے کی نشوونما کے لئے مختلف عناصر کا باہمی تعاون بلکہ ادغام ضروری ہے۔

انسانی ذات کی نشوونما بھی خانقاہیت کی انفرادی زندگی میں نہیں ہو سکتی۔ یہ تصویر یکسر غیر قرآنی ہے۔

ذات کی نشوونما اجتماعی نظام میں ہوتی ہے

قرآن کی رو سے فرد کی ذات کی ربوبیت معاشرہ کے اندر رہتے ہوئے، باہمی تعاون و تناصر بلکہ قلوب کے باہمی اشتلاف (ایک دوسرے میں جذب ہو جانے) سے ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لئے قرآن ایک اُمت کی تشکیل کرتا ہے (۲/۱۴۳) اور اس اجتماعی نظام میں افراد کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔

اشیائے کائنات کے نشوونما کے سلسلے میں ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے۔ (بیج والی مثال میں) اگر بیج پر مٹی زیادہ

لے جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے، سلسلہ تولید، افزائش و بقائے نسل انسانی کے لئے ضروری ہے۔ جو کچھ ہم اس مقام پر کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ افزائش نسل انسانی زندگی کا مقصود و منتہی نہیں۔ اس کا منتہی انسانی ذات کی نشوونما ہے۔

توازن و تناسب کی ضرورت | پڑ جائے۔ پانی کم یا زیادہ دسے دیا جائے۔ ہوا تیز چل پڑے۔ حرارت کی کمی بیشی ہو جائے تو کبھی بیج کی نشوونما نہیں ہو سکے گی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان

تمام عناصر میں خاص توازن اور تناسب ہے۔

یہی صورت انسانی ذات کی نشوونما کی ہے۔ بنگاہِ نعمت دیکھنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ایک تو انسانی ذات مختلف صفات کی جامع ہے۔ انسانی ذات کیا، خود خدا کی ذات، جس کی صفات کا پر تو انسانی ذات میں منعکس ہوتا ہے۔ مختلف صفات کی حامل ہے۔ بالفاظِ دیگر، ذات میں مختلف صفات مضمحل رہتی ہیں۔ ان صفات میں خاص تناسب و توازن کا ہونا ضروری ہے۔ قرآن نے صفاتِ خداوندی کے لئے "الاسما الحسنى" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ جس بہترین تناسب ہوتا ہے اس لئے انہیں حسین ترین (الحسنى) قرار دیا گیا ہے۔ اس جہت سے قرآن نے ان اعمال کو جن سے انسانی ذات کی صفات کی نمود خاص تناسب کے ساتھ ہو، اعمالِ حسنہ یا الحسنات سے تعبیر کیا ہے۔

طبیعی جسم کی پرورش کے لئے قانون یہ ہے کہ ہر فرد کے جسم کی پرورش اس شے سے ہوتی ہے جسے وہ خود کھاتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ اچھی خوراک تو میں کھاؤں اور پرورش میرے بھائی کے جسم کی ہوتی جائے۔ یہ وہ "خود غرضی" (SELFISHNESS)

ہے جس پر طبیعی زندگی کا دار و مدار ہے۔ طبیعی سطح پر کوئی فرد اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے برعکس، انسانی ذات کی نشوونما اس چیز سے ہوتی ہے جسے وہ دوسروں کی نشوونما کے لئے دے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں سے حیوانی (یعنی طبیعی) زندگی اور انسانی (یعنی ذات کے تصور پر مبنی) زندگی کے راستوں میں نمایاں فرق ہو جاتا ہے۔ طبیعی زندگی میں جسم انسانی کے لئے "لینا" ضروری ہے لیکن انسانی ذات کی نشوونما کا اصول "دینا" ہے۔ اول الذکر کے لئے اپنے آپ کو دوسروں پر ترجیح دینا ضروری ہوتا ہے۔ اگر آپ اور آپ کا ہمسایہ بھوکے ہوں اور روٹی ایک ہی ہو تو جب تک آپ اپنے آپ کو ہمسایہ پر ترجیح دے کر وہ روٹی خود نہ کھائیں گے آپ کے جسم کی پرورش نہیں ہو سکے گی۔ لیکن انسانی ذات کی نشوونما کے لئے دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دینا ضروری ہوتا ہے۔ جو لوگ اس بیج پر زندگی بسر کرتے ہیں ان کے متعلق قرآن میں ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں۔

يُؤْتِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۗ وَمَنْ يُوقِ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۗ (۵۹/۹)

جو اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اس سے انہیں خود تنگی میں گزارہ کیوں نہ کرنا پڑے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو دوسروں پر ترجیح دینے سے بچ جاتا ہے تو انہی لوگوں کی کھیتی

پر دان چڑھتی ہیں۔

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ مَنْ يَتَّقِ شُرَكَاءَ نَفْسِهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۵۹/۹) جو "شخِ نَفْس" سے بچ جائے وہی کامیاب ہو سکتا ہے۔ "شخِ نَفْس" کسے کہتے ہیں اسے سمجھنے کے لئے اس منظر کو سامنے لائیں کہ سخت گرمی کا موسم ہے پانی کا نل صرف دو گھنٹے کے لئے کھلے گا اور اس سے پانی بہت کم مقدار میں نکلے گا۔ پانی لینے والوں کو دیکھئے تو یہاں سے وہاں تک خالی برتنوں

کی قطار نظر آئے گی۔ ایسے میں ہر شخص کی خواہش (بلکہ کوشش) یہ ہوگی کہ وہ دوسروں کو دھکیل کر پیچھے ہٹا دے اور خود آگے بڑھ کر پانی بھر لے۔ اس جذبہ کو "شخِ نَفْس" کہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ جو شخص اس جذبے سے محفوظ رہے اور دوسروں کو پیچھے دھکیلنے کی بجائے خود پیچھے ہٹ جائے اور زیادہ ضرورت مند کو پہلے پانی لے لینے دے اس کی کھیتی پر دان چڑھے گی۔ طبیعی قانون کی رو سے کھیتی اس کی پر دان چڑھتی ہے جس کی زمین کو بروقت پانی مل جائے۔ اس کے لئے گاؤں میں قتل تک نوبت پہنچ جاتی ہے) لیکن قرآنی نظام ربوبیت کی رو سے اس فرد کی ذات کی کھیتی برگ بار لاتی ہے جو پانی کا رخ دوسروں کی کھیتوں کی طرف موڑ دے۔ "دوسروں" سے مراد صرف اپنی جماعت، اپنی پارٹی، اپنی قوم، اپنے ملک، اپنے مذہب کے افراد نہیں۔ اس میں تمام نوع انسان کے وہ افراد (بلا لحاظ مذہب، رنگ، زبان، قوم، ملک سب شامل ہیں)

نوع انسانی کے لئے نفع بخش

جن کی ضرورت زیادہ ہو۔ اس کے لئے قرآن کا بنیادی اصول یہ ہے کہ

وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَمَا كُنَّا فِي الْأَرْضِ حٰٓمِٓمًا (۱۳/۱۷)

دنیا میں بقا اس عمل کے لئے ہے جو تمام نوع انسان کے لئے نفع بخش ہو۔

یہ ہے قرآن کی رو سے انسانی ذات کی نشوونما کا بنیادی اصول۔ اس اصول کے مطابق قرآن ایسا معاشرہ متشکل کرتا ہے جس میں ہر فرد دوسرے افراد کی نشوونما کے لئے مصروفِ سعی و عمل رہتا ہے۔ اور دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس لئے کرتا ہے کہ اس کا ایمان ہے کہ اس سے اس کی ذات کی نشوونما ہوگی۔ اور یہی اس کی زندگی کا منتہی و مقصود ہے۔

مغربی مفکرین کی تائیدات | یہی وہ حقیقت ہے جسے مغرب کے مفکرین اور محققین نمایاں طور پر سامنے لارہے ہیں۔ راشڈل (HASTINGS RASHDALL)

جس کی کتاب (THE THEORY OF GOOD AND EVIL) کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے اور جو اخلاقیات کے موضوع پر اہم مقام رکھتی ہے، اس ضمن میں لکھتا ہے۔

راشدل | مثالی پنج زندگی یہ ہے کہ میں کسی دوسرے کی بہبود کے لئے کچھ کروں اور اس میں اپنی منفعت محسوس کروں اور وہ میری بہبود کے لئے کچھ کرے اور اس میں اپنی بھلائی دیکھے۔
بس یہ ہے حقیقی مثالی زندگی۔ (جلد دوم، صفحہ ۷۷)

انسانی تہذیب کا مشہور مورخ (ROBERT BRIFEAULT) اپنی شہرہ آفاق تصنیف (THE MAKING OF HUMANITY) میں لکھتا ہے کہ

برفا | حقیقت یہ ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما کے جو مخصوص طریقے اور شرائط ہیں ان کا تقاضا ہے کہ ایک فرد کی نشوونما انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی۔ اس کی نشوونما اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب تمام انسانیت کی نشوونما ہو رہی ہو۔ (صفحہ ۲۶۰)

یہی مصنف دوسرے مقام پر لکھتا ہے۔

انسانی ارتقاء کا حقیقی مفہوم "تعمیر انسانیت" ہے۔ یہ ایک ایسی ٹھوس حقیقت ہے جس کی تعبیر "قانونِ اخلاق" کی اصطلاح سے نہیں ہو سکتی۔ اسے مفادِ غیر کا جذبہ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ نہ ہی یہ وہ چیز ہے جسے عام طور پر "نیکی کی خاطر یا احسان، احسان کی خاطر" جیسے الفاظ سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ یہ تو خود انسان کی اپنی ذات کی نشوونما کی لاینفک شرط اور غیر متبدل تقاضے کا نام ہے۔ (صفحہ ۲۶۱)

"دوسروں کی نشوونما" کی اہمیت کس قدر ہے اس کے متعلق یہ مفکر دوسری جگہ لکھتا ہے۔

فطرت کی میزان میں وہی عمل، عمل خیر ہے جو انسانیت کی نشوونما میں ممد و معاون ہو۔ اور وہ عمل عملِ شر ہے جو اس کی نشوونما کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرے، اس کی ترقی میں مانع ہو اور اس سے ٹکرائے۔ وہی زندگی زندگی کہلانے کی مستحق ہے جو انسانیت کی نشوونما کا ساتھ دیتی ہو۔ جو اس راہ سے ہٹی ہوئی ہو وہ زندگی بیکار ہے اور جو اس راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو جائے وہ مردود و مطرد ہے۔ اخلاقی اقدار کا یہی فطری مطلق اور حقیقی معیار ہے۔ فطرت اُس دلی کی زندگی کو پرکھتا ہے جتنا وزن بھی نہیں دیتی جو نوعِ انسان کی ربوبیت کے لئے کچھ نہیں کرتا۔ (اس کے زہر و جہاد کی پوری کی پوری زندگی) اس فرد کے ایک عمل کے برابر بھی قیمت نہیں رکھتی جو نسلِ انسانی کے مستقل ارتقاء کے لئے کوشاں ہو۔ (فطرت ایسے ولی کے اعمال

کے لئے میزان ہی کھڑی نہیں کرتی)۔ فطرت جس عمل کی قیمت مقرر کرتی ہے وہ عمل ہے جو انسانی سطح کو بلند کرنے میں معاون ہو۔ وہ ایسے عمل کو نقشِ دوام عطا کر دیتی ہے۔ (صفحہ ۳۵۲)

جیسا کہ پہلے لکھا ہے قرآن اسی عمل کو بقائے دوام کا مستحق قرار دیتا ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کا مخاطب ہی عالمِ انسانیت سے ہے۔ اس پر دو گرام کا ثبوتی یہ ہے کہ تمام نوعِ انسان کو ایک تمام انسانیت کا ارتقاء

تمام انسانیت کا ارتقاء

نوعِ انسان ایک امت میں۔ اس کا انقلاب آفریں اعلان اور زندگی بخش نصب العین ہے۔ وہ پورے کے پورے عالمِ انسانیت (HUMANITY) کو ایک فرد تسلیم کرتا ہے اور واضح الفاظ میں کہتا ہے۔ مَا خَلَقَكُمْ وَلَا يَعْشِقُكُمْ إِلَّا كَنْفُسٍ وَأَلْحِدَاةٌ (۳۱/۲۸) تمہاری۔ پوری نوعِ انسان کی۔ تخلیق اور نشاۃ ایک فرد کی طرح ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے وہ جس نظامِ ربوبیت کا نقشہ پیش کرتا ہے اس کے مرکز (کعبہ) کے متعلق کہتا ہے کہ اُسْرَقِيَا مَا لِلنَّاسِ (۵/۹۷) بنایا ہے۔ یعنی پوری انسانیت کے قیام کا موجب۔ لہذا جب وہ یہ کہتا ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب وہ دوسروں کی نشوونما کی فکر کرے تو یہ نشوونما اپنی جماعت تک محدود نہیں ہوتی۔ اس میں عالمِ انسانیت کے تمام افراد (بلا تفریقِ مذہب و ملت اور بلا تمیزِ رنگ و نسل) شریک ہوتے ہیں۔ پروفیسر و ہائٹ ہیڈ (A.N. WHITE HEAD) نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا جب اس نے کہا تھا کہ

زندگی کی تکمیل کارا اپنے مقاصد کے ماوراء مقاصد کے حصول میں ہوتا ہے۔ یعنی اپنے آپ سے آگے بڑھ کر نوعِ انسان کی تکمیل میں۔

(ADVENTURES OF IDEAS; P-373)

میسن (J.W.T. MASON) اس باب میں کہتا ہے۔

انسان کا ایک مقصد تو اپنی نشوونما ہے لیکن اس کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ دیگر افرادِ انسانیت کی نشوونما بھی زیادہ حد تک ہو جائے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان پہلے مقصد کے حصول میں جہد ہو کر دوسرے مقصد کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ آپ ایسے شخص کو انفرادی طور پر نیک کہنا چاہیں تو کہہ لیں لیکن انسانیت سے نقطہ نگاہ سے یہ کبھی نیک نہیں کہلا سکتا۔ بلند ہستیاں وہ ہیں جو ان دونوں مقاصد کو باہم مدغم کر دیں۔

(CREATIVE FREEDOM; P-226)

انسانی ذات کی نشوونما کے لئے قرآن جو پروگرام تجویز کرتا ہے اس کی رُو سے یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک فرد اپنی ذات کی تکمیل میں ایسا جذب ہو جائے کہ وہ دوسروں کی نشوونما کو نظر انداز کرے۔ اس کا پروگرام ہی یہ ہے کہ جس قدر کوئی فرد دوسروں کی نشوونما کرتا ہے اسی قدر اس کی اپنی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ کائنات نے کہا تھا کہ تم ایک ایسے معاشرے کے فرد بن جاؤ جس میں ہر فرد دوسرے افراد کے مفاد کی قیمت اپنے مفاد کی قیمت کے برابر سمجھتا ہے۔ (QUOTED BY RASHDAL, VOL. I, P-133)

لیکن قرآن اس سے بھی ایک قدم آگے جاتا ہے اور یُوْتِرُزْنَ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ ذٰلَکَ لَوْ کَانَ بِہُمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹) کا اصول پیش کرتا ہے۔ یعنی دوسروں کے مفاد کو اپنے مفاد پر ترجیح دینا۔

مکسلے (JULIAN HUXLEY) جو انسانوں کے خود ساختہ لیکن خدا کی طرف منسوب کردہ مذاہب کے ہاتھوں جس قدر تنگ آچکا ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ایسے مذہب کی تلاش میں ہے جس کی بنیاد وحی پر نہ ہو۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے اس نے جو کتاب لکھی ہے اس کا نام ہی (RELIGION WITHOUT REVELATION) رکھا ہے۔ اسے جس مذہب کی تلاش ہے اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

مکسلے میرا عقیدہ ہے کہ انسان کے تمام فرائض کو ان چند الفاظ میں سمٹایا جاسکتا ہے یعنی بہت زیادہ زندگی۔ جتنی اپنے لئے اتنی ہی اپنے ہمسایہ کے لئے۔ میرا یقین ہے کہ مشقت پریشانیوں اور تکالیف کے ساتھ ہی سہی انسان اس قابل ضرور ہے کہ وہ ایسا کر سکے۔

جو مذہب اس اصول کو بطور نصب العین اپنے سامنے رکھے اور پھر انسانی ممکنات اور موانعات دونوں کا جائزہ لیتے ہوئے اس نصب العین کی کشادہ نگہی سے تعبیر کرے، وہی مذہب حق و صداقت پر مبنی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس لئے کہ وہ مذہب زندگی کے ساتھ دوش بدوش چلے گا۔ وہ زندگی کی نشوونما کی حوصلہ افزائی کرے گا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ خود اس کی اپنی نشوونما بھی ہوتی چلی جائے گی۔

میں اس قسم کے مذہب حیات بخش کا قائل ہوں۔ (صفحہ ۱۱۳)

مکسلے کو کون بتاتے کہ اس قسم کا مذہب اُسے ”وحی“ کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ اس کی دشواری یہ تھی کہ اس نے انسانوں کے خود تراشیدہ مذہب کو مبنی بروحی مذاہب سمجھ لیا۔ آج اس آسمان کے نیچے وحی اپنی منزلہ اور حقیقی شکل میں قرآن سے باہر اور کہیں نہیں مل سکتی۔ خدا کا پیغام انہی کے لئے ہے جن میں زندگی کی صلاحیت ہے۔ لِنُنْزِلَ نَبِیًّا مِّنْکُمْ لَمَّا کَانَ حَیْثَا (۳۶/۵۰) ”اس کی آگہی کے لئے جس میں شرارِ زندگی موجود ہے۔“ اور اس کے دینے

ہوتے پر وگرام کے اتباع سے اس زندگی میں مزید اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ
 يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَإِلَىٰ سُوْلِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ (۲/۲۱۳)
 اے جماعتِ مومنین! خدا اور رسول کی اس دعوت پر لبیک کہو جو تمہیں اس چیز کی طرف بلا رہی ہے جو تمہیں زندگی
 عطا کرے۔

لیکن (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) زندگی اسی کو مل سکتی ہے جو دوسروں کے لئے سامانِ زندگی مہیا کرنے کی فکر کرے، اور
 اس کے لئے ان سے کسی معاوضہ کا طلبگار نہ ہو۔ معاوضہ تو ایک طرف شکر یہ تک کا بھی خواہاں نہ ہو۔ وہ جن کے لئے سامانِ
 زیت فراہم کرے ان سے واضح الفاظ میں کہہ دے کہ لَا تُرِيدُوا مِنْكُمْ جَزَاءً وَ لَا شُكْرًا (۱۶/۹) ”ہم تم سے کوئی صلہ
 نہیں چاہتے حتیٰ کہ شکر یہ تک بھی نہیں“ وہ ان سے کہہ دے کہ دوسروں کی کمی پوری کرنا میرا فریضہ تھا۔ میں نے جب کسی کی
 کمی کو پورا کر دیا۔ وہ کمی پوری ہو گئی اس کے بعد کسی صلہ یا معاوضہ یا سوال کیسا؟ هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ
 (۵۵/۶۰) ”کسی کی کمی کو پورا کر دینے اور اس طرح اس کے بگڑے ہوئے توازن کو قائم کر دینے کا صلہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا
 ہے کہ اس کا توازن قائم ہو گیا“ جو لوگ اس حقیقت کو اپنا نصب العین بنالیں وہ اپنی محنت کے حاصل کو نوعِ انسان کی
 نشوونما اور ربوبیتِ عامہ کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔ اور جن لوگوں کی نشوونما کرتے ہیں۔

ثُمَّ لَا يَشْعُرُونَ مَا أَنْفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى ۗ لَهُمْ أَجْرُهُمْ جَمْعًا وَلَا خَوْفٌ
 عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (۲/۲۶۳)

نہ کسی قسم کی طعن و تعریف سے ان کی دل شکنی کرتے ہیں نہ احسان جتا کر انہیں صدمہ پہنچاتے ہیں۔ ان کا اجر خدا
 کے نظامِ ربوبیت کے ذمے ہوتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر قسم کے خوف و ہراس اور افسردگی و
 پژمردگی سے محفوظ و مامون ہو جاتے ہیں۔

معاوضہ طلب کرنا تو ایک طرف ان کے دل میں یہ خیال بھی پیدا نہیں ہوتا کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں اسے لوگ دیکھیں تاکہ ہماری
 تعریف ہو۔ جو لوگ اس طرح تعریف و ستائش کے خواہاں ہوں قرآن کی رو سے وہ اس جماعت کے ممبر نہیں بن سکتے جو نوعِ
 انسان کی ربوبیت کو اپنا نصب العین قرار دیتی ہے۔ چنانچہ وہ جماعتِ مومنین سے کہتا ہے کہ دیکھنا تم ان لوگوں کی طرح نہ کرنا۔

كَالَّذِينَ يُنْفِقُ مَالَهُمْ رَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (۲/۲۶۴)

جو لوگ اپنی دولت دوسروں کے دکھا دے کی خاطر خرچ کرتے ہیں نہ اس لئے کہ انہیں خدا کے قوانینِ ربوبیت
 اور زندگی کے مستقبل پر ایمان ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرات انبیاء کرام جو اس نظام ربوبیت کی تشکیل کے اولین داعی ہوتے تھے اپنے لوگوں سے بالوضاحت کہہ دیتے تھے کہ

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۹۱﴾ (۲۶/۱۹)

میں تم سے اس کے معاوضے میں کچھ نہیں چاہتا۔ میرا اجر اس خدا (کے قانون ربوبیت) کے ذمے ہے جو تمام اقوام عالم کی پرورش کا ذمہ دار ہے۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ قرآن کی رو سے

(i) زندگی کا مقصود و منتہی انسانی ذات کی نشوونما ہے اور

(ii) انسانی ذات کی نشوونما کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنی محنت کے حاصل (مال و دولت) کو دوسروں کی نشوونما کے لئے کھلا رکھے اور اس باب میں دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دے۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ (جیسا کہ باب چہارم — عقل اور ایمان — میں بتایا جا چکا ہے) انسانی عقل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس فرد کی (اور اس کی اولاد کی) ضروریات زندگی نہیا کرے جس کی وہ عقل ہے۔ اگر اس عقل سے یہ کہا جائے کہ تو اس فرد (اور اس کی اولاد) کی پرورش کا خیال چھوڑے۔ یہ اگر مرتا ہے تو اسے مر لے دے۔ اس کی اولاد بھوک سے بڑھتی ہے تو بڑھنے دے۔ تو دوسروں کی پرورش کی فکر کر، تو عقل اس کے لئے کبھی تیار نہیں ہوگی۔ اگر اسے اس طریق کار کے لئے مجبور کیا جائے گا تو (اول تو وہ اس چیز کو برداشت ہی نہیں کرے گی اور اگر اُسے کسی طرح طوعاً و کرہاً آمادہ بھی کر لیا جائے تو) اس سے جو نفسیاتی کشمکش پیدا ہوگی اس کے نتائج

عقل کی تسکین کی صورت

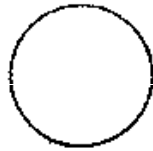
ظاہر ہیں۔ لہذا وہ سوال جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، یہ ہے کہ عقل کو اس پر کیسے آمادہ کیا جائے کہ وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنے اوپر ترجیح دے؟ آمادہ ہی نہیں بلکہ مطمئن کیا جائے؟ خانقاہیت کے تصوف (ربانیت) نے اس کا علاج یہ سوچا کہ انسانی جسم اور اس کے تقاضوں کو قابلِ نفرت قرار دے دیا جائے۔ اور ان کا فنا کر دینا انسانی زندگی کا مقصود و منتہی سمجھ لیا جائے۔ لیکن اول تو یہ تصور حیات اور فلسفہ زندگی ناممکن عمل ہے۔ انسانی زندگی کے تقاضوں کو فنا نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرے اس سے جس بڑی طرح انسانیت کا گلا گھٹاتا ہے اس پر تاریخ خانقاہیت شاہد ہے۔ خواہ وہ عیسائی راہبوں کے غاروں میں ہو یا مجوسی آتشکدوں میں۔ وہ ہندی ویدانت کے سنیاسی آشرم میں ہو یا تصوف کی خلوت گاہوں میں۔ قرآن سر درد کا علاج سر کاٹ دینا نہیں بتاتا۔ وہ انسانی ذات کی نشوونما کے لئے اس کے جسم کی پرورش کو نظر انداز نہیں کرتا۔ وہ جسم کی پرورش کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ وہ مثالی زندگی کے لئے جسم اور

علم“ دونوں کی فراوانی ضروری قرار دیتا ہے (۲/۲۴۷)۔ اس کی رُو سے مال و دولت، بیوی بچے، زیبائش و آرائش کی چیزیں وجہ جاذبیت ہیں (۳/۱۴)۔ وہ مسلکِ خانقاہیت کے حاطین کو لکار کر کہتا ہے کہ ”کون ہے جو ان زینت کی چیزوں کو اوڑھ خوشگوار سامانِ زلیست کو جسے خدا نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا حرام قرار دے (۷/۳۲)۔“

لہذا، سمٹ سمٹا کر پھر وہی سوال سامنے آجاتا ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ جسم کی پرورش کے لئے سامانِ زلیست سے زیادہ سے زیادہ متمتع ہو (اور قرآن اس کی بھی تائید کرتا ہے)۔ دوسری طرف انسانی ذات کی نشوونما کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنے اوپر ترجیح دے۔

سوال یہ ہے کہ عقل کو اس کے لئے آمادہ کس طرح کیا جائے کہ وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنے اوپر ترجیح دے۔ قرآن اس کے لئے ایسا انتظام کرتا ہے کہ اس میں عقل نہ صرف اس مقصدِ عظیم کے لئے آمادہ ہو جاتی ہے بلکہ اس میں عینِ راحت اور تسکین محسوس کرتی ہے۔

اس نظام کی تفصیل آئندہ باب میں ملے گی۔



باب دہم

نظام ربوبیت

گذشتہ باب میں ہم نے کہا ہے کہ قرآن اس قسم کا انتظام کرتا ہے کہ جس سے ہر فرد کی عقل مطمئن ہو جاتی ہے کہ دوسرے افراد کو اپنے آپ پر ترجیح دینا صحیح فریضہ زندگی ہے۔ ظاہر ہے کہ عقل انسانی اس انداز کا اطمینان حاصل نہیں کر سکتی جب تک وہ اس طرف سے بالکل مطمئن نہ ہو جائے کہ ایسا کرنے سے اس شخص کی اپنی اور اس کی اولاد کی ضروریات پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے قرآن کیا پروگرام تجویز کرتا ہے۔ اس پروگرام کے اطمینان بخش ہونے پر دین کی عمارت کے استحکام کا دار و مدار ہوتا ہے۔ اس لئے اس سلسلہ میں یہ کڑی بڑی اہم ہے۔

سابقہ ابواب میں بتایا جا چکا ہے کہ جو لوگ وحی کی رو سے متعین کردہ مستقل اقدار پر یقین رکھتے ہیں وہ ایک معاشرہ قائم کرتے ہیں۔ معاشرے سے مراد ہے ایک عمرانی نظام (SOCIAL ORDER) جس میں مستقل اقدار عملاً نافذ ہوں۔ دورِ حاضر کی اصطلاح میں اسے مملکت (STATE) کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ (جس طرح ہر نظام میں ہوتا ہے) اس نظام میں کچھ لوگ ایسے ہوں گے جن کے ذمے اس نظام کے قیام اور استحکام کے فرائض ہوں گے۔ باقی افراد معاشرہ ان فرائض کی سرانجام دہی میں ان کے دست و بازو نہیں گے۔ اس مملکت میں حاکم اور محکوم کا کوئی امتیاز نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ قرآن کی رو سے کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر اپنی حکومت چلائے۔ (اس کی تفصیل بارہویں باب میں ملے گی) اس نظام میں ہر فرد قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرے گا۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اطاعت خواہ قوانینِ خداوندی ہی کی کیوں نہ ہو ایک عملی نظام میں ہی ممکن ہے۔ اسے حکومت کی مشینری کہتے ہیں۔ اس حکومت میں کسی ہیئتِ اجرانیہ (EXECUTIVE) کا ہونا لاینفک ہے جو ان قوانین کو مملکت میں نافذ کرے۔ (اسے اس نظام کا مرکز کہہ لیجئے)۔ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کی عملی شکل اس اجرانیہ کے نافذ کردہ احکام کی اطاعت ہوگی۔ افرادِ معاشرہ اس مرکز کے احکام کی اطاعت

کریں گے، اور یہ مرکز ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرے گا جو خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہیں۔ اور جن کا وعدہ (یا ذکر) قرآن میں کیا گیا ہے۔

اس تمہید کے بعد یہ سمجھئے کہ قرآنی نظام کا قیام افراد اور مرکز میں ایک معاہدہ کی رو سے ہوتا ہے۔ وہ معاہدہ یہ ہے۔

معاہدہ | فَأَسْتَبْشِرُكُمْ بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُمْ بِهِ * (۹۸۱۱)

یقیناً اللہ نے مومنین سے ان کی جان اور مال خرید لئے ہیں بعض جنت سو تم اپنی اس بیع (فروخت) پر جو تم نے خدا سے کی ہے خوش ہو جاؤ۔

اس معاہدہ ”خرید و فروخت“ کے چار اجزاء ہیں جو ہر بیع و شری کے معاملہ میں ہونے چاہئیں۔ یعنی

(۱) مشتری (خریدار) _____ اللہ

(۲) بائع (بیچنے والے) _____ مومنین

(۳) جو شے فروخت کی گئی _____ مومنین کے جان و مال اور

(۴) قیمتِ فروخت _____ جنت

ان اجزاء میں مومن اور ان کی جان و مال محسوس اجزاء ہیں جن کے متعلق ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ یہ کیا ہیں۔ لیکن دوسرے دو اجزاء (یعنی خریدار _____ اللہ اور قیمتِ خرید _____ الجنة) غیر محسوس ہیں۔ ظاہر ہے کہ خرید و فروخت کا یہ معاملہ مرئی طور پر سامنے نہیں آ سکتا جب تک ان دو غیر محسوس اجزاء کے متعلق اچھی طرح سے سمجھ نہ لیا جائے کہ ان سے مراد کیا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کہہ دے کہ میں نے اپنی جان اور مال اللہ کے ہاتھوں بیچ رکھے ہیں تو یہ بات محض نظری یا ذہنی ہوگی۔ اس کی جان اور مال اس کے اپنے پاس ہی رہیں گے اور اس سوئے کا معاملہ محض اعتقادی حد تک ہے گا۔ دوسری طرف اگر وہ کہے کہ اس کے عوض اللہ مجھے جنت عطا کرے گا تو اس (قیمتِ فروخت) کا معاملہ بھی (جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے) اعتقاد کی حد سے آگے نہیں بڑھے گا۔ اسلام چونکہ ایک عملی ضابطہ حیات ہے اس لئے اس میں یہ چیزیں محض نظری یا اعتقادی حد تک نہیں رہ سکتیں۔ ان کی عملی اور محسوس شکل سامنے آنی چاہیے۔ قرآن نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ ان سے عملاً کیا مقصود ہے

الجنة سے مقصود | سب سے پہلے قیمتِ فروخت (یعنی الجنة) کو سمجھئے۔ قرآن کریم نے نشوونما یافتہ ذاتِ DEVELOPED PERSONALITY کی مرنے کی بعد کی ارتقائی حالت کو جنت

کی زندگی سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن چونکہ انسانی شعور اپنی موجودہ سطح پر سمجھ نہیں سکتا کہ مرنے کے بعد کی زندگی کے کوائف و احوال کیا ہوں گے اس لئے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ وہاں کی جنت سے متعلق تمام بیانات تمثیلی ہیں۔ سورہ رعد میں ہے۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي دُعِيَ الْمُتَّقُونَ لَهَا مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ (۱۵/۴۵)

اس جنت کی مثال جس کا وعدہ متقیوں سے کیا گیا ہے یوں سمجھو جیسے ایک باغ ہو جس کے نیچے پانی کی ندیاں رواں ہوں اور اس کے پھل اور آسائشیں سدا بہار۔

اس باغ کے متعلق دوسری جگہ کہا کہ

عَرَّضُهَا كَعَرَّضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ (۵۴/۲۱) نیز (۳/۱۳۴)

اس کی وسعت عرض و سمار کی وسعت کی طرح ہے۔

اس قسم کے تمثیلی بیانات کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۳۲/۱۷)

کوئی شخص نہیں جان سکتا کہ اس کے اعمال کے بدلے (نتیجے) میں اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا جو سامان کی نظروں سے اوجھل رکھا گیا ہے اس کی ماہیت و کیفیت کیا ہے۔

لیکن اور یہ لیکن بہت اہم ہے اُس نے اس زندگی کو بھی جو قرآنی نظام کے مطابق اس دنیا میں حاصل ہوا جنت کی زندگی سے تعبیر کیا ہے اور اس جنتی زندگی کی ایسی تفصیل بیان کر دی ہیں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس سے مقصود کیا ہے اور اس کے نتائج کیا۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ عرب جو اس پیغام کے اولین مخاطب تھے اور جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا ایک صحرائیں قوم تھی ان کے نزدیک پرفضا باغات تازہ شیریں ٹھنڈے پانی کے چشمے سایہ دار درخت پھلوں کی افراط دودھ اور شہد کی نہریں اور اسی قسم کی دیگر اشیاء سے بڑھ کر زندگی کی آسائشیں اور کیا ہو سکتی تھیں۔ ان کے نزدیک باغات کی اہمیت کس قدر تھی اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ نبی اکرم کے مخالفین یہ اعتراض کرتے تھے کہ اگر یہ واقعی خدا کا برگزیدہ انسان اور اس کا رسول ہے تو یٰٰنقی الیہ کثر اؤ تکلون لہ جنتہ یتاکل منہا (۲۵/۸) اس کی طرف کوئی خزانہ بھیجا جاتا یا اس کا کوئی باغ ہی ہوتا جس سے یہ کھاتا پیتا اس کے جواب میں قرآن نے کہا کہ تھوڑی دیر تک انتظار کرو۔ اس نظام کو متشکل ہو لینے دو۔ ایک باغ کیا جنت تجری من تحتہا الا نھر لا یتجمل لک قصودا (۲۵/۱۰) وہ تجھے بہت سے باغات عطا کرے گا جن کے نیچے پانی کی ندیاں جاری ہوں گی اور تجھے رہنے کو محل عطا کرے گا۔

اس مقام پر باغات کے علاوہ محلات کا بھی ذکر آیا ہے۔ عرب ہادیہ نشین قوم تھی جو بالعموم خیموں میں زندگی بسر کرتی تھی۔ ان کے دائیں بائیں ایران اور روم کی ایسی سلطنتیں تھیں جو دنیا کی عظیم تہذیبوں کی وارث تھیں۔ ان کا معیار زیست خانہ بدوش عربوں سے کہیں بلند تھا۔ یہ ممالک (یا کم از کم ان کا بیشتر حصہ) عنقریب نظامِ خداوندی کے نتیجے میں ان عربوں کے قبضے میں آنے والا تھا۔ اس لئے قرآن نے ارضی جنت کی تفصیل میں ان کے سامان آرائش و آسائش کو بھی شامل کر لیا تھا۔ اس پس منظر میں آپ دیکھئے کہ قرآن نے الجنة (یعنی جنت ارضی) کا ذکر کس کس انداز سے کیا ہے۔ سب سے پہلے وہ حتمی اور یقینی طور پر کہتا ہے کہ ایمان و عمل صالح کا نتیجہ اس دنیا کی حکومت و سلطنت ہوگی۔ سورہ نور میں ہے۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ وَ لِيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ ۚ وَ لِيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا ۗ يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا ۗ وَ مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝ (۲۴/۵۵)

جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں گے اور خدا کے مقرر کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوں گے ان کے لئے اللہ نے اس دنیا میں حکومت کا وعدہ کر رکھا ہے جس طرح ان اقوام کو حکومت عطا کی تھی جو ان سے پہلے ہو گزری ہیں نیز یہ وعدہ کہ وہ (استخلاف فی الارض کے ذریعے) ان کے اس دین کو مستحکم کر دے گا جسے اس نے ان کے لئے تجویز کیا ہے۔ انہیں خوف کی جگہ امن عطا کر دے گا تاکہ وہ صرف خدا کی حکومت اختیار کریں اور اس کی حکومت میں کسی اور کو شریک نہ کر لیں اور جو لوگ اس کے بعد پھر کفر کی راہ اختیار کریں گے تو یہ لوگ بے راہ روہوں گے۔

استخلاف فی الارض

لے ضمناً ان آیات سے یہ بھی واضح ہے کہ

- (i) ایمان اور اعمالِ صالحہ کا لازمی اور حتمی نتیجہ استخلاف فی الارض (دنیا کی حکومت) ہوتا ہے۔
- (ii) دین کے تکمیل کے لئے اپنی حکومت کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس لئے کہ دین نام ہی اس اجتماعی نظامِ زندگی کا ہے جس میں قوانینِ خداوندی کا نفاذ ہو۔
- (iii) خدا کی "عبادت" اور شرک سے بچنے کے لئے اپنی حکومت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے "عبادت" کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی قوانینِ خداوندی کی محکومیت۔

ان آیات سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا تھا کہ ان کے ایمان اور اعمالِ صالحہ کا نتیجہ استخلا
فی الارض ہوگا۔ چنانچہ جب انہیں اپنے مخالفین پر غلبہ حاصل ہوا تو ان سے کہا گیا کہ

وَأَوْثَقْنَاكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَآمَوْنَا لَهُمْ وَأَرْضًا لَمْ تَطُورُهَا (۳۳/۲۷)

اس نے ہمیں تمہارے مخالفین کی زمینوں، شہروں اور ان کے مال و دولت کا مالک بنا دیا۔ اور ان زمینوں
کا مالک بھی جن پر ابھی تمہارے پاؤں بھی نہیں پڑے۔

خدا کے وعدوں کو اس طرح پورا ہوتے دیکھ کر وہ لوگ فرط مسرت سے جھومتے اور جذب و وجد کے عالم میں پکار اٹھتے تھے کہ

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدًا وَأَدَّبْنَا آلَا نَرْضُ نَسَبْنَا مِنَ الْجَنَّةِ
حَيْثُ نَشَاءُ ۚ فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَمِلِينَ ۝ (۳۹/۷۴)

درخورد حمد و ستائش ہے وہ ذات جس نے اپنے ان وعدوں کو جو اس نے ہمارے ساتھ کئے تھے پورا کر کے
دکھا دیا۔ اور ہمیں زمین کی حکومت عطا کر دی۔ یہ وہ الجنۃ ہے جس میں ہر طرف ہمارا اختیار کار فرما
کام کرنے والوں کا یہ کیسا عمدہ بدلہ ہے۔

بنیادی ضروریاتِ زندگی | آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن میں "الجنۃ" کا استعمال کس مقام پر ہوا ہے؟ اس

"الجنۃ" نے سب سے پہلے ان کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کو پورا کیا جس کی
ان کے ہاں اس قدر کمی تھی۔ جنت کی یہ وہ پہلی خصوصیت ہے جس کا ذکر "آدم" سے ان الفاظ میں کیا گیا تھا کہ
إِنَّ لَكَ أَلًا تَجُوعُ فِيهَا وَلَا تَعْرِىٰ ۗ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَوُ فِيهَا وَلَا تَضْحٰى ۝

(۲۰/۱۱۹-۱۱۸)

اس میں تجھے نہ بھوک کی فکر ہے نہ لباس کی نہ پیاس کا ڈر نہ دھوپ کا۔

یعنی اس میں کھانے پینے کی چیزوں، لباس، مکان وغیرہ ضروریاتِ زندگی کی طرف سے بالکل اطمینان ہوتا ہے۔ اطمینان بھی آیا
کہ دَكْلًا مِنْهَا رَعْدًا أَحَدٌ مِّنْكُمْ مَّا (۲/۳۵) "اس میں جہاں سے جی چاہے سیر ہو کر کھاؤ۔"
بنیادی ضروریاتِ زندگی پورا ہونے کے بعد آسائش و آرائش کے تمام سامان۔

سونے کے کنگن، جو اہرات سے مرصع، ریشمی لباس (۲۲/۲۳)۔ دکھانے کی میز پر، سونے کی پلیٹیں اور پیالے
تھے ہوئے گردش کرنے والے (۳۳/۵۰) اس کے بعد تفکھا کھانے کی چیزوں کے ڈھیر (۲۳/۸۱)۔ بیٹھنے کے لئے صوفے
چاندی کے برتن اور شیشے کے پیالوں کو لئے لگھونے والے (خدم) باریک ریشمی ملبوسات، دبیز ریشم (کمر پٹے)

(۲۱-۶۶/۱۶) پسندیدہ پرندوں کا گوشت (۵۶/۲۱)۔ تہ بہ تہ کیلئے لکھے سائے، آبشاریں۔ (۳۲-۵۶/۲۸)۔

آپ ان تفصیل پر غور کیجئے اور زیادہ نہیں تو صرف مدائن کی فتح پر جو مالِ عنیمت ان کے ہاتھ لگا تھا، کتب تاریخ میں اس کی فہرست پر نظر ڈالئے، صاف دکھائی دے گا کہ الجنتہ کی جن چیزوں کا وعدہ کیا گیا تھا وہ کس طرح اس سامان میں موجود تھیں۔ اور ایک ایران پر ہی کیا موقوف ہے، شام کے سرسبز و شاداب باغات، مصر کی سونا گلے والی زمین، عراق عجم (جو اس زمانے میں ایران ہی کا حصہ تھا) کی پُر بہار فضا میں۔ یہ سب کچھ اسی الجنتہ کی مشہور تفسیر تھی جو ان کے سامنے آگئی۔ پھر اس میں

لَا يَمَسُّنَا فِيهَا نَصَبٌ وَلَا يَمَسُّنَا فِيهَا لُغُوبٌ ۝ (۳۵/۳۵)

نہ جسمانی مشقت کی تکان، نہ ذہنی اور نفسیاتی کشمکش۔

چونکہ اس معاشرہ میں ہر طرف قوانینِ خداوندی کا دور دورہ تھا۔ اس لئے اس میں کوئی لغوباتِ کان میں نہیں پڑتی تھی اور ہر طرف سے سلامتی کی حیات بخش صدائیں ابھرتی تھیں (۱۹/۶۲)۔ اس میں سب حقیقی بھائیوں کی طرح پورے خلوص اور محبت کے ساتھ رہتے تھے (۱۵/۴۷)۔ نہ کسی کے دل میں کوئی کدورت تھی نہ بغض و عداوت کے چھپے ہوئے جذبات۔ (۷/۲۳)

یہاں تک اس الجنتہ کے صرف اس گوشے کا ذکر آیا ہے جس میں جسمانی پرورش کا سامان بافراط موجود ہوتا ہے۔ لیکن قرآن کی رو سے مقصودِ حیات صرف جسمانی پرورش نہیں حقیقی نصب العین انسان کی مضمحل صلاحیتوں کی نشوونما (انسانی ذات کا ارتقاء) ہے۔ اس لئے اس کے لئے بھی اس میں تمام اسباب و ذرائع میسر ہوتے ہیں۔

عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللَّهِ يُفَجِّرُونَ فِيهَا نَهْرًا ۝ يُؤْتُونَ بِالنَّارِ (۷/۵)

ایسا چشمہ حیات جسے خدا کے بندے اپنے اعماقِ قلب سے بہا کر لاتے ہیں۔ وہ ان تمام واجبات کو پورا کرتے ہیں جنہیں انہوں نے اپنے ذمے لے رکھا ہوتا ہے۔

کارگاہِ حیات کے اس وسیع میدان میں انہیں آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے کہ جو چاہے آگے بڑھ جائے، جو چاہے پیچھے رہ جائے (۷۲/۲۷)۔ کسی کے راستے میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ سب کے لئے یکساں مواقع ہوتے ہیں۔ آگے بڑھنے والوں کی پیشانی کا نور ان کے آگے اور دائیں (بائیں) جا رہا ہوتا ہے۔ اور ان کی آرزویہ ہوتی ہے کہ اس روشنی میں اور اضافے ہونے چلے جائیں (۷۶/۸)۔ ارتقائی منازل کی بلندیوں پر بلندیاں ان کے سامنے آتی چلی جاتی ہیں۔ وہ بلندیاں جن کے نیچے سامانِ حیات جوئے رواں کی طرح بہہ چلا جاتا ہے (۳۹/۲۰)۔

یہ ہے وہ الجنة جو قرآنی معاشرہ کے افراد کو ان کے مال و جان کے عوض بطور "قیمت فروخت" ملتی ہے۔ اس سے واضح ہو گیا کہ خرید و فروخت کے اس معاملے میں جس کا ذکر پہلے کیا گیا ہے تیسرا جزو (یعنی قیمت فروخت) کا معنی بھی ذہنی اور قیاسی یا محض نظری اور اعتقادی نہیں۔ یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے جسے ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔

اب آئیے اس معاہدے کے چوتھے رکن کی طرف۔ اس معاہدے میں کہا گیا ہے کہ مومن اپنا جان اور مال "اللہ" کے ہاتھ بیچتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس سے عملاً کیا مراد ہے؟ مومن اپنی جان اور مال کس کے ہاتھ بیچتے ہیں؟ اور اس کے تبادلے میں انہیں کون الجنة دیتا ہے؟ جن افراد کی ذات میں نشوونما شروع ہو جاتی ہے وہ نظامِ کائنات میں خدا کے رفیق بن جاتے ہیں۔ اور انسانی دنیا میں تو ان خداوندی

اللہ سے عملاً مراد

انہی کی وساطت سے نفاذ پذیر ہوتے ہیں۔ یہی وہ افراد ہیں جن کے ہاتھوں وہ ذمہ داریاں پوری ہوتی ہیں جنہیں خدا نے اپنی طرف منسوب کر رکھا ہوتا ہے (ہم نے انہیں مرکزِ نظامِ خداوندی کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے)۔ لہذا بیع و شری کے اس معاملے میں جس کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے۔ یہ بیع (فروخت) خدا کی طرف سے

(ON BEHALF OF ALLAH) اس معاشرہ کے اربابِ حل و عقد یا بالفاظِ دیگر مرکزِ نظامِ خداوندی کے ہاتھوں طے پاتی ہے۔ نبی اکرم کے عہد مبارک میں یہ مرکز خود حضور کی ذات تھی۔ لہذا افرادِ معاشرہ کی یہ بیع (فروخت) حضور کے ہاتھوں پر ہوتی تھی۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن نے (سورۃ الفتح میں) ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ **إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ (۲۸/۱۰)** اے رسول! جو لوگ تیرے ہاتھ پر اپنی جانیں بیچ رہے ہیں وہ دراصل خدا کے ساتھ اپنا معاملہ کر رہے ہیں۔ معاملہ کو پختہ کرتے وقت دیکھنے کو تو ان کے ہاتھ پر تیرا ہاتھ ہوتا ہے لیکن درحقیقت وہ خدا کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ مرکزِ نظامِ خداوندی اس معاملہ کو اپنی ذاتی حیثیت سے طے نہیں کرتا بلکہ اسے بحیثیتِ نامتدہ خداوندی طے کرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر ان تمام معاملات میں قرآنی نظامِ معاشرہ خدا کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔ (اسلامی نظام کے سلسلہ میں یہ نکتہ بڑی اہمیت رکھتا ہے جس کے متعلق ہم نظامِ سیاست و حکومت سے متعلق باب میں تفصیل سے گفتگو کریں گے)۔ اس سے یہ حقیقت بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ جب قرآن کہتا ہے **فِي سَبِيلِ اللَّهِ (اللہ کی راہ میں)** خرچ کرو یا: **وَأَقْرَضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا (۲/۲۱)** (اللہ کو قرضِ حسنہ دو) تو اس سے مراد کیا ہوتی ہے؟ اس سے مراد قرآنی نظام کا مرکز ہوتا ہے۔ وہی مرکز افرادِ ملت سے یہ کچھ وصول کرتا ہے۔ اور وہی اسے عالمگیر انسانیت کی بہبود کے کاموں میں خرچ کرتا ہے۔

اب ہمارے سامنے بیع و شری کے اس معاملہ کے (جس سے اس گفتگو کا آغاز ہوا تھا) چاروں اجزاء محسوس و مشہود طور پر آگئے۔ یعنی اس معاہدہ کی رو سے افرادِ معاشرہ اپنا جان اور مال مرکزِ نظامِ خداوندی کے سپرد کر دیتے ہیں اور وہ ان کے

اموال (اور عند الضرورت جان) سے معاشرہ کو ان خطوط پر متشکل کر دیتا ہے جس سے تمام افراد معاشرہ کو سامان زندگی نہایت فراوانی سے ملتا ہے۔ اور اس کے علاوہ ان کی ذات کی نشوونما اس انداز سے ہوتی چلی جاتی ہے۔ جس سے وہ مرنے کے بعد کی زندگی میں مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے اسی طرح انہیں اس دنیا میں بھی جنت مل جاتی ہے اور بعد کی زندگی میں بھی تہناتنا فی الدنیا حسنة و فی الآخرۃ حسنة (۲/۲۰۱) سے یہی مراد ہے۔ یہ وہ نظام ہے

جو افراد معاشرہ سے اس حتم و یقین سے کہتا ہے کہ

لَحْنٌ نَزْمُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲)

رزق کی ذمہ داری

ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

اس لئے تمہیں سامان زیست کے متعلق کسی قسم کی پریشانی نہیں ہونی چاہیے۔ تم مطمئن رہو۔ نہ تم بھوکے مر سکتے ہو اور نہ تمہاری اولاد۔

یہ ہے وہ عملی طریق جس سے افراد کی عقل سامان زیست کی طرف سے مطمئن ہو جاتی ہے اور اپنی ساری توجہ نوع انسان کی نشوونما کے لئے وقف کر دیتی ہے۔ اس سے ہر فرد کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ یوں جسم اور ذات دونوں کی پرورش کا انتظام ہو جاتا ہے۔ یعنی دنیا میں بھی سرفرازیاں اور آخرت میں بھی خوشگواریاں۔ حال بھی درخشاں اور مستقبل بھی تابندہ۔ وَ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

قرآنی نظام کی ذمہ داریوں کا دائرہ اپنے افراد کی نشوونما تک محدود نہیں رہتا۔ چونکہ یہ اُس خدا کا تجویز کردہ نظام ہے جو رب العالمین ہے (۱/۲)۔ یعنی تمام اقوام عالم کو نشوونما دینے والا۔ اس لئے جوں جوں اس نظام کو تقویت حاصل

ہوتی جاتی ہے۔ اس کا دائرہ عمل وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ یعنی سب سے پہلے یہ نظام اپنی مملکت کے اندر بسنے والے افراد

ہر ذی حیات کے رزق کی ذمہ داری

کی پرورش کی ذمہ داری لیتا ہے۔ خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔ اور اس کے بعد اس کی ربوبیت دیگر افراد انسانہ کو محیط ہوتی چلی جاتی ہے۔ بلا لحاظ مذہب و ملت اور بلا تفریق رنگ و نسل۔ اس ربوبیت کو ساری دنیا میں عام کر دینا اس نظام کا نصب العین ہے۔ اس طریق سے قرآن کا یہ عظیم القدر اعلان کہ

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶)

رضے زمین پر کوئی چلنے والا (یا متنفس) ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔

ایک حقیقت بن کر سامنے آجاتا ہے۔ قرآن نے اپنے اس اعلان میں دابہ کا لفظ استعمال کیا ہے جو انسانوں اور حیوانوں

سب کو اپنے اندر شامل کر لیتا ہے اس لئے تمام جائداروں کے رزق کی ذمہ داری اس نظام ربوبیت کے سرپر عائد ہو جاتی ہے۔ اور وہ اس ذمہ داری کو پورا کرتا ہے۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اس معاشرہ کے تمام افراد کی بنیادی ضروریات زندگی خود بخود (نظام معاشرہ کی طرف سے) پوری ہوتی رہیں گی تو ان افراد کو کام کرنے کی ضرورت کیا ہوگی؟ اگر آپ انہیں کسی کام پر لگا بھی دیں گے تو وہ اس میں اپنی پوری محنت صرف کیوں کریں گے؟ مثلاً اگر کسی کاریگر کو معلوم ہو کہ وہ دن بھر جتنا کام کرے گا اسے اتنی ہی اجرت مل جائے گی تو وہ دن بھر جان مار کر کام کرے گا تاکہ اسے زیادہ سے زیادہ اجرت مل جائے۔ لیکن اگر اسے معلوم ہو کہ وہ (مثلاً) دس روپے روز

کام کرنے کا جذبہ کیا تھا

کا کام کرے لیکن اس کی ضروریات ڈو روپے میں پوری ہو جاتی ہوں تو اسے دو ہی روپے ملیں گے۔ بقایا آٹھ روپے کسی اور کو دے دیئے جائیں گے۔ تو وہ دس روپے کا کام کیوں کرے گا؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ سوال معاشیات (ECONOMICS)

میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ ایسے لوگ بھی گزے ہیں جو چاہتے تھے کہ رزق کی تقسیم افراد انسانیہ کی ضرورتوں کے مطابق ہوتا کہ جو لوگ زیادہ کمانے کے قابل نہ ہوں لیکن ان کی ضروریات زیادہ ہوں (یعنی ان کی ضروریات ان کی کمائی سے پوری

انہ ہوتی ہوں) انہیں بھی پورا پورا سامان زیست ملتا جائے۔ اس کی صورت اس کے

معاشیات کا اہم سوال

سوا اور کیا ہو سکتی تھی کہ جو لوگ زیادہ کمانے کے اہل ہوں لیکن ان کی ضروریات کم ہوں، ان کی محنت کا فائدہ حاصل دیگر افراد کی ضروریات پورا کرنے کے کام میں لایا جائے۔ چنانچہ بعض مقامات پر اس کے لئے تجربے بھی کئے گئے۔ (سب سے پہلے خود افلاطون (PLATO) نے اس پر تجربہ کیا تھا) لیکن وہ تجربے ہمیشہ ناکام رہے۔

اور یہی وہ ناکامیاں تھیں جن کی بنا پر ماہرین معاشیات اس نتیجے پر پہنچے کہ جب تک کسی کو اس کی محنت کے پورے کے پورے حاصل کا مالک قرار نہ دیا جائے وہ پوری پوری محنت کبھی نہیں کرے گا۔ اسے (PRIVATE ENTERPRISE) کہتے ہیں۔

اور یہی نظام سرمایہ داری (CAPITALISM) کی بنیاد ہے۔ ہمارے زمانے میں اس نظام کے خلاف کمیونزم (اشتراکیت) نے سراٹھایا۔ اس تحریک کے بانیوں نے غریبوں اور ناداروں کو یہ کہہ کر ابھارا کہ تم اٹھو اور دلتوں کو

اشتراکیت

کی دولت چھین لو۔ چنانچہ وہ اٹھے اور انہوں نے ان کی دولت چھین لی۔ اس سے ہنگامی طور پر انقلاب کامیاب ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد اب وہاں بھی وہی سوال درپیش ہے کہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ کام کرنے پر آمادہ

لے اکتا مکس میں اس کے لئے (LAISS-EZ-FAIRE) کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے جس سے مطلب یہ ہے کہ کاروباری معاملات میں حکومت دخل انداز نہ ہو۔

کس طرح کیا جائے۔ وہ کون سا جذبہ محرکہ پیدا کیا جائے جس سے وہ جان مار کر کام کریں اور اس کے ماہصل سے صرف اتنا لیں جس سے ان کی ضروریات پوری ہو جائیں۔ باقی سب مملکت کے حوالے کر دیں جس فلسفہ زندگی پر کمیونزم کی بنیاد اٹھی ہے اس میں طبعی زندگی کے علاوہ انسان کی کسی اور زندگی کا تصور ہی نہیں اس لئے طبعی زندگی کے قوانین کے علاوہ اور کسی قانون اور قدر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہذا انہیں وہ جذبہ محرکہ کہیں سے نہیں مل رہا۔ اس لئے ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ لوگوں سے زبردستی کام لیں۔ سرمایہ دارانہ جمہوریتوں نے اپنے ہاں (WELFARE STATE) کا تصور پیدا کیا ہے جس میں مملکت ضرورت مندوں کی زیادہ سے زیادہ مدد کرنے کی تدابیر اختیار کرتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جب تک مملکت کے پاس فراوان دولت نہ ہو وہ لوگوں کی ضروریات کیسے پوری کرے گی؟ اس کے لئے انہوں نے —

روس اور جمہوریتیں

(TAXATION) پر زور دے رکھا ہے۔ چنانچہ اب ان ممالک میں حالت یہ ہے کہ ایک شخص کی آمدنی کا قریب اسی فیصد مختلف ٹیکسوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قدر ٹیکس بطیب خاطر کوئی نہیں دیتا۔ اسے حکومت قانون کے زور پر وصول کرتی ہے۔ اور لوگ قانون سے گریز کی راہیں نکالنے کے عجیب و غریب حیلے سوچتے اور وضع کرتے رہتے ہیں۔ لہذا یہاں بھی وہی استبداد ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ کمیونزم میں یہ استبداد بے نقاب سامنے آتا ہے اور جمہوریتوں میں قانون کے نگاہ فریب پردوں میں۔ بات دونوں جگہ ایک ہی ہے۔ چونکہ کوئی نظام جو استبداد پر مبنی ہو زیادہ دنوں تک چل نہیں سکتا۔ اس لئے کمیونزم کی طرح جمہوریتوں کے قصر حکومت میں بھی دراڑیں پڑتی چلی جا رہی ہیں۔

اس کے برعکس قرآن کو لیجئے۔ اس کا فلسفہ حیات یہ ہے کہ

(۱) انسان صرف اس کے جسم سے جہارت نہیں۔ جسم کے علاوہ اسے ذات بھی دی گئی ہے۔

(۲) انسانی زندگی کا مقصود انسانی ذات کی نشوونما ہے۔

(۳) انسانی ذات کی نشوونما اس سے ہوتی ہے کہ وہ دیگر افراد انسانیہ کی نشوونما کے لئے کیا کچھ کرتا اور دیتا ہے۔ کوئی

فرد دوسروں کی پرورش کے لئے جس قدر زیادہ دے گا، اسی قدر اس کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جائے گی۔

قرآنی نظام ان افراد پر مشتمل ہوتا ہے جو اس فلسفہ زندگی پر ایمان رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب انسانی افراد کو ان کی ضروریات زندگی کی طرف سے مستغنی کر دیا جائے گا تو وہ دن رات اس کوشش میں لگے رہیں گے کہ زیادہ سے زیادہ کمائیں تاکہ دوسروں کی زیادہ سے زیادہ پرورش ہو سکے۔ اور اس طرح ان کی ذات کی زیادہ سے زیادہ نشوونما ہو۔ یہ ہے وہ جذبہ محرکہ جس سے انسان زیادہ سے زیادہ محنت کے بعد اپنا سب کچھ بطیب خاطر دوسروں کی پرورش کے لئے عام کر دیتا ہے۔ اس میں نہ کسی استبداد کی ضرورت ہوتی ہے نہ ہمہیزگی۔ استبداد تو ایک طرف وہ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) دوسروں سے شکر یہ تک

کے بھی خواہاں نہیں ہوتے۔

پروفیسر (HAWTREY) نے کہا ہے کہ

جو چیز ایک معاشی نظام کو دوسرے معاشی نظام سے متمیز کرتی ہے یہ ہے کہ اس نظام میں وہ جذبہ محرکہ کیا ہے جو لوگوں

کو کام کرنے پر آمادہ کرے۔ (QUOTED BY E.H. CARR IN "THE NEW SOCIETY" : P-60)

جو جذبہ محرکہ قرآنی نظام مہیا کرتا ہے آپ اس کا مقابلہ دیگر نظامہائے معیشت (ECONOMIC ORDERS) سے کیجئے اور سوچئے کہ کیا کوئی نظام قرآنی نظام کا مقابلہ کر سکتا ہے؟ آپ جوں جوں اس نکتہ پر غور کریں گے یہ حقیقت واضح ہوتی جائے گی کہ اس اہم مسئلہ کا حل قرآنی فلسفہ زندگی کے سوا اور کہیں سے نہیں مل سکتا۔ جس دن اقوام عالم نے اس حقیقت کو سمجھ لیا، کاروانِ انسانیت نجات و سعادت کی راہ پر چل پڑے گا۔

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے ایک ضمنی نکتہ کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ہم شروع سے کہتے چلے آئے ہیں کہ انسانی زندگی کا مقصود، انسانی ذات کی نشوونما ہے اور اس کا طریق وہ جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ تصوف کا بھی یہ دعویٰ ہے کہ اس کا مقصد "تزکیہ نفس" یا انسان کی "ردحانی ترقی" ہے۔ لیکن اس کے لئے وہ طریقہ یہ بتاتا ہے کہ انسان دنیاوی علائق سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہئے اور اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کو فنا کرے۔ "تزکیہ نفس" سے مراد ہے روح کو مادی آلائشوں اور کثافتوں سے پاک کرنا اور اس کا طریق یہ ہے کہ انسان مادی دنیا سے دُور بھاگے۔

تصوف کی اصل کیا ہے اور اس کی تاریخ کیا؟ یہ چیز ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اس وقت ہم صرف اتنا کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ اس کا سرچشمہ افلاطونی نظریہ حیات ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ اسے قرآن سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ قرآنی فلسفہ حیات اور تصور زندگی کی بائبل ضد ہے۔ یہی وہ مدعیانِ تزکیہ نفس ہیں جن کے متعلق قرآن کہتا ہے:-

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْكُونَ أَنفُسَهُمْ ۗ بَلِ اللَّهُ يَزْكِي مَن يَشَاءُ وَلَا يُلْظَمُونَ فِتْنًا ۗ (۴/۴۹)

کیا تو نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جو تزکیہ نفس کے مدعی ہیں (ان سے کہہ دو کہ تزکیہ نفس اس طرح نہیں

ہوتا) یہ صرف اسے حاصل ہو سکتا ہے جو اسے قرآن کے قانون اور ضابطہ حیات کے مطابق حاصل کرنا چاہے۔ جو اس

اس طریق سے حاصل کرنا چاہے گا۔ اس کی سعی و عمل کے نتائج میں ذرا بھی کمی نہیں کی جائے گی۔

دوسری جگہ ہے۔

فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ اَتَّقَى ۝ (۵۲/۲۲)

تم خود ہی یہ خیال نہ کر بیٹھو کہ تمہارے نفس کا تزکیہ ہو رہا ہے خدا جانتا ہے تمہاری کون سی

یہاں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ جس کا تزکیہ نفس (ذات کی نشوونما) ہو اسے متقی کہتے ہیں۔ دوسرے مقام پر بتا دیا کہ متقی کون ہے۔

الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ (۹۲/۱۸)

جو اپنا مال بلکہ سب کچھ اپنی ذات کی نشوونما کے لئے دیتا ہے۔

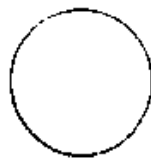
اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کی رو سے "تزکیہ نفس" اس کا ہوتا ہے جو پوری محنت سے کمائے اور پھر اپنا سب کچھ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیتا چلا جائے۔ "تزکیہ نفس" اس کا نہیں ہوتا جو دوسروں کی کمائی پر زندہ رہے۔ روحانی ترقی کے مدعی کتنا ہی دنیا سے دور بھاگیں جب تک وہ زندہ ہیں انہیں اپنے جسم کی پرورش کے لئے کھانے پینے کی ضرورت ہوتی ہے جسے (ظاہر ہے کہ) دوسرے لوگ پورا کرتے ہیں۔ جو شخص خود اپنی ضروریات کے لئے دوسروں کا محتاج ہو اس کا تزکیہ نفس کس طرح ہو سکتا ہے۔

پھر قرآن کی رو سے تزکیہ نفس انسانی معاشرہ کے اندر رہتے ہوئے ہوتا ہے۔ انفرادی زندگی بسر کرنے سے نہیں ہوتا۔ اس لئے جو شخص خانقاہوں کے خلوت کدو میں تزکیہ نفس تلاش کر رہا ہے۔ وہ قرآنی راستے سے مخالف سمت کی طرف جاتا ہے۔ یہی وہ رہبانیت ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ

وَمَا هِيَ اَنْبِيَاةٌ ۙ اَبْتَدَا عَوْهَا مَا كَتَبْنَهَا عَلَيْهِمْ ۝ (۵۴/۲۴)

اے انہوں نے اپنے ذہن سے وضع کر لیا ہے۔ ہم نے اسے ان پر لازم نہیں ٹھہرایا۔

تزکیہ نفس (انسانی ذات کی نشوونما) صرف نظام ربوبیت کے قیام سے ہو سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ محنت سے کمانا اور اسے قرآنی نظام ربوبیت کے سپرد کر دینا۔ وہ نظام اس میں سے ان افراد کا سب (کمائے والوں) کی ضروریات زندگی بھی پوری کرے گا۔ اور فاضلہ دولت دیگر افراد انسانیت کی پرورش کے لئے صرف کرے گا۔ یہ نظام خدا کی صفت رب العالمین کا علمی مظہر ہوتا ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ قرآن کے پیش کردہ نظام کا ما حاصل یہ ہے کہ انسان فطرت کی قوتوں کو زیادہ سے زیادہ حد تک مستحضر کرے اور ان قوتوں کے ما حاصل کو نوع انسان کی نشوونما کے لئے عام کرے۔ اس میں انسان اور انسان ہیں کسی قسم کی تخصیص اور تفریق نہ ہو۔



باب یازدہم

نظام ربوبیت کے عقلی دلائل

گزشتہ باب میں بتایا جا چکا ہے کہ نظام ربوبیت اس جماعت کے افراد قائم کرتے ہیں جو اس حقیقت پر ایمان رکھتے ہیں کہ اس نظام کے قیام سے ان کی ذات کی نشوونما ہو سکتی ہے۔ اور ذات کی نشوونما ہی مقصود حیات ہے۔ لیکن قرآن اس نظام کی تائید میں عقلی دلائل بھی پیش کرتا ہے تاکہ اس جماعت کے افراد بھی اس حقیقت پر علی و جہ البصیرت یقین رکھیں اور اسے دوسروں کے سامنے بھی بدلائل و شواہد پیش کر سکیں۔

نظام سرمایہ داری کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ ہر فرد یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ وہ اپنی ہنرمندی اور چابکدستی، استعداد اور صلاحیت کی بنا پر کماتا ہے وہ اس کی ملکیت ہے۔ اس پر کسی دوسرے کا حق نہیں ہو سکتا۔ اتم سابقہ کی سرگزشت میں قرآن نے (بنی اسرائیل کے) قارون کو اسی نظام (سرمایہ داری) کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ سورہ قصص میں ہے کہ جب اس سے کہا گیا کہ

وہ اس تمام (فاضلہ) دولت میں جو اس نے یوں جمع کر رکھی ہے اوروں کا حق کیوں نہیں سمجھتا تو اس نے جواب دیا کہ اِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِنْدِي (۲۸/۷۸) یہ دولت مجھے میری ہنرمندی کی بدولت ملی ہے۔ میں نے اسے اپنے علم اور ذاتی استعداد سے کمایا ہے۔ اس لئے اس میں کسی دوسرے کے حق کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرے مقام پر قرآن کہتا ہے کہ یہ جواب ایک قارون ہی سے مختص نہیں۔ نظام سرمایہ داری کے حامل جہاں بھی ہوں ان کی طرف سے یہی جواب ملے گا۔ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ ۗ اِنَّ لَوْ لَوْكُنْ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (۳۹/۳۹) لیکن ان میں سے اکثر اس حقیقت کو نہیں جانتے کہ یہ ذہنیت کس قدر غلط اور ان کا یہ دعویٰ کس طرح بے بنیاد ہے۔ دیکھئے کہ قرآن اس کے لئے دلائل کیا دیتا ہے۔

آپ غور کریں گے تو بادی التعمق یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ انسان کی کمائی حسب ذیل عناصر کی مجموعی کار فرمائی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یعنی

(i) دماغی صلاحیت جو ہر بچے کو پیدائشی طور پر ملتی ہے۔

(ii) ابتدائی ماحول، تعلیم، تربیت کے اثرات۔

(iii) صلاحیت اور استعداد کے استعمال کے مواقع اور

(iv) انسان کی ذاتی محنت۔

ان عناصر میں سے پہلا عنصر — یعنی دماغی صلاحیت — جو اس ضمن میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ فطرت کی طرف سے دہمی طور پر (مفت، بطور عطیہ) ملتی ہے۔ اسے نہ اُس فرد نے قیمتاً خریدا ہوتا ہے۔ نہ یہ قیمتاً مل سکتی ہے۔ دوسرے اور تیسرے عناصر کا تعلق اس معاشرے سے ہے جس میں اُس بچے کی پرورش ہوتی ہے۔ اس پر بھی

قرآن کا فیصلہ

اس کا ذاتی اختیار کچھ نہیں ہوتا۔ صرف چوتھا عنصر — یعنی انسان کی ذاتی محنت — ایسی چیز ہے جسے وہ فرد اپنے اختیار و ارادے سے صرف کرتا ہے۔

اس مختصر سے تجزیے سے ظاہر ہے کہ ایک فرد جو کچھ کماتا ہے اس میں اُس کا حق صرف اتنے حصے پر ہو سکتا ہے جو اس کی ذاتی محنت کا نتیجہ ہو۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے یہ کہہ کر توجہ دلائی ہے کہ

لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى (۵۲/۳۹)

انسان صرف اسی کا حق دار ہے جس کے لئے وہ محنت اور کوشش کرے۔

اس بنیادی اصول کی رُو سے قرآن محنت اور سرمایہ کی اس نزاع کا فیصلہ کر دیتا ہے جو آغاز تاریخ سے آج تک انسانی معاشرہ کے لئے وجہ اضطراب اور باعث ہزار فساد بنا رہا اور بن رہا ہے۔

جہاں تک مختلف افراد میں دماغی استعداد کے فرق کا تعلق ہے، قرآن کہتا ہے کہ یہ اختلاف تقسیم کار کے لئے ہے۔ معاشرہ میں مختلف نوعیتوں کے کام ہوتے ہیں جو مختلف نوعیتوں کی استعداد چاہتے ہیں۔ اگر مختلف افراد کی استعداد میں فرق نہ ہو تو معاشرہ

اختلاف استعداد کیوں ہے

لے یہ اصول انسان کو یہ بات سمجھانے کے لئے ہے کہ سرمایہ کے زور پر دوسروں کی کمائی پر قبضہ کر لینا کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔ ورنہ جیسا کہ پچھلے ابواب میں بتایا جا چکا ہے قرآنی نظام میں ہر فرد کی ضروریات زندگی پورا کرنے کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے اس لئے اس میں محنت اور سرمائے کی نسبت سے تقسیم رزق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کا کاروبار نہ چل سکے۔ اس نے کہا ہے کہ

وَمَا فَعَلْنَا بِعَصْمَاءَ فَوْقَ بَعْضِ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سَخِرَ يَا

(۴۲/۱)

افراد میں اختلاف استعداد اس لئے ہے تاکہ ایک دوسرے سے مختلف نوعیتوں کے کام لئے جاسکیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ سائنٹیفک تحقیقات سے ان نقائص کو رفع کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جن کی بنا پر ایک بچے کی دماغی صلاحیتوں میں کمی رہ جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح رفتہ رفتہ ایسا زمانہ آجائے جب بچوں کی ذہنی استعداد میں کچھ زیادہ فرق نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ جب انسان ان امور میں اس قدر ترقی کرے گا تو اس معاشرہ کا معاشی نقشہ مختلف ہو جائے گا۔ لیکن جب تک استعداد کا اختلاف باقی ہے (اور معلوم ہوتا ہے کہ کچھ نہ کچھ فرق بہر حال باقی رہے گا۔ انسان دھات کی ڈھلی ہوئی مشین کا نام نہیں کہ ایک مشین اور دوسری مشین میں قطعاً کسی قسم کا فرق نہ ہو۔ یہ جیتا جاگتا اختیار و ارادہ کا حامل انسان ہے جو سینکڑوں قسم کے عناصر سے اثر پذیر ہوتا ہے)۔ قرآن کا ارشاد یہ ہے کہ یہ اختلاف صرف تقسیم کار کے لئے ہے، تقسیم رزق کے لئے نہیں۔ رزق کی تقسیم ضرورت کے لحاظ سے ہوگی۔ جن لوگوں کو کسب رزق کی زیادہ استعداد حاصل ہے وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ جس قدر کمائیں تمام کا تمام انہی کا حق اور حصہ ہے۔ ان کی کمائی کی زیادتی ان عناصر کی بنا پر ہے جن کے حصول میں ان کا ذاتی اختیار کچھ نہ تھا۔ اس لئے وہ ان عناصر کے حاصل میں سے اپنی ضرورت کے مطابق لینے کے حق دار ہیں۔ باقی ان لوگوں کا حق ہے جو کم ذہنی استعداد کی بنا پر ان کے زیر ہدایت کام کرتے ہیں۔ سورہ نحل میں ہے:-

وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضُكُمْ عَلَى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۖ فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُوا بِرَأْدِي دِرْهَمٍ قِيَمِهِمْ

عَلَىٰ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيهِ سَوَاءٌ ۗ أَفَبِعَدْمَةِ اللَّهِ يُجْحَدُونَ ۝ (۱۶/۷۱)

اللہ نے تم میں سے ایک کو دوسرے پر اکتساب رزق کی استعداد میں فضیلت دی ہے۔ جنہیں یہ استعداد زیادہ

ملی ہے وہ زیادہ رزق کو ان لوگوں کی طرف نہیں لوٹاتے جو ان کے ماتحت کام کرتے ہیں تاکہ یہ سب رزق میں

برابر نہ ہو جائیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں کہ انہیں استعداد کی زیادتی

خدا کی طرف سے بطور نعمت ملی ہے۔ ان کے ذاتی کسب و ہنر کی پیدا کردہ نہیں۔

حالانکہ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ (۱۶/۵۳) جو کچھ انہیں بطور نعمت ملا ہے وہ سب اللہ

کی طرف سے ہے۔ اس لئے جو کچھ اس بنا پر حاصل ہوتا ہے وہ بھی اللہ کا ہونا چاہیے۔ نہ کہ انسان کی ذاتی ملکیت۔

قرآن نے اس حقیقت کو (کہ رزق کی تقسیم ضرورت کے لحاظ سے ہونی چاہیے نہ کہ کمائی کے اعتبار سے) سورہ

نحل کی آیت (۱۶/۷۱) کے سیاق و سباق کی آیات میں نہایت دل نشین انداز سے واضح کیا ہے۔ جو کچھ اس نے کہا ہے اس

گھر کی مثال | اولے بھی۔ اب دیکھو کہ گھر میں سامانِ زیست کی تقسیم ہر فردِ خاندان کی ضرورت کے اعتبار سے ہوتی ہے یا کمائی کے لحاظ سے۔ اگر وہ کمائی کے لحاظ سے ہو تو بچوں کو بالکل محروم رکھا جانا چاہئے لیکن تم ایسا نہیں کرتے۔ بچوں کی ضروریات سب سے پہلے پوری کرتے ہو۔ اسی طرح بوڑھے بزرگوں کی بھی۔ سو جو اصول تم اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر ملحوظ رکھتے ہو اسے اپنے معاشرے (اور عالمگیر انسانیت) میں رائج کیوں نہیں کرتے؟ وہاں تقسیمِ رزق، ضروریات کی بجائے کمائی کی نسبت سے کیوں نہیں کرتے ہو؟ یہ اپنوں اور غیروں کا فرق تمہاری تنگ نظری کا پیدا کردہ ہے۔ خدا کا نہیں۔ خدا تمام نوعِ انسانی کے لئے "بزرگ خاندان" (رب العالمین) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے اس کا قانون یہ ہے کہ رزق کی تقسیم تمام افرادِ انسانہ میں، ضرورت کے لحاظ سے کی جائے، نہ کہ کمائی کی نسبت سے۔

ذرائع پیداوار | اکتسابِ رزق میں ایک اور عنصر بھی شامل ہوتا ہے جسے ذریعہ پیداوار (SOURCE OF PRODUCTION) کہتے ہیں۔ قرآن اس باب میں ارض (زمین) کو بنیادی حیثیت دیتا

ہے (اور اس کی حیثیت ہے بھی بنیادی) نزولِ قرآن کے زمانہ میں کارخانہ داری (INDUSTRY) کا رواج نہیں تھا۔ اس لئے اس نے اس کا خصوصیت سے ذکر نہیں کیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ کارخانہ داری (صنعت) کی بنیاد بھی اسی خام پیداوار پر ہے جو زمین سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے جس اصول کا اطلاق ارض پر ہو گا اسی کا اس کی فروعات پر بھی ہو گا۔

زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی | ارض کے سلسلہ میں قرآن نے اصولاً بتا دیا ہے کہ اسے تمام مخلوق کے فائدے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ وَالْأَرْضُ دَضَعَهَا لِلْأَنَامِ (۵۵/۱۰)۔ یہ معاش حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَسْتُ لَهُ بَرًا لِيَاقِينِ (۱۵/۲۰)

اور ہم نے اس میں تمہارے لئے اور ان کے لئے جنہیں تم رزق نہیں دیتے سامانِ معیشت پیدا کیا ہے۔

اس میں تمہارے اور تمہارے جانوروں کے لئے سامانِ معیشت ہے۔ مَثَاعًا لَّكُمْ ذَلِٰلًا لِّعَابِكُمْ (۷۹/۲۳) اس سے تم تمتع حاصل کر سکتے ہو۔ یعنی فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ ذاتی ملکیت قرار نہیں دے سکتے۔ فطرت کی طرف سے جس قدر اسبابِ زیست بطور نعمت ملے ہیں (مثلاً ہوا، پانی، روشنی، حرارت وغیرہ) انہیں تمام انسانوں کی ضروریات کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے۔ ان پر "ملکیت" صرف خدا کی ہے۔ جو شخص ان پر اپنی "ملکیت" کا دعویٰ کرتا ہے وہ خدا کا ہمسر بنتا ہے۔ اس

حقیقت کو قرآن نے واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔

قُلْ أَمَّا كُمْ فَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَندَادًا
ذَلِكَ رَبُّ الْعَالَمِينَ ۚ وَجَعَلَ فِيهَا رِوَا سِيًّا مِنْ فَوْقِهَا وَبُرُكًا فِيهَا وَقَدَرًا فِيهَا
أَقْوَاتَهَا فِي أَمْبَعَةٍ آيَاتٍ ۗ سَوَاءٌ لِلنَّاسِ عِلْمُنَ ۝ (۹-۱۰/۴۱)

ان سے کہو کہ کیا تم خدا (کی خدائی) سے انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو مراحل میں (اس طرح) پیدا کیا کہ وہ تمہارے رہنے کے قابل ہو گئی (خدا نے یہ اس لئے کیا کہ تمام نوع انسانی کی پرورش ہوتی رہے لیکن تم خدا کے ہمسر تراشتے ہو!

اس ربوبیت عامہ کے لئے اس نے زمین کے اندر سے پہاڑوں کو ابھارا (تاکہ وہ آب رسانی کا ذریعہ بن سکیں) اور زمین میں رزق پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کی۔ پھر موسموں کے تغیرات سے اس میں چار فصلوں کے پیمانے مقرر کر دیئے۔

لہذا اسے (زمین کو) تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے۔ (کسی کی ذاتی ملکیت نہیں

بن جانا چاہیئے۔)

اس نے جس طرح دوسرے شعبوں کے متعلق کہا تھا کہ رزق میں تمہارا حصہ اتنا ہی ہے جتنی تم محنت کرو۔ اسی طرح اس نے زمین کے سلسلے میں بھی کہہ دیا کہ اس کی پیداوار میں مختلف عناصر و قوی شامل ہوتے ہیں۔ تم ان پر غور کرو گے تو یہ حقیقت خود بخود سامنے آجائے گی کہ اس میں تمہارا حصہ کس قدر ہونا چاہیئے۔ اور "خدا" کا کس قدر۔ سورہ واقعہ میں اس حقیقت کو بڑے غاداب انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ جہاں کہا ہے کہ "أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَحْرُثُونَ" "کیا تم نے اس پر بھی غور کیا ہے جو تم بوتے ہو؟ تم زمین میں ہل جلاتے ہو اور تخم ریزی کرتے ہو اس کے بعد۔ "أَنْتُمْ تَزْرَعُونَ" "اور لکھنؤ (بج) کو فصل میں تم تبدیل کرتے ہو یا ہم کرتے ہیں؛ لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حَبًا مَّا فَطَرْنَاهُ تَفْلُحُونَ" اگر ہمارا قانونِ مشیت یوں نہ ہوتا، دوسری طرح ہوتا، تو ہم اسے جو را جو را کر دیتے۔ اور پھر تم ششدر اور حیران رہ جاتے۔ اور غم و اندوہ سے پکارا مٹتے کہ "إِنَّا لَمُعْرِضُونَ" "بل لکھنؤ محروم ہوں۔ ہم پر یہ سب خبی پڑ گئی۔ پیداوار کا ملنا تو ایک طرف، ہم بیج کے دانوں سے بھی محروم ہو گئے۔"

اس سے آگے بڑھو اور اس پانی پر غور کرو جس پر زیت کا دارو مداس ہے۔ "أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ" "آنتُمْ أَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ أَمْرِ رَبِّنَا" "کیا اسے تم بادلوں سے رسالتے ہو یا ہم رسالتے

ہیں لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ أُجَابًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ ۝ اگر ہمارا قانونِ مشیت یوں نہ ہوتا جس طرح وہ اب کار فرما ہے بلکہ دوسرے انداز کا ہوتا تو ہم اسے (سمندر کے پانی کی طرح جہاں سے اُٹھ کر وہ بادلوں کی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے) سخت نمکین بنا دیتے تو نہ تم اسے پی سکتے۔ نہ ہی اس سے کھیتی اگتی سو تم اس کی بھی قدر شناسی نہیں کرتے؛ اور آگے بڑھو۔ اَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّتِي تَأْتُونَ بِهَا شَرِبًا ۖ أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّتِي تَأْتُونَ بِهَا شَرِبًا ۖ أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّتِي تَأْتُونَ بِهَا شَرِبًا ۖ أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّتِي تَأْتُونَ بِهَا شَرِبًا ۖ

اگر تم ان مختلف چیزوں پر جو زندگی کی اساس ہیں غور کرو گے تو یہ حقیقت تم پر کھل جائے گی کہ یہ سب خدا کی طرف سے بطور عطیہ ملتی ہیں۔ اس میں تمہارے کسب و ہنر کا کوئی دخل نہیں۔ لَنْ جَعَلْنَاهَا فَاكْرًا ۚ یہ از خود موجود رہتی ہیں۔ تمہاری سعی و کاوش کی رہین منت نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ خدا نے انہیں بلا مزد و معاوضہ کیوں دیا ہے؟ ان سے مقصد کیا ہے؟ مقصد ہے: مَتَاعًا لِّلْمُقِيمِينَ ۚ تاکہ یہ بھوکوں کے لئے رزق کا سامان بن جائیں۔ یہ خدا کی رب العالمین کی ذمہ داری کو پورا کرنے کا ذریعہ بنیں۔ فَسَيَفْهَمُونَ بِمَا سَوَّاهُمْ رَبَّهُمْ لَأَلْعَبِئِنَّهُمْ أَلْعَبِئِنَّهُمْ أَلْعَبِئِنَّهُمْ ۝ (۴۳-۴۴/۵۶) سو تمہیں چاہیے کہ خدا کی ربوبیتِ عظمیٰ کے پروگرام کی تکمیل کے لئے پوری طرح جدوجہد کرو۔ یہ ایک مشترکہ کاروبار (BUSINESS) ہے جس میں سرمایہ خدا کا ہے۔ اور محنت تمہاری۔ اس کاروبار کے "منافع" (پیداوار) کو اسی نسبت سے بانٹ لو۔ اپنی محنت کا حصہ تم لے لو۔ اور "سرمایہ" کا حصہ خدا کو دے دو۔ اب سوال پیدا ہو گا کہ خدا کا حصہ کسے دیں۔ اس لئے وہ خود تو سامنے آتا نہیں۔ اس کے لئے خدا نے کہہ دیا ہے کہ ہمارا حصہ ان بھوکوں کو دے دو جن کی ضروریات زیادہ ہیں۔

اقبال نے انہی آیات کے مضمون کو ان حسین الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون	کون دریاؤں کی موجوں اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھتم سے باد سازگار	خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب
کس نے بھردی موتیوں سے خوشہ گندم کی کجیب	موتیوں کو کس نے سکھلانی ہے خوشے انقلاب

وہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں

تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں (بالِ جبریل ص ۱۶)

یہ سب دُرُثًا لِّلْعِبَاد (۵۰/۱۱) "خدا کے بندوں کے لئے سامانِ زیست ہے" اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ

يَعَذَابُ الْآلِيَةِ يَوْمَ يُخْتَلَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ تَتَكَلَّمُ بِهَا بِنَاتِهِمْ وَجُودُهُمْ
وَوَظُهُمْ هُمْ هَذَا مَا كُنْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۝ (۹/۳۳)

جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ (نوع انسانی کی بہبود) کے لئے کھلا نہیں رکھتے؛ تو انہیں دردناک عذاب کی اطلاع دے دے۔ جس دن دھات کے ان سکوں کو آگ میں تپایا جائے گا اور پھر ان سے ان کی پیشانیوں پہلوؤں اور پیٹھ کو داغ دیا جائے گا کہ یہ ہے وہ دولت جسے تم نے اپنے لئے جمع کر رکھا تھا سو اب اس ذخیرہ اندوزی کا مزہ چکھو۔

نظام سرمایہ داری شر ہے | اس نظام کو (جس میں فاضلہ سامان زیست کو جنس یا روپے کی شکل میں روک کر رکھا جاتا ہے) قرآن مجل کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ یہ نظام خیر GOOD نہیں شر EVIL ہے۔ سورہ آل عمران میں ہے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخُلُونَ بِمَا أَنعَمَ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۖ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۖ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخُلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ وَاللَّهُ يَبْرِئُ السَّمْعَاتِ وَالْأَبْصَارِ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝ (۳/۱۸۰)

جو لوگ اس سامان زیست کو جسے اللہ نوع انسانی کی معاشی سہولتوں کے لئے عطا کرتا ہے روک رکھتے ہیں۔ یہ نہ سمجھ لیں کہ ان کا یہ طرز عمل موجب خیر ہے نہیں۔ یہ ان کے لئے شر ہے۔ جب اس غلط نظام معیشت کے نتائج برآمد ہوں گے تو یہ ذخیرہ کردہ مال ان کے گلے کا ہار ہو جائے گا۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ کائنات کی پستیوں اور بلند یوں میں جو کچھ ہے سب خدا کی ملکیت ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اس کا اللہ کو علم ہے۔

وہ کہتا ہے کہ یہ نظام اور اس کی حامل قوم دنیا میں باقی نہیں رہ سکتی۔ یہ نظام تباہ ہو کر رہے گا۔ اس کی حامل قوم کی جگہ دوسری قوم آئے گی جو اس نظام سے مختلف نظام کی حامل ہوگی۔

هَآأَنْتُمْ هُوَآ لَآ وَ تَدَاعُونَ لِتُنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ ۚ فَمِمَّا كُنْتُمْ مِّنْ يَّبْخُلُونَ ۗ وَمَن يَّبْخُلْ فَاِنَّمَا يَخْضَلْ عَن نَّفْسِهِ ۗ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ ۗ وَاَنْتُمْ الْفُقَرَاءُ ۗ وَاِن تَتَوَتَّوْا يَسْتَبَدِلْ قَوْمًا خَيْرٌ كُمْ لَا تُشْعُرُوْنَ ۗ لَآ يَكُوْنُوْنَ اَمْثَالِكُمْ ۝ (۴/۳۸)

تم وہ ہو جن سے کہا جاتا ہے کہ تم (اپنی فاضلہ دولت کو) خدا کی راہ (نوع انسانی کی ربوبیت) کے لئے کھلا رکھو۔ لیکن تم میں سے وہ بھی ہیں جو اسے روک کر رکھتے ہیں۔ سو انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جو اس طرح دوسروں کو

سامانِ رزق سے محروم رکھتا ہے وہ درحقیقت خود اپنے آپ کو (زندگی کی مستقل شادا ایوں سے محروم) رکھتا ہے۔ اللہ کو تمہارے مال کی ضرورت نہیں۔ وہ تمہارا محتاج نہیں۔ تم اس کے محتاج ہو۔ وہ جس راستے کی طرف تمہیں بلاتا ہے اس میں خود تمہارا ہی فائدہ ہے۔ اگر تم اس راستے سے گریز کی راہیں اختیار کرو گے تو یاد رکھو وہ تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئے گا جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔

تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جن قوموں نے اپنے ہاں سرمایہ دارانہ نظام کو رائج کیا وہ تباہ و برباد ہو گئیں۔ وہ قوت اور دولت میں تم سے بڑھ کر تھیں (۲۱/۱۱۱)۔ جو حشر ان کا ہوا وہی تمہارا ہوگا۔ اس لئے کہ غلط نظامِ زندگی ہر جگہ ایک جیسا نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ صحیح نظامِ زندگی یہ ہے کہ تم اکتسابِ رزق کے لئے زیادہ سے زیادہ محنت کرو۔ اس میں سے اپنی ضرورت کے مطابق رکھ لو اور باقی سب دوسروں کی پرورش کے لئے عام کر دو۔

قُلِ الْعَفْوَ | بِسْئَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ۝ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹)

تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کے لئے کھلا رکھیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زائد ہے سب کا سب۔

اس لئے کہ سامانِ زیستِ زندگی کی ضروریات پورا کرنے کے لئے نہ کہ ذخیرہ کرنے اور اس طرح دوسروں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے ہے۔

یہ ہے وہ نظامِ زندگی جسے قرآن تجویز کرتا ہے۔ لیکن وہ اس نظام کو اس مکمل اور آخری شکل تک بتدریج لے جاتا ہے۔ قرآن میں صدقہ، خیرات، وراثت وغیرہ کے احکام اسی عبوری دور سے متعلق ہیں جب یہ نظام ہنوز اپنی آخری شکل میں تکمیل نہ ہوا ہو۔ اس عبوری دور کے احکامات میں بھی آپ دیکھتے کہ قرآن کس طرح بتدریج، غیر شعوری طور پر معاشرہ کو مکمل نظامِ ربوبیت کی طرف لے جاتا ہے۔

عبوری دور کے احکام | صدقات و خیرات، والدین و اقربین سے احسان، وراثت میں ترکہ کی تقسیم سے اس کے پھوٹے پھوٹے ٹکڑے کرتے چلے جانا، قرضہ دینے میں ربو کی ممانعت، قرضہ کی واپسی میں مقروض کی ہر طرح کی رعایت، دولت کے متعلق حکم کہ وہ ادب پر کے طبقے میں ہی گردش نہ کرتی رہے (۵۹/۷)۔ قرآن ایک طرف ان احکام کی رو سے ربوبیتِ عامہ کی راہیں صاف کرتا چلا جاتا ہے اور دوسری طرف نظامِ ربوبیت کے قیام کے پروگرام پر عمل پیرا ہونے کی تاکید کئے جاتا ہے۔ اسی طرح منفی اور مثبت سلبی اور ایجابی طریق سے اپنے نظام کو متشکل کر دیتا ہے۔

جب یہ نظام اپنی مکمل شکل میں قائم ہو جاتا ہے تو پھر نہ کسی کے پاس فاضلہ دولت رہتی ہے نہ عبوری احکام کی

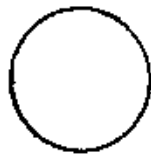
ضرورت۔ جو اپنا سب کچھ (زائد از ضرورت) خدا کی راہ میں دے دے اس سے یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی کہ وہ اپنے مال میں سے اتنے فیصد "نکوۃ" دے۔ یہی وجہ تھی کہ نبی اکرمؐ نے ساری عمر زکوٰۃ نہیں دی۔ (کیونکہ حضورؐ فاضلہ دولت اپنے پاس رکھتے ہی نہ تھے) نہ ہی آپؐ نے کوئی چیز بطور ترکہ چھوڑی جسے ورثاء میں تقسیم کیا جائے۔ یہ اسلام کی آخری اور مکمل شکل تھی جسے نبی اکرمؐ نے اپنے اسوہ حسنہ میں پیش کر دیا اور جس تک امت کو بتدریج پہنچانا مقصود تھا۔ اس نظام میں نوع انسانی کی نجات و سعادت کا راز مضمر ہے۔ نجات اس جہنم سے جس میں انسانیت غلط نظام زندگی کی وجہ سے مبتلائے عذاب ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ نظام سرمایہ داری کے حاملین کی مفاد پرستیاں کچھ ہی کیوں نہ کر لیں یہ انقلاب آکر ہے گا۔

إِنَّ السَّاعَةَ لَأْتِيَةٌ ۖ لَا رَيْبَ فِيهَا ۚ وَ لِيَكُنَّ أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ (۴۷/۵۹)

اُس دور میں "جس طرح خدا کی بادشاہت آسمانوں پر ہے اسی طرح زمین پر بھی اس کا تحت اجلال کچھے گا۔" اس وقت انسان اس حقیقت کو محسوس شکل میں اپنے سامنے دیکھ لے گا کہ

وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَهُ ۖ وَ فِي الْأَرْضِ إِلَهُ ۖ (۲۳/۸۴)

"بیشک خارجی کائنات میں بھی اسی کا اقتدار و قانون کارفرما ہے اور انسانوں کی دنیا میں بھی اسی کا قانون۔" یہ ہے اسلام کا منتهی و مقصود۔ یعنی نظام ربوبیت کا علی وجہ البصیرت قیام۔ اس نظام کی بنیاد اس آئیڈیالوجی (ایمان) پر ہے جس کا ذکر سابقہ ابواب میں آچکا ہے، اور یہی وہ بنیادی فرق ہے جو اسے مغرب کی جمہوریتوں اور روس کے اشتراکی نظام سے منفرد اور ممتاز کرتا ہے۔



سیاسی نظام

جب انسانوں نے مل جل کر رہنا شروع کیا تو ان کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ اس ٹکراؤ سے باہمی تنازعات پیدا ہوئے۔ اس سے اس ضرورت کا احساس بیدار ہوا کہ کوئی ایسی تدبیر کی جائے جس سے یہ ٹکراؤ پیدا نہ ہو اور اگر ٹکراؤ پیدا ہو جائے تو باہمی کشمکش اور تنازعات کا فیصلہ عمدگی سے ہو جائے تاکہ معاشرہ فساد اور جنگ و جدل سے محفوظ رہے۔ اس سے نظام سیاست کے تصور کی ابتداء ہوئی۔ ابتداء ہوئی تو اس ضرورت کے ماتحت، لیکن جن لوگوں نے جھگڑے پٹانے اور فیصلے کرانے کا کام اپنے ذمہ لیا، انہوں نے محسوس کیا کہ دوسروں سے اپنا حکم منوانے میں بڑی لذت ملتی ہے۔ اس لئے انہوں نے ایسی تدابیر سوچنی شروع کیں جن سے ان کے ہاتھ میں آیا ہو اقدار چھیننے نہ پائے۔ اس سے معاشرہ میں دو طبقے پیدا ہو گئے۔ ایک طبقہ وہ جو دوسروں سے اپنا حکم منواتا تھا اور دوسرا وہ جو ان کا حکم مانتا تھا۔ بعض اوقات حکمران طبقہ سے اس کا اقدار اور اختیار چھیننے کے لئے کوئی دوسرا فریق کھڑا ہو جاتا۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ محکوم طبقہ حکمران طبقہ کے **حاکم و محکوم کی کشمکش** | خلاف سرکشی پر آمادہ ہو جاتا۔ آپ غور کیجئے تو انسانیت کی ساری تاریخ اسی کشمکش کی داستان نظر آئے گی۔ یعنی

(i) حکمران طبقہ کی کوشش کہ ان کے اقدار و اختیار کی گریں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جائیں۔

(ii) فریق مقابل کی خواہش کہ وہ اقدار ان کے ہاتھ میں آجائے۔

(iii) محکوم طبقہ کی سرکشی اور حکمران طبقہ کی کوشش کہ انہیں دبا کر رکھا جائے۔

(iv) اور ارباب فکر و بصیرت کی یہ کاوش کہ ایسی کون سی تدبیر کی جائے جس سے معاشرہ میں سیاسی نظام بھی قائم

رہے اور حاکم و محکوم میں کشمکش بھی نہ پیدا ہونے پائے۔

قبل اس کے کہ ہم دیکھیں کہ قرآن کریم نے اس مسئلہ کا کیا حل پیش کیا ہے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس داستان کے اہم ٹکڑوں کو سامنے لایا جائے۔ اور یہ بھی دیکھا جائے کہ ارباب فکر و بصیرت نے اس باب میں کیا کیا کوششیں اور کاوشیں کی ہیں۔

شروع شروع میں انسان قبائلی زندگی بسر کرتا تھا۔ یعنی ایک خاندان کے افراد مل جل کر رہتے تھے۔ اسے ان کا قبیلہ کہا جاتا تھا۔ قبیلہ کا بزرگ، واجب الاحترام سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے باہمی نزاعات کے فیصلے کرنے کا فریضہ اسی کا ذمہ تھا۔ اس کا فیصلہ ہر ایک کے لئے واجب الاتباع تھا۔ رفتہ رفتہ ان بزرگان خاندان کے دل میں بھی جذبہ حکومت نے انگڑائیاں لینی شروع کر دیں اور وہ اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے اور پائیدار بنانے کی تدابیر سوچنے لگے۔ اس کے لئے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ بزرگوں کی اطاعت ہر حالت میں فرض ہے۔ یعنی بچوں کے لئے ہی نہیں، بلکہ انسان عمر کے کسی حصے میں بھی کیوں نہ ہو، اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنے تمام معاملات کے فیصلوں کے لئے بزرگوں کی طرف رجوع کرے۔ بزرگوں کے یہی فیصلے رفتہ رفتہ قبائلی رسوم و رواج کی شکل اختیار کر لیتے تھے جن سے اخراج، سخت جرم سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح زندہ اور مرہ، دونوں قسم کے بزرگوں کی اطاعت ایسی پابندی بن جاتی تھی جس سے کوئی شخص روگردانی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ حکومت کی اولین شکل تھی۔

انسان کی ابتدائی زندگی میں مذہبی پیشواؤں (PRIESTS) کو بہت بڑا مقام حاصل تھا۔ اب بھی جہاں جہاں جہالت اور توہم پرستی کا دور دورہ ہے، مذہبی پیشواؤں کی پرستش ہوتی ہے) وہ مافوق الفطرت قوتوں کے حامل اور خداوندی اختیارات کا عقیدہ اور کا پنتا تھا اور ان کے کسی حکم کی خلاف ورزی کا تصور تک بھی دل میں نہیں لاسکتا تھا۔ ان مذہبی پیشواؤں نے عوام کی اس عقیدہ تمندی کا فائدہ اٹھایا اور اپنے دائرہ اقتدار کو پرستش گاہوں کی چار دیواری سے آگے بڑھا کر دنیاوی حکومت کے ایوانوں تک لے گئے۔ اس کے لئے انہوں نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ وہ خداوندی اختیارات (DIVINE RIGHTS) کے حامل ہیں۔ یعنی انہیں خدا نے حکومت کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ ان کے احکام خود خدا کے احکام ہیں۔ ان کی اطاعت خدا کی اطاعت اور ان کی معصیت خدا کی معصیت ہے۔ جس کی سزا اس دنیا میں عبرتناک عذاب ہے اور اگلی دنیا میں جہنم کی عقوبت ہے۔ جب دنیاوی حکمرانوں نے دیکھا کہ لوگوں سے اپنی اطاعت کرانے کا یہ طریقہ بڑا آسان اور نہایت کامیاب ہے۔ اس لئے کہ اس میں جہنم کی بجائے دلوں

اور روموں پر حکومت ہوتی ہے جس کے لئے نہ کسی پولیس کی ضرورت پڑتی ہے، نہ فوج کی حاجت — تو انہوں نے مذہبی پیشواؤں سے گٹھ جوڑ پیدا کیا۔ اس طرح راجہ ایشور کاوتارا اور بادشاہ ظل اللہ علی الامرض (زمین پر خدا کا سایہ) قرار پا گیا اور وہ اپنے احکام و فرامین کو خدا کے احکام کی حیثیت سے منوانے لگا۔ (انسانوں کے خود ساختہ مذہب نے حکومت کی اس شکل کو بڑی تقویت پہنچائی ہے۔ تاریخ کے نوئی اوراق اس پر شاہد ہیں کہ ان "خدائی فوجداروں" کے ہاتھوں نوع انسانی پر جس قدر مظالم خدا کے نام پر ہوئے ہیں، شیطان بچارے کے حصے میں ان کا **تھپا کرہیسی** عشر عشر بھی نہیں آیا ہوگا۔ اس نظام سیاست کو تھپا کرہیسی کہتے ہیں جسے عیسائیت نے خاص طور پر فروغ دیا تھا۔ دانی کونٹیمویل، عیسائیت پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے۔

اس نے بادشاہوں کے آسمانی حقوق کے عقیدہ کی تاکید کی۔ اس لئے یورپ کی تاریخ میں اس عقیدہ نے جس

(BELIEF AND ACTION)

قدرت باہیاں پھیلائی۔ ان کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے۔

یہ تو تھا مختلف تدابیر سے اپنے اقتدار کو قائم رکھنا۔ اس کے برعکس ایسا بھی ہوا کہ کسی قبیلہ یا قوم میں جو شخص سب سے زیادہ جسمانی قوت رکھتا تھا، یا جس نے سب سے زیادہ مادی قوت فراہم کر لی، اس نے باقیوں کو دبا کر اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ذرا غور کرنے سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ حکومت کا یہ نظریہ شروع سے آج تک مسلسل کار فرما چلا آرہا ہے۔ اسلوب و انداز اور اسباب و ذرائع میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں لیکن اصول ہر جگہ یہی کار فرما ہوتا ہے کہ جس کی لاکھی اس

جس کی لاکھی اس کی بھینس

کی بھینس، انسان کے عہد جہالت و بربریت میں بھی یہی ہونا تھا اور آج زمانہ تہذیب و تمدن میں بھی یہی ہو رہا ہے۔

جب ان ارباب فکر و نظرنے جو حالات پر گہری نظر رکھتے تھے، یہ دیکھا کہ معاشرہ کے اجتماعی نظام کی ضرورت کس مقصد کے لئے پیش آئی تھی اور اس سے فائدہ کیا اٹھایا جا رہا ہے، تو انہوں نے اس نظام کو اپنی دانست کے مطابق صحیح خطوط پر متشکل کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے کہا کہ افراد معاشرہ کو باہمی رضامندی سے یہ طے کرنا چاہیے کہ مملکت میں افراد کے حقوق و فرائض کیا ہوں گے اور حکومت کے فرائض و واجبات کیا، فریقین کے ان طے شدہ حقوق و واجبات کی توثیق ایک معاہدہ کی رو سے ہو جانی چاہیے۔ اس نظریہ کو

نظریہ پیشاق

(THEORY OF CONTRACT) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ نظریہ قدیم یونان سے چلا آرہا تھا لیکن اٹھارویں صدی

(عیسوی) میں اسے یورپ میں ہابز (HOBBS) لاک (LOCKE) اور روسو (ROUSSEAU) نے خاص طور پر فروغ

دیا۔ موجودہ ڈیموکریسی (جمہوریت) کی بنیاد اسی نظریہ پر ہے۔ یعنی "لوگوں کی باہمی رضامندی سے حکومت"

نظام سیاست کے سلسلہ میں دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معاملات کا آخری فیصلہ کس کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ اسے اقتدارِ اعلیٰ یا (SOVEREIGNTY) کہتے ہیں۔ جب زمامِ اقتدار مذہبی پیشواؤں یا بادشاہوں کے ہاتھ میں تھی تو **اقتدارِ اعلیٰ** اس وقت یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ (ہمارے زمانے میں) بادشاہوں کی جگہ ڈکٹیٹروں نے لے لی ہے۔ اس لئے ان کی حکومت میں بھی یہ سوال پیدا نہیں ہوتا۔ مذہبی پیشوا، بادشاہ یا ڈکٹیٹر، خود مقتدرِ اعلیٰ ہوتے ہیں۔ لیکن جب اندازِ حکومت جمہوری قرار پایا، تو اس وقت اس سوال نے اہمیت اختیار کر لی۔ روسو کے نزدیک "اقتدارِ اعلیٰ" مملکت کے تمام باشندوں کی مشترکہ ملکیت ہے۔ لیکن لاک کے خیال میں یہ اقتدار افراد کی اکثریت کے پاس ہونا چاہیے۔ میٹم بھی لاک کا ہمنوا ہے۔ ڈیماکریسی نے اسی اصول کو اختیار کیا ہے۔ اس کے برعکس، مارکس کا نظریہ یہ ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ اس طبقہ کو حاصل ہوتا ہے جس کے پاس وسائل پیداوار ہوں۔ نظام سرمایہ داری میں سرمایہ دار طبقہ کو۔ اشتراکی نظام میں مزدوروں کو۔ ہمارے دور میں جمہوری نظریہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اکثر متمدن قومیں اس کی حامل ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، اس نظریہ کی بنیاد حسبِ ذیل مفروضات پر ہے۔

جمہوری نظام (i) اس اندازِ حکومت میں حاکم و محکوم کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔ اس میں "عوام کی حکومت، عوام کے مفاد کی خاطر، عوام ہی کی وساطت سے" کا اصول کارفرما ہوتا ہے۔ یعنی

(GOVERNMENT OF THE PEOPLE, BY THE PEOPLE, FOR THE PEOPLE)

(ii) عوام کا انتشار ان نمائندگان کے ذریعے معلوم ہو سکتا ہے۔

(iii) کسی بات کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار ان نمائندگان کی کثرت رائے ہوتا ہے۔

(iv) اقلیت کو اکثریت کے فیصلے صحیح تسلیم کرنے ہوتے ہیں۔

یہ وہ نظامِ حکومت ہے جس پر انسان اپنی مدتِ العمر کے تجارب کے بعد پہنچا ہے اور مغربی مفکرین کے نزدیک اس نظام سے بہتر نظام کا تصور ناممکن ہے۔ اس نظام کو آیہ رحمت اور ضامن ہزار برکات و سعادت سمجھا جاتا ہے۔ اس کی تائید کرنے والوں کو حق و صداقت کے شاہد اور نوعِ انسان کے ہمدرد و بھی خواہ اور اس کی مخالفت کرنے والوں کو انسانیت کا مجرم خیال کیا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ مغرب کے عملی تجربہ نے اس نظامِ حکومت کو فی الواقع ایسا ثابت کیا ہے یا وہاں کے مفکرین و مدبّرین کسی اور نتیجے تک پہنچے ہیں۔ ان مفکرین و مدبّرین سے مراد ان ممالک کے اربابِ فکر و سیاست ہیں جہاں جمہوری نظام قائم ہے۔

لندن یونیورسٹی کا پروفیسر الفریڈ کو بن (ALFRED COBBAN) اپنی کتاب (THE CRISIS OF CIVILIZATION) میں تہذیب مغرب کے زوال کے اسباب پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے کہ ان میں سب سے بڑا سبب ان کا جمہوری نظام ہے (جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے) اس نظام کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ اس میں "حاکم اور محکوم" میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ پروفیسر کو بن اس مفروضہ کے متعلق لکھتا ہے:-

جمہوریت کی ناکامی اگر سیاست کو نظری حیثیت سے نہیں بلکہ عملی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ حاکم اور محکوم کو ایک ہی تصور کرنا عملی ناممکنات میں سے ہے۔

عملاً، حکومت افراد کے ایک طبقہ پر مشتمل ہوتی ہے اور رعایا، افراد کے دوسرے طبقہ کا نام ہوتا ہے۔ جب معاشرہ اپنی ابتدائی قبائلی زندگی سے ذرا آگے بڑھ جائے تو پھر حاکم اور محکوم کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ یہ سمجھ لینا کہ کہ دونوں ایک ہی مملکت میں بدترین قسم کی آزادی اختیارات پیدا کر دیتا ہے۔ (صفحہ ۶۸)

کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر (A.C. EWING) نے ۱۹۲۶ء میں ایک کتاب بہ عنوان (THE INDIVIDUAL, THE STATE AND WORLD GOVERNMENT) شائع کی تھی جس میں اس نے ڈیما کریسی کے متعلق بڑی شرح و بسط سے بحث کی ہے۔

بحث کے دوران میں وہ کہتا ہے کہ روسوں نے یہ سمجھا تھا کہ نظام جمہوریت میں استبداد یا غصب حقوق کا خطرہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ لوگ خود اپنے اوپر آپ ظلم نہیں کریں گے نہ اپنے حقوق خود غصب کریں گے۔ لیکن

اگر روسو عصر حاضر میں جمہوری نظام کے عملی تجربہ سے پہلے اپنی کتاب نہ لکھتا تو وہ نظام جمہوریت کے متعلق کبھی ایسی خوش فہمی سے کام نہ لیتا۔ (صفحہ ۱۱۶)

رینی گون (RENE GUENN) اس باب میں لکھتا ہے:-

اگر لفظ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ خود اپنی حکومت آپ قائم کریں تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہے جس کا وجود ناممکنات میں سے ہے، جو کبھی نہ پہلے وجود میں آئی ہے اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ یہ کہنا ہی جمع بین التقیضین ہے کہ ایک قوم بیک وقت حاکم بھی ہو اور محکوم بھی..... حاکم اور محکوم کا تعلق دو الگ الگ عناصر کے وجود کا متقاضی ہے۔ اگر حاکم نہیں تو محکوم بھی نہیں۔ ہماری موجودہ دنیا میں جو لوگ کسی نہ کسی طرح قوت اور اقتدار حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں یہ عقیدہ قائم کر دیں کہ (ان پر کوئی حاکم نہیں بلکہ) وہ خود اپنے آپ پر حاکم ہیں..... عام رولہ تہد مہندگی کا اصول اسی فریب دہی کی خاطر وضع کیا گیا ہے (اس اصول کی رو سے)

(UNIVERSAL SUFFRAGE)

سمجھایا جاتا ہے کہ قانون اکثریت کی مرضی سے وضع ہوتا ہے۔ اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اکثریت کی مرضی ایک ایسی شے ہے جسے نہایت آسانی سے ایک خاص رُخ پر لگایا بھی جاسکتا ہے اور بدلا بھی جاسکتا

(THE CRISIS OF THE MODERN WORLD; P-106)

ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے اس حقیقت کا ایک بار پھر سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ مفکرین، جمہوری نظام کی جس خرابی پر اس شد و مد سے تنقید کر رہے ہیں اس نظریہ کا یہ مفروضہ ہے کہ اقتدار اعلیٰ (یعنی قانون سازی کا لامحدود اور غیر مشروط حق) عوام کو حاصل ہے اور عوام کا یہ حق ان کے نمائندوں کی اکثریت کی وساطت سے برٹے کا رہتا ہے۔ بالفاظ دیگر اس نظریہ کی رو سے یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ ملک کے نمائندگان کی اکثریت جو قانون بنائے وہ ملک کے تمام افراد کا متفقہ فیصلہ ہوتا ہے اور ہر حال میں حق و صداقت پر مبنی۔ ان مفکرین کے نزدیک یہ اس نظریہ کی بنیادی کمزوری ہے اور تباہی کا باعث۔ اس ضمن میں

(H.N. MENCKEM) اپنی کتاب (TREATISE ON RIGHT AND WRONG) میں لکھتا ہے۔

تمام ناکامیوں میں سب سے بڑی ناکامی خود انسان کی ہے۔ اس انسان کی

سب سے بڑی ناکامی

جو سب سے زیادہ مدنی الطبع حیوان اور سب سے زیادہ عقلمند ہے۔ وہ ناکامی

یہ ہے کہ یہ اپنے لئے آج تک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکا جسے دُور سے بھی اچھی حکومت کہا جاسکے۔ اس لئے

اس باب میں بڑی بڑی کوششیں کی ہیں بہت سی ایسی جو فی الواقع محیر العقول ہیں اور بہت سی ایسی جو بڑی

جرات آزمائشیں لیکن جب انہیں عملاً برٹے کا دلانے کا وقت آیا تو نتیجہ حسرت و یاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا

سبب یہ ہے کہ نظری طور پر حکومت کا خاکہ کھینچ لینا اور بات ہے اور عملی طور پر اسے نافذ کرنا اور بات۔ نظری

طور پر حکومت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ افراد مملکت کی ضروریات زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اور اس باب حکومت

پہلک کے خدام ہیں لیکن عملاً دیکھئے تو حکومت اپنا فریضہ پہلک کی خدمت نہیں بلکہ سلب و نہب سمجھتی ہے۔۔۔

اس باب میں مختلف اسالیب حکومت میں سب سے زیادہ ناکام جمہوری نظام رہا ہے۔ جمہوری نظام کے ارباب

حل و عقد خوب جانتے ہیں کہ حکومت کی بنیاد معقولیت پر ہونی چاہیے۔ لیکن ان کا جذبہ محرکہ کبھی معقولیت پسندی

نہیں ہوتا۔ ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ جو عنصر بھی باہر سے زیادہ دباؤ ڈال سکے اس کا ساتھ دیا جائے۔ چنانچہ اس

ہتھکنڈے سے وہ ان لوگوں کی وساطت سے جو فی الحقیقت پہلک کے دشمن ہوتے ہیں، لامحدود عرصہ تک

برسر اقتدار رہتے ہیں۔ (ص ۲۳۴)

۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ کی ثقافتی مجلس (UNESCO) نے ایک تحقیقاتی کمیٹی اس غرض سے قائم کی تھی کہ وہ جمہوری

U.N.O. کی تحقیق

اندازہ حکومت کے متعلق سائنٹفک انداز سے چھان بین کرے۔ اس کمیٹی نے دنیا بھر کے مفکرین و مدبرین سے جمہوریت سے متعلق مقالات حاصل کئے اور انہیں ایک کتابی شکل میں شائع

کر دیا جس کا نام (DEMOCRACY IN A WORLD OF TENSION) ہے۔ اس کمیٹی نے سب سے پہلے یہ سوال پوچھا تھا کہ ڈیموکریسی کا مفہوم کیا ہے۔ جوابات کی اکثریت میں اعتراف کیا گیا ہے کہ یہ لفظ بالکل مبہم ہے۔ آج تک اس کا مفہوم ہی متعین نہیں ہو سکا۔ بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ”دورِ حاضر میں لفظ جمہوریت سے زیادہ بھل لفظ کوئی اور ہے ہی نہیں“ (صفحہ ۴۶)۔ اس کے بعد اس رپورٹ میں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا اکثریت کا فیصلہ ہمیشہ درست ہوتا ہے اور اس کے خلاف احتجاج کرنا جمہوریت کے خلاف ہے؟ اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ

یہ سمجھنا غلط ہے کہ اکثریت کا فیصلہ غلطی سے پاک ہوتا ہے۔ وہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے اقلیت کو حق حاصل ہے کہ وہ اکثریت کے خلاف ایجنڈیشن کرے اور اکثریت کے فیصلے کو بدلوا دے۔ (صفحہ ۵۴)

سابقہ صفحات میں ہم نے جمہوریت کے خلاف جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ مقصود نہیں کہ دنیا میں اس وقت جو مختلف نظام حکومت رائج ہیں، ہمارے نزدیک ان میں سے کوئی اور نظام جمہوریت کے مقابلہ میں بہتر ہے۔ بالکل نہیں۔ جو کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ انسانی فکرنے اپنی ساری تاریخ میں جو نظام سب سے بہتر تجویز کیا تھا، تجربے نے اس کے متعلق بھی یہ بتایا ہے کہ وہ بڑا ہی ناکام رہا ہے۔ یہ ناکامی درحقیقت جمہوریت کی ناکامی نہیں۔ نہ ہی اس سے یہ مقصود ہے کہ ان مدبرین و مفکرین کے نزدیک یا خود ہمارے نقطہ سنخیاں سے جمہوریت کے مقابلہ میں ملوکیت یا آمریت کامیاب نظام حکومت ہے۔ اس ناکامی کا حقیقی سبب وہ نظر یہ ہے جسے (SECULARISATION OF STATE) کہتے ہیں۔ اس نظریہ سے مفہوم یہ ہے کہ بادشاہ ہو یا ڈکٹیٹر جمہوری پارلیمان کی اکثریت ہو یا صدر مملکت، انہیں قانون سازی کا مطلق اختیار ہوتا ہے وہ جس قسم کا جی چاہے قانون بنالیں۔ جب جی چاہے اس میں رد و بدل کرویں یا اسے منسوخ کر کے اس کی جگہ کوئی اور قانون نافذ کر دیں۔ ان کے اس اختیار پر کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ کوئی ایسی غیر متبدل حدود نہیں ہوتیں جن سے وہ تجاوز نہ کر سکیں۔ ان کے مدون کردہ قانون کے غلط یا صحیح ہونے کے پرکھنے کے لئے کوئی خارجی معیار نہیں ہوتا۔ انسانی ذہن نے جو نظام حکومت بھی آج تک وضع کیا ہے، اس کی ناکامی کی بنیادی وجہ ہے۔ اور جب تک یہ وجہ موجود رہے گی کوئی نظام حکومت کامیاب نہیں ہو سکے گا۔

سوال یہ ہے کہ اگر غلط اور صحیح کے پرکھنے کے لئے کوئی مستقل، خارجی معیار نہ ہو اور قوم کے نمائندوں کی اکثریت کے

فیصلے ملک کا قانون بن جائیں، تو اس سے کیا نقصان ہوتا ہے؟ یہ سوال واقعی غور طلب ہے، اس کے سلسلہ میں سب سے پہلے اس حقیقت کو سامنے

اس سے کیا نقصان ہوتا ہے

رکھئے کہ قوم کے عام افراد ہوں یا ان کے نمائندے، نمائندوں کی اکثریت ہو یا اقلیت۔ یہ ہوں گے تو بالآخر انسان ہی۔ اور جو کمزوری ایک انسان میں ہو سکتی ہے وہ انسانوں کے گروہ میں بھی ہو سکتی ہے۔ اس لئے یہ باور کرنا ناممکن ہے اور جو ایسا فرض کر لیتا ہے وہ اپنے آپ کو فریب دیتا ہے کہ نمائندوں کی اکثریت ان امیال و عواطف اور کشش و جاذبیت سے مبرری ہو جائے گی جو انسان کے پاؤں میں لغزش پیدا کر دیتی ہے۔ لارڈ سنل (LORD SNELL) کے الفاظ میں۔

حکومتیں انسانوں پر مشتمل ہوں گی اور ہر انسان میں وہ کمزوریاں پائی جائیں گی جو نوع انسان کا خاصہ ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ تو زمین وضع کرتے ہیں اور ملک کی پالیسی تشکیل کرتے ہیں وہ دوسرے لوگوں سے کسی طرح بھی زیادہ شریف یا زیادہ ہوشمند نہیں ہو سکتے۔

(THE NEW WORLD: P-17)

آلڈوس ہکسلے (ALDOUS HUXLEY) اس باب میں لکھتا ہے۔

تاریخ میں کوئی زمانہ بھی ایسا نہیں گزرا جو یہ بتائے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں قوت و اقتدار آیا ہو ان میں سرکشی نہ پیدا ہو گئی ہو۔ اور ایسا باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ جو کچھ پیچھے سے ہوتا چلا آیا ہے وہ آج نہیں ہو گا یا آئندہ بھی ایسا نہیں ہوتا رہے گا۔

(SCIENCE, LIBERTY AND PEACE: P-41)

اس لئے اگر اکثریت کو بھی قانون سازی کے اختیارات بلا حدود و قیود دے دیئے جائیں تو اس کے ہاتھوں دوسرے انسانوں کے حقوق کبھی محفوظ نہیں رہ سکتے۔ یہ کچھ تو ہو گا اپنے ملک کے اندر رہنے والے انسانوں کے ساتھ، جہاں تک دوسرے ملکوں کے انسانوں کا تعلق ہے، انہیں انسان ہی نہیں سمجھا جائے گا۔

انسانوں کی تمدنی زندگی کی ابتداء قبائلی تقسیم سے ہوئی۔ قبیلہ درحقیقت خاندان ہی کی بڑھی ہوئی شکل کا نام تھا لیکن اس تفریق و تقسیم کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کے خون کا پیاسا تھا۔ ان میں باہمی محاسمت اور عداوت کی آگ سلگتی رہتی تھی اور ذرا سے اشتعال پر بھڑک اٹھتی تھی۔ پھر ایسا ہوتا کہ بعض قبیلے ایک دوسرے کے حلیف ہو جاتے اور اس طرح مستحکم گروہوں کا حلقہ وسیع ہو جاتا۔ نوع انسان نے زندگی کے دوسرے میدانوں میں جتنی جی چاہے ترقی کر لی ہو، لیکن اس تقسیم و تفریق کے اعتبار سے وہ آج بھی وہیں کھڑی ہے جہاں اس دورِ جہالت میں تھی۔ آج انسان اسی طرح قبیلوں میں بٹا ہوا ہے اس فرق کے ساتھ کہ اب قبیلہ کو قوم (نیشن) کہا جاتا ہے۔ قوم کی بنیاد، کہیں نسل کے اشتراک پر ہے اور کہیں وطن کے اشتراک پر۔ یعنی ایک نسل یا ایک وطن کے انسان، ایک قوم کے فرد اور دوسری نسل یا وطن کے انسان، دوسری قوم کے افراد۔ اگر یہ تقسیم و تفریق محض انتظامی مقاصد کے لئے ہوتی پھر بھی خیر تھی لیکن مختلف اقوام میں وہی محاسمت اور عداوت موجود ہے جو مختلف قبائل میں ہوتی تھی، بلکہ اس سے کہیں زیادہ شدید اور عمیق۔ پروفیسر کوہن اس باب میں لکھتا ہے۔

قومیت پرستی کا احساس نفرت سے پیدا ہوتا ہے اور عداوت پر پرورش پاتا ہے۔ ایک قوم کو اپنی ہستی کا احساس ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی دوسری قوم سے متصادم ہو۔ پھر ان اقوام کا جذبہ عداوت و پیکار اپنی قومی وحدت کی تکمیل پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ جو اپنی کوئی قوم اپنی خود مختاری کو مستحکم کر لیتی ہے تو پھر ان اقوام کو دبا کر دیکھ کر دیتی ہے جو اپنے لئے حق خود مختاری کی مدعی ہوں۔

THE CRISIS OF CIVILISATION P. 166

تاریخ قومیت، کا عالم FREDRICK HERTZ اپنی کتاب NATIONALITY IN HISTORY AND POLITICS میں لکھتا ہے :-

تاریخ بتاتی ہے کہ مختلف اقوام میں باہمی لڑائیوں کا سبب اس کے سوا شاید ہی کچھ اور ہو کہ یہ قومیں انسانوں کی مختلف جماعتیں تھیں جنہوں نے اپنے اپنے الگ نام رکھ لئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ (مثلاً) ایک انگریز کے دل میں کسی فرانسیسی یا ہسپانوی یا اطالوی کا نام نفرت اور حقارت کا خیال پیدا کر دیتا ہے۔ (صفحہ ۳۲۸)

برٹریڈ رسل اپنی کتاب THE HOPES FOR A CHANGING WORLD میں لکھتا ہے :-

ہمارے زمانے میں جو چیز معاشرتی روابط کو قومی حدود سے آگے بڑھانے میں مانع ہے وہ نیشنلزم ہے۔ اس لئے نیشنلزم نوع انسان کی تباہی کے لئے سب سے بڑی قوت ہے۔ پھر تماشا یہ ہے کہ ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی نیشنلزم بڑی خراب چیز ہے لیکن اس کے اپنے وطن کی نیشنلزم بہت اچھی ہے۔

عہد کہن کی قبائلی تقسیم اور دورِ حاضر کی قومی تقسیم میں ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ اب قومیت ایک سیاسی نظریہ نہیں رہی بلکہ اس نے ایک عقیدے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ یوں تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ مغرب نے مذہب کا لبادہ اتار پھینکا ہے اور اب وہ دیکر لا مذہب ہو چکی ہے، لیکن وہ لا مذہب نہیں ہوئی۔ اس نے اپنے مذہب کو تبدیل کر لیا ہے۔ اب اس کا مذہب 'قومیت پرستی' ہے۔ آئڈولس ہیکس کے الفاظ میں :-

نیشنلزم ایک بہت پرستانہ اور مشرکانہ مذہب کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ایسا مذہب جو فساد اور تفریق انسانیت کے لئے ایسا طاقتور ہے کہ کوئی توحید پرست مذہب فلاح و وحدت انسانیت کے لئے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نیشنلزم یا

نسل پرستی کا جذبہ بالکل پاگلوں کا مسلک ہے۔ THE PERENNIAL PHILOSOPHY P. 184 AND 203

اسی کی وضاحت اس نے اپنی دوسری کتاب SCIENCE, LIBERTY AND PEACE میں اس طرح کی ہے :-

لاڈو ایکشن لے ۱۸۶۲ء میں لکھا تھا کہ نیشنلزم کا مقصد آزادی یا خوشحالی نہیں، اس کے نزدیک مملکت ہی تمام مقاصد کا

معیار ہوتی ہے۔ اس لئے وہ مملکت کی خاطر سب کچھ قربان کر دیتی ہے۔ اس لئے اس کا انجام مادی، اخلاقی ہر قسم کی تباہی ہوگا۔ ایکنٹن کی یہ پیشگوئی کس طرح پوری ہوئی چلی جا رہی ہے۔ نیشنلزم نے جس قدر مادی نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی شاید پوری کی پوری نسل بھی نہ کر سکے۔ باقی رہی اخلاقی تباہی، سو یہ تباہی لاکھوں مردوں، عورتوں، بالخصوص بچوں کے لئے ناقابل تلافی ہے۔ نیشنلزم کی طرف سے جسے ہم نے وحدتِ انسانیت اور خدا کے عقیدہ کو چھوڑ کر ایک بت پرستانہ مذہب کی حیثیت سے اختیار کر رکھا ہے، ہمیں صرف یہی دو تحفے نہیں ملے۔ اس کی وجہ سے ساری دنیا قریب پچاس ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکی ہے جنہیں اقوامِ عالم کہا جاتا ہے۔ ان میں سے ہر قوم کا مملکتی مذہب ہے۔ یعنی خدا کے بجائے، قوم کی پرستش، جسے اعلیٰ اقدار کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ لہذا ان پچاس دیوتاؤں میں سے ایک دیوتا کا پجاری باقی انچاس پجاریوں کو ملیکیش تصور کرتا ہے۔ نیشنلزم اخلاق کی تباہی کا باعث اس طرح بنتی ہے کہ اس کی رُو سے عالمگیر انسانیت، خدا کے واحد اور احترامِ آدمیت کے تمام عقائد باطل قرار پاجاتے ہیں اور ان کے بجائے، علیحدگی، تکبر، انسانیت، خود اکتفا، کثافتیت کے عقائد پیدا ہو جاتے ہیں جن کا نتیجہ نفرت اور جنگ کا جواز ہی نہیں بلکہ وجوب ہوتا ہے۔

یہی پہلے، اپنی ایک اور کتاب END AND MEANS میں نیشنلزم اور اس کی تباہ کاریوں کے متعلق لکھتا ہے:-

ہر نیشنلزم ایک بت پرستانہ مذہب ہے، جس میں مملکت نے خدا کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔۔۔۔۔ یہ خدا بڑے سخت فرائض عائد کرتا ہے اور بڑی عظیم قربانیاں مانگتا ہے۔ چونکہ نوعِ انسان کے دل میں نیکی کی تڑپ اور عطش ہے اس لئے وہ اس خدا کی پرستار بن جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی پرستش کی ایک وجہ اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس سے انسان کے اسفل جذبات کی تسکین ہو جاتی ہے۔ نفرت اور دشمنی کے جذبات کی تسکین۔ نیز جرائم کی لذت۔

ذرا آگے چل کر یہی مصنف لکھتا ہے:-

یگ آف نیشنلزم نے "قوم" کی جو تعریف متعین کی ہے اس کی رُو سے قوم کے معنی میں ایسی سوسائٹی جسے جنگ کے لئے منظم کیا جائے۔۔۔۔۔ (جہاں تک اطلاق کا تعلق ہے) اس باب میں کیونسٹ ہوں یا نازی، فاشسٹ ہوں یا عام نیشنلسٹ، سب یکساں ہیں۔ سب کا ایمان یہ ہے کہ حصولِ مقصد کے لئے ہر قسم کا ذریعہ اختیار کر لینا جائز ہے اور سب کے نزدیک "مقصد" سے مراد ہے انسانوں کے ایک گروپ کا دوسرے گروپ پر غلبہ و تسلط۔ اس غلبہ و تسلط کے لئے ہر قسم کا تشدد اور فریب جائز ہے۔ یہ سب یہی وعظ کہتے ہیں کہ ہر فرد کو اپنا سب کچھ اسٹیٹ کے سپرد کر دینا چاہیے۔

باردیو NICOLAS BERDYAEV اپنی کتاب SLAVERY AND FREEDOM میں لکھتا ہے:-

اس سے زیادہ نفرت انگریز تصور اور کیا ہو سکتا ہے کہ اسٹیٹ یا سوسائٹی یا نیشن کو خدا بنا لیا جائے اور پھر اس کی اس حیثیت کو اس امر کی دلیل قرار دے دیا جائے کہ اسے فرد پر غلبہ و استیلا کا حق حاصل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاست کا تمام تر مدار جھوٹ پر ہے۔ اس لئے انسانی اخلاق کا مطالبہ ہونا چاہیے کہ دنیا سے سیاست کے وجود کو جتنا کم کیا جاسکے کر دیا جائے۔ سیاست ہمیشہ انسان کی غلامی کا مظہر ہوتی ہے۔ حیرت یہ ہے کہ شرافت و صداقت کو تو خیر چھوڑتے سیاست تو عقل کی بھی مظہر نہیں ہوتی۔ ان بڑے بڑے مدبرین اور سیاستدانوں کو دیکھئے۔ حرام ہے جو ان میں سے کسی نے کبھی کوئی بات عقل و شعور کی کی ہو۔

نیشنلزم کے متعلق ڈین آئج لکھتا ہے کہ

ہمارے سامنے ایک باطل مذہب ہے۔ یعنی مذہب نیشنلزم۔ یہ مذہب لائڈہ میت سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔
THE FALL OF IDOLS P.B.

اسی مذہب کی تباہ کاریوں کے متعلق آئج لکھتا ہے کہ

نیشنلزم کا عقیدہ تمام اقوام کو جنگ جو بنا دیتا ہے۔ اس میں محارب COMBATANT اور غیر محارب NON COMBATANT طبقہ میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ (صفحہ ۱۸۷)

نیشنلزم کے مذہب بن جانے کا نتیجہ یہ ہے کہ قومیت پرستی PATRIOTIOSM سب سے بڑی نیکی اور جذبہ حب الوطنی سب سے بلند جو ہر قرار پاچکا ہے۔ اس مذہب کا "کلمہ" یہ ہے

حُبُّ الْوَطَنِ كَا جَذْبِهِ

کہ "میرا ملک حق پر ہو یا باطل پر میں بہر حال اس کا ساتھ دوں گا۔"
(MY COUNTRY RIGHT OR WRONG
ROMELIN) کے الفاظ میں:-

مملکت کا بنیادی فریضہ اپنے مفاد کا تحفظ اور اپنی قوت کی نشوونما ہے۔ اسے کسی دوسری مملکت کے مفاد کا خیال صرف اس صورت میں رکھنا چاہیے جبکہ اس سے اس کے اپنے مفاد کے خلاف زد نہ پڑتی ہو۔ مملکت کا استحکام ہر اخلاقی تقاضے پر مقدم ہے اور اس کے لئے ہر قربانی جائز۔

(QUOTED BY MURRAY IN THE INDIVIDUAL AND THE STAT P. 216)

اسی سلسلہ میں HEGEDUS اپنی کتاب THE STAT OF THE WORLD P.13 میں لکھتا ہے کہ

محبت وطن انسان خواہ وہ کتنا ہی سچا محب وطن کیوں نہ ہو انسانی ترقی کا بدترین دشمن اور مقصد حیات کا

سخت ترین غدار ہوتا ہے۔

آپ اندازہ لگائیے کہ جب صورت یہ ہو جائے کہ

(۱) دنیا کے انسان مختلف قوموں میں بٹے ہوتے ہوں۔

(۲) ہر قوم کو اپنے اپنے مفاد کی فکر ہو۔ موجودہ مفاد کے تحفظ کی ہی فکر نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ مفاد سمیٹ لینے کی

فکر۔ اور

(۳) کوئی ایسی حدود و قیود نہ ہوں جن سے اپنے مقصد کے حصول کے سلسلہ میں تجاوز کرنا معیوب سمجھا جائے تو دنیا کی

حالت کیا ہو جائے گی؟ وہی حالت جس کا نقشہ W.O. WAKEMAN نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ
 قومیں ایک دوسرے کے سامنے وحشی درندوں کی طرح کھڑی ہیں اور ان کے سامنے صرف ایک اصول رہ گیا ہے
 کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس"

QUOTED BY SPALDING IN CIVILIZATION IN EAST AND WEST

یہ نظریہ درحقیقت، میکیاؤلی تصور سیاست کا پیدا کردہ ہے جو اس وقت مغرب (بلکہ اس کے نتیجے میں) ساری دنیا پر چھایا ہوا ہے
 وہ تصور جس کی رو سے میکیاؤلی حکمران طبقہ کو تلقین کرتا ہے کہ

بادشاہ کے لئے صفتِ روباہی نہایت ضروری ہے تاکہ وہ دہل و فریب کے جال بچھل سکے۔ اُس کے ساتھ خوشے
 شیریں بھی ہوتا کہ وہ بھیڑوں کو خائف رکھ سکے۔ صرف شیر کی قوت کافی نہیں، اس لئے عقلمند بادشاہ وہ ہے کہ
 جب وہ دیکھے کہ کوئی عہد یا معاہدہ اس کے اپنے مفاد کے خلاف جاتا ہے یا جن وجوہات کے پیش نظر وہ معاہدہ
 کیا تھا وہ باقی نہیں رہیں، تو اسے بلا تامل توڑ ڈالے۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اس قسم کی عہد شکنی کے لئے نہایت

نگاہ فریب دلائل بہم پہنچائے جائیں۔ CHAPTER 18th

اور اس کا متبع، فریڈرک دوم انہیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ

کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ تم اپنے عوام کو چھپاؤ اور اپنے کیریئر کو ہمیشہ زیر نقاب رکھو..... صحیح حکمت
 عملی یہ نہیں کہ پہلے سے متعین کر لیا جائے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ حکمت عملی یہ ہے کہ حسبِ موقع جو صورت اپنے فائدے
 کی نظر آئے، اختیار کرنی جائے۔ اسی لئے میں تم سے ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ دوسری سلطنتوں سے معاہدات کر کے
 اپنے ہاتھ نہیں باندھ لینے چاہئیں۔ اپنے آپ کو ہمیشہ آزاد رکھنا چاہیے۔ میکیاؤلی نے کہا تھا جو سلطنت اپنے مفاد
 سے غافل ہو جاتی ہے، آخر الامر تباہ ہو جاتی ہے۔ میں اگرچہ (طبعاً) ایسے اصول کو پسند نہیں کرتا لیکن میکیاؤلی

سے متفق ہونے پر مجبور ہوں۔

ظاہر ہے کہ اس تصویرِ سیاست کی رُو سے اگر کسی کے دل میں کسی اخلاقی اصول کی پابندی کا خیال بھی پیدا ہو جائے تو اسے حکومت کے قابل نہیں سمجھا جائے گا۔ دال پول نے اسی لئے کہا تھا کہ

نیک آدمی کبھی کسی بڑی سلطنت کو بچا نہیں سکتے۔ اس لئے کہ سلطنتوں کو بچانے کے لئے جس حد تک چلے جانا

QUOTED BY SUSAN STEBBINGS

IN IDEALS AND ILLUSIONS P.14. بعض اوقات ضروری ہو جاتا ہے نیک آدمی وہاں تک جا نہیں سکتا۔

اور لارڈ ڈگرے کا عقیدہ تھا کہ ”سلطنتوں کے معاملات اخلاقی ضابطوں کی رُو سے طے نہیں پایا کرتے“ (ایضاً صفحہ ۱۳)۔ یہی وجہ ہے کہ پروفیسر جوڈ کے الفاظ میں ’اب دنیا میں‘

پرائمریٹ زندگی کے اخلاق کا ضابطہ کچھ اور ہے اور امورِ مملکت کے لئے ضابطہ کچھ اور۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنی نجی زندگی میں دیانتدار و رحمدل اور قابلِ اعتماد ہیں، ان کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ جب انہیں اپنی مملکت کے نمائندہ کی حیثیت سے دوسری مملکت کے نمائندوں سے معاہدہ کرنا ہو تو وہاں وہ سب کچھ کر گزرنا کارِ ثواب ہے جسے وہ اپنی نجی زندگی میں ہنایتِ شرمناک تصور کرتے تھے۔

(GUIDE TO THE PHILOSOPHY OF MORALS AND POLITICS, P-730)

اسی حقیقت کو اٹلی کے مدبّر (COVOUR) نے سمٹا کر ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ اگر ہم دہی کچھ اپنی ذات کے لئے کریں جو کچھ ہم نے مملکت کے لئے کیا ہے تو ہم کتنے بڑے شیاطین کہلائیں۔

(FOREIGN AFFAIRS-YEAR 1952)

ماہِ حاصلِ مبحث | جو کچھ ہم نے سابقہ صفحات میں لکھا ہے اسے مختصر الفاظ میں دہرانا چاہیں تو بات یوں سامنے آتی ہے کہ

(۱) انسانوں نے مل جُل کر رہنا ہے۔

(۲) مل جُل کر رہنے سے ان کے مفاد میں ٹکراؤ ہوتا ہے اور ٹکراؤ سے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔

(۳) اس مقصد کے لئے کہ مختلف افراد کے مفاد میں ٹکراؤ نہ ہو اور اگر ٹکراؤ ہو تو اس سے جھگڑے پیدا نہ ہوں، سیاسی

نظام کا تصور پیدا ہوا۔

(۴) انسانی فکرنے آج تک جس قدر سیاسی نظام وضع کئے ہیں ان میں کوئی بھی اس مقصد کے لئے کامیاب ثابت نہیں ہوا۔

(۵) ان نظاموں میں آخری نظام قومی جمہوریت ہے۔ لیکن یہ نظام بھی بُری طرح ناکام ثابت ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ اول تو اس سے ملک کے اندر مختلف پارٹیوں میں باہمی کشمکش رمتی ہے۔ اور دوسرے مختلف ملکوں اور قوموں میں نفرت اور رقابت کے جذبات دنیا کو جہنم بنائے رکھتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ مغربی مفکرین نے ان مشکلات کا کوئی حل بھی سوچا ہے۔ اور اگر سوچا ہے تو وہ کیا ہے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے راستے میں کیا موانع ہیں؟

مفکرین مغرب کیسا نظام چاہتے ہیں | ہم نے دیکھا یہ ہے کہ نظام جمہوریت کی بنیادی خرابی یہ ہے کہ اس میں "اقتدارِ اعلیٰ" عوام کے ہاتھ میں سمجھا جاتا ہے اور عوام کے نمائندوں

کی اکثریت کے فیصلے حرفِ آخر تصور کئے جاتے ہیں۔ اس نظریہ پر بحث کرتے ہوئے پروفیسر کوہن لکھتا ہے:-
عوام کے اقتدارِ اعلیٰ کے نظریہ کی تائید میں روایتی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ حکومت یا قوت سے قائم کی جائے گی یا باہمی رضامندی سے۔ اور چونکہ یہ غلط ہے کہ جس چیز کو قوت صحیح کہنے سے وہ صحیح ہو اس لئے یہی درست ہے کہ حکومت کو باہمی رضامندی پر مبنی ہونا چاہیے۔ لیکن یہ دلیل نہ تو منطقی طور پر صحیح ہے، نہ ہی صداقت پر مبنی۔ اگر کسی بات کو لاکھ آدمی بھی صحیح کہہ دیں تو وہ صحیح نہیں ہو سکتی..... فیصلہ وہی صحیح ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو نہ کہ وہ جسے زیادہ لوگ صحیح کہنا شروع کر دیں۔

رو سو کہتا ہے کہ منشاءِ عمومی (GENERAL WILL) ہمیشہ صحیح ہو گا ورنہ وہ منشاءِ عمومی کہلا نہیں سکے گا۔ اگر یہ بات ٹھیک ہے تو پھر اکثریت اور اقلیت کا سوال ہی باقی نہ رہا۔ جب منشاءِ عمومی اس وقت منشاءِ عمومی کہلا سکے گا جب وہ صحیح بات کہے تو (پھر یوں کیوں نہ کہا جائے کہ جو بات اخلاقی معیار کے مطابق صحیح ہے وہی صداقت ہے) (خواہ اس کی تائید میں ایک ہاتھ بھی نہ لگھے)۔ (ص ۱۷)

اخلاقی معیار | پروفیسر کوہن کا مطلب یہ ہے کہ کسی بات کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار "اخلاقی بنیادیں" ہیں، نہ کہ اکثریت کے فیصلے حقیقت یہ ہے کہ جب لاکھ نے جمہوریت کا نظریہ پیش کیا تھا تو اس کے پیش نظر بھی ایک "ابدی قانون" کا عملی لفافہ تھا جسے وہ "قانونِ فطرت" سے تعبیر کرتا تھا۔ چنانچہ اس باب میں اس نے کہا تھا کہ

کسی حکومت کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ جو کچھ جی میں آئے کرتی رہے۔ قانونِ فطرت وہ ابدی قانون ہے جو

تمام انسانوں پر یکساں طور پر منطبق ہوتا ہے۔ خواہ وہ قانون ساز ہوں یا قانون کے متبع۔

(C.F. MABBOTH THE STATE AND THE CITIZEN; P-23)

قانون فطرت

لاک کے نزدیک قانون فطرت خدا کا بنایا ہوا ہے اور انسان اس کے ماتحت اس وقت رہا کرتے تھے جب وہ تہذیب و تمدن کے نام سے نا آشنا تھے اور ”نیچر“ کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے اس وقت لوگ، عقل (REASON) سے کام لیتے تھے جذبات سے نہیں۔ لیکن بعد میں جب لوگ جذبات کے پیچھے لگ گئے تو ان کی زندگی قانون فطرت کے مطابق نہ رہی۔ اب اسی قانون کی بازیابی اور اس کی عملی تنفیذ، انسانی معاشرہ کا فریضہ ہے۔ لیکن اتنا کچھ لکھنے کے بعد لاک یہ کہتا ہے کہ یہ قانون اکثریت کی منشا سے مل سکتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ یہ اتنا بڑا مفکر، کس طرح گرداب میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح ایک ہی نقطہ کے گرد ناکام چکر کاٹ رہا ہے؟ وہ انسانی فیصلوں کی غلطیوں اور مفاد پرستوں کی چیرہ دستیوں سے گھبرا کر پکار اٹھتا ہے کہ ”کسی حکومت کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ جو کچھ جی میں آنے کرتی رہے۔ اسے فطرت کے ابدی قانون کا پابند رہنا ہوگا۔ اور جب اس سے پوچھا جاتا ہے کہ فطرت کا وہ ابدی قانون کہاں سے ملے گا تو اسے اس کے سوا کچھ اور نہیں سوچتا کہ ”یہ لاک کی غلطی“ قانون اکثریت کے فیصلوں میں ملے گا۔“ بارش سے بچنے کے لئے پر نالے کے نیچے پناہ لینا اسے ہی کہتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ ہیں بھی سچے۔

تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کہا کریں؟

بہر حال ہم کہہ رہے تھے کہ اب مغرب کے مفکرین اس حقیقت کا احساس کر رہے ہیں کہ جمہوری نظام میں اکثریت کے فیصلوں کو بہر حال دہر کی صفحہ سمجھنا غلط ہے۔ کسی فیصلے کے صحیح یا غلط ہونے کے لئے کسی خارجی معیار کی ضرورت ہے۔ لاک کے نزدیک یہ خارجی معیار ”قانون فطرت“ ہے۔ پروفیسر کوئن لے ”اخلاقی معیار“ سے تعبیر کرتا ہے۔ مشہور اطالوی مدبر، میزیری (MESSENI) نے اس باب میں کہا تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ عام راستے دہندگی کا اصول بہت اچھی چیز ہے۔ یہی وہ قانونی طریق کار ہے جس سے ایک قوم تباہی کے مسلسل خطرات سے محفوظ رہ کر اپنی حکومت آپ قائم رکھ سکتی ہے۔ لیکن ایک ایسی قوم میں جس میں وحدت عقائد نہ ہو جمہوریت اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے کہ وہ اکثریت کے مفاد کی نماندگی کرے اور اقلیت کو مغلوب رکھے۔ ہم یا تو خدا کے بندے بن سکتے ہیں یا انسان کے۔ وہ ایک انسان ہو یا زیادہ، بات ایک ہی ہے۔ اگر انسانوں کے اوپر کوئی اقتدار اعلیٰ نہ ہو تو پھر کون سی چیز ایسی رہ جاتی ہے جو ہمیں طاقتور افراد کے غلبے سے محفوظ رکھ سکے اگر

ہمارے پاس کوئی ایسا مقدس اور ناقابل تغیر قانون نہ ہو جو انسان کا وضع کردہ نہ ہو تو ہمارے پاس وہ کون سی خد کا قانون | میزان رہ جاتی ہے جس سے ہم پر کھ سکیں کہ فلاں کام یا فیصلہ عدل پر مبنی ہے یا نہیں۔ خدا کے سوا جو حکومت قائم ہو اس میں نتائج کی حقیقت ایک ہی ہوتی ہے خواہ اس کا نام یوناپارٹ رکھ لیں یا انقلاب۔ اگر خدا درمیان میں نہ رہے تو اپنے زمانہ سطوت میں ہر ایک مستبد بن جائے گا..... یاد رکھئے جب تک کوئی حکومت خدا کے قوانین کے مطابق نہیں چلتی اس کا کوئی حق مسلم نہیں۔ حکومت تو منشاءتے خداوندی کو راسخ اور نافذ کرنے کے لئے ہے۔ اگر وہ اپنے اس فریضہ کی سرانجام دہی میں قاصر ہے تو ہمارا یہ حق ہی نہیں بلکہ فریضہ ہے کہ تم ایسی حکومت کو بدل ڈالو۔

(QUOTED BY GRIFFITH IN "INTERPRETERS OF MAN" P-46)

یعنی میزبانی کے نزدیک صحیح اور غلط کا معیار قوانین خداوندی ہونے چاہئیں جن کا نافذ کرنا حکومت کا فریضہ قرار پائے۔ ظاہر ہے کہ قوانین خداوندی مذہب کے ہاں سے مل سکتے ہیں۔ لیکن یورپ میں جو مذہب (عیسائیت) رائج ہے پروفیسر جوڈ کے الفاظ میں اس کی حالت یہ ہے کہ

قوانین خداوندی عیسائیت سے نہیں مل سکتے | عیسائیت کی رُو سے زندگی کا حقیقی مسکن یہ دنیا نہیں بلکہ آنے والی دنیا ہے۔ اُخروی دنیا

خیر محض کی مظہر ہے۔ اس کے برعکس یہ دنیا شر و فساد کی دنیا ہے۔ اس دنیا کی حیات ابدی ہے۔ یہ دنیا محض عبوری حیثیت رکھتی ہے۔ انسان کے لئے یہ دنیا اگلی دنیا کے لئے تیاری کا مقام ہے۔ اس دنیا میں کوئی شے بالکل خیر اور طیب نہیں یہاں جو کچھ نظر آتا ہے اسی صورت میں اچھا ہے جبکہ وہ ان نعمتوں کے حصول کا ذریعہ بن سکے جس کا وعدہ اگلی دنیا میں کیا گیا ہے۔

(GUIDE TO THE PHILOSOPHY OF MORALS AND POLITICS: P-127)

ہسپانوی پروفیسر (DR. FALTA DE GRACIA) اس باب میں لکھتا ہے:-

عیسائیت میں عدل کا تصور بھی اسی طرح نامانوس ہے جس طرح ذہنی دیانت کا۔ یہ اس کے تصور اخلاق سے یکسر باہر کی چیز ہے..... عدل و انصاف اور حق و باطل کی طرف سے عیسائیت کی روح یکسر بے حس ہے۔

(QUOTED BY BRIEAULT IN "THE MAKING OF THE MANTHEY" P-334)

مشہور مفکر، پروفیسر و ہائٹ ہیڈ لکھتا ہے کہ

انجیل میں جس قسم کا اخلاقی ضابطہ دیا گیا ہے اسے اس موجودہ معاشرہ میں نافذ کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ فوری طور
 کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ (ADVENTURES OF IDEAS: P-18)

اپنی حقائق کے پیش نظر تہذیب کا مشہور (امریکی) مورخ (DORSEY) اپنی کتاب (CIVILISATION) میں لکھتا ہے۔
 آج لاکھوں انسانوں کے نزدیک عیسائیت شکست خوردوں کا مذہب ہے۔ وہ اس مذہب کی قبولیت سے
 اعتراف شکست کرتے ہیں۔ یہاں کوئی شے قابل اطمینان نہیں۔ اطمینان کی آرزو باطل اور باطل آرزوؤں کی
 تکمیل گناہ ہے۔ یہ انداز نگاہ صحیح اور تندرست زندگی کو ناممکن بنا دیتا ہے۔ اس سے انسانیت تباہ ہو جاتی ہے۔
 (صفحہ ۴۴۶)

ظاہر ہے کہ اس قسم کے مذہب سے کبھی وہ خدائی قوانین نہیں مل سکتے تھے جنہیں مینرینی نے صحیح اور غلط کا ناقابل تغیر معیار قرار
 دیا تھا۔ اب یورپ کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ اپنی مشکل کے حل کے لئے کسی اور دروازے پر دستک دے۔
 یہ دروازہ مجلس اقوام متحدہ U.N.O. کا تھا جس نے انسانیت کے بنیادی
منشور حقوق انسانیت کے متعلق تحقیق و تعین کے لئے کمیشن بٹھایا اور اس کمیشن کی سفارشات کے

مطابق ۱۹۴۸ء میں "منشور حقوق انسانیت" (DECLARATION OF HUMAN RIGHTS) شائع کیا۔ اس میں ان حقوق
 کی فہرست دی گئی جو اقوام متحدہ کے نزدیک ہر حکومت میں ہر فرد انسانیت کو حاصل ہونے چاہئیں۔ اقوام متحدہ کے اس کارنامے کو
 عصر حاضر کی بہت بڑی کامیابی اور کامرانی قرار دیا جاتا ہے۔ اس سے دنیا کے ستائے ہوئے انسان کی ڈھارس بندھ سکتی تھی کہ اسے کسی
 طرح کچھ حقوق کی مستقل ضمانت تو ملی۔ لیکن اس کی یہ توقع بھی غلط نکلی۔ ابھی مذکورہ صدر منشور زیر ترتیب ہی تھا کہ (UNESCO)
 (یعنی انجمن اقوام متحدہ ہی کے ایک ادارہ) نے دنیا کے مشہور ارباب فکر و نظر کے پاس ایک سوالنامہ بھیجا کہ وہ ان حقوق کے متعلق
 اپنی آرا سے مطلع کریں۔ ان کے جوابات مسٹر (JACQUES MARITAIN) کے تعارف کے ساتھ ایک مجموعہ کی شکل میں شائع
 کئے گئے تھے۔ ان حقوق کی حیثیت کے متعلق سب سے پہلے خود مسٹر میری ٹین لکھتے ہیں:-

یہ حقوق بھی غیر تبدیل نہیں یہ حقیقت بدیہی ہے کہ تمام حقوق انسانی حقوق ہیں۔ اور دیگر
 تمام انسانی حقوق کی طرح ایسے کہ ان پر حدود و قیود عائد کی جائیں

اور انہیں قابل ترسیم و تبدیل قرار دیا جائے۔ (صفحہ ۱۵)

اس کے بعد ماڈرن کوارٹری، لندن کا ایڈیٹر (JOHN LEWIS) اپنے مقالہ کی ابتداء ان الفاظ سے کرتا ہے:-
 اس حقیقت کو اب ہر جگہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ حقوق انسانی کے متعلق یہ تصور کہ یہ حقوق مطلق ہیں اور فطرت انسانی

کے اندر مضمر ہوتے ہیں اور ان کی ابتداء اس زمانے سے ہوتی ہے جب انسان نے ہنوز معاشرہ کی طرح بھی نہیں ڈالی تھی، ایک افسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ (صفحہ ۵۱)

شکاگو یونیورسٹی کا پروفیسر (GERARD) لکھتا ہے:-

انسانی حقوق صرف اس کوشش کا نام ہیں کہ انسان اور اس کے معاشرہ کے باہمی تعلقات کو متعین کر دیا جائے۔ یہ حقوق نہ تو مطلق ہوتے ہیں نہ ایسے کہ انہیں ہمیشہ ناقابل تغیر و تبدیل قرار دیا جائے۔ (صفحہ ۲۰)

یعنی جو کچھ اتنی کاوشوں اور کوششوں کے بعد انسان کو ملا، اس کے متعلق بھی اسے اطمینان نہیں کہ وہ اسے مستقل طور پر ملتا ہے گا۔ اور اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوگا۔ حقوق کے تحفظ کے متعلق مسٹر (MARITAIN) نے لکھا ہے:-

انسانیت کے حقوق کی تعریف نہیں بلکہ روزمرہ کی زندگی میں ان کے استعمال کے مسئلہ پر متفق ہونے کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ اقدار کے پیمانوں پر متفق ہو جائے۔ حقوق انسانیت کے احترام کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کے نزدیک انسانی زندگی کا عملی تصور مشترک ہو۔ اسی کو "فلسفہ زندگی" کہتے ہیں۔ (صفحہ ۱۷)

اسی حقیقت کو پروفیسر جوڈ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ

مستقل اقدار کی تلاش | اچھی زندگی سے مفہوم یہ ہے کہ انسان مستقل اقدار کو حاصل کر سکے، جہاں

میں کہہ سکتا ہوں کہ مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے جن میں ایک انسان کے لئے مستقل اقدار کا حصول ممکن ہو جائے۔ سوسائٹی کی ترقی کا یہی ایک پیمانہ ہے۔

(GUIDE TO THE PHILOSOPHY OF MORALS AND POLITICS, P-806)

یعنی بات سمٹ سنا کر یہاں پہنچی کہ انسانی معاشرہ کی اس مشکل کا حل اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسانوں کے باہمی معاملات مستقل اقدار کے مطابق طے ہوں اور یہی اقدار غلط اور صحیح کا معیار قرار پائیں۔ یہ ہے وہ آخری منزل جس تک انسان اپنے ہزاروں سال کے ناکام تجارب کے بعد پہنچا ہے۔ لیکن اس منزل میں پہنچ کر بھی انسان مشدد و جیران کھڑا ہے کیونکہ اسے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ مستقل اقدار ملیں گی کہاں سے؟ وہ اپنے ذہن سے کچھ اقدار متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ایک کی تردید دوسرا کر دیتا ہے۔ آئیے اب دیکھیں کہ اسلام، انسان کے اس سب سے اہم اور مشکل مسئلہ کا حل کیا دیتا ہے۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اسلامی نظام کی ساری عمارت اس بنیاد پر استوار ہوتی ہے کہ انسان صرف اس کے جسم سے ہی عبارت نہیں، بلکہ جسم کے علاوہ اسے ذات بھی عطا ہوتی ہے۔ یہ انسانی ذات، ہر انسانی بچہ کو پیدائش کے ساتھ یکساں طور پر ملتی ہے۔ یہی شے انسان کے لئے وجہ تکریم اور باعث تعظیم ہے۔ اسی جہت سے ہر انسانی بچہ محض انسان ہونے کے لحاظ سے یکساں عزت

کا مستحق ہے۔ اس میں حسب نسب یا باپ اور خاندان ن پوزیشن کا کوئی سوال نہیں۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (۱۷/۷۰) قرآن کا انقلابی اعلان ہے۔ یعنی ”ہم نے تمام فرزندان آدم (انسان) کو یکساں طور پر واجب التکریم بنایا ہے۔ اس اعتبار سے نہ کسی انسان کو انسان ہونے کے لحاظ سے کسی دوسرے انسان پر کوئی فوقیت حاصل ہے اور نہ ہی کوئی انسان کسی دوسرے انسان کے مقابلہ میں ذلیل ہے۔ یہ اسلامی نظام کا پہلا اور بنیادی اصول ہے۔

ذات کی ایک بنیادی خصوصیت یہ بھی ہے کہ کوئی ذات کسی دوسری ذات کے مقاصد کے برائے کار لانے کا ذریعہ یا آلہ کار نہیں بن سکتی۔ اس سے ظاہر ہے کہ

(۱) جب ذات ہر انسان کو یکساں طور پر عطا ہوئی ہے، اور

(۲) کوئی ذات کسی دوسری ذات کا آلہ کار نہیں بن سکتی،

تو کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم و محتاج بھی نہیں ہو سکتا۔ اسلامی نظام کا دوسرا بنیادی تصور یہ ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے۔

مَا كَانَ لِبَشَرَ أَنْ يُوْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنَّبُوءَةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا

عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ (۳/۷۹)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا سے ضابطہ قوانین اور فیصلہ کرنے کی قوت اور نبوت (تک) بھی عطا کرے اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے محکوم اور فرماں پذیر بن جاؤ۔

سوال یہ ہے کہ جب قرآن کی رو سے کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے تو پھر کیا اس کا منشاء یہ ہے کہ دنیا میں کوئی نظام حکومت قائم نہ ہو؟ انسان فوضویت (انارکی) کی حالت میں زندگی بسر کرے؟ قطعاً نہیں۔ وہ انسانی معاشرہ کو آئین و ضوابط کے مطابق متشکل کرتا ہے اور انہیں قوانین و دستاویز کے ماتحت زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے۔ وہ کہتا ہے

یہ ارسطو نے غلامی کے جواز میں یہی دلیل پیش کی تھی کہ بعض لوگ پیدائش کے لحاظ سے محض آلات (TOOLS) ہوتے ہیں اور دوسرے

لوگ ان آلات کو استعمال کرنے والے کارگر۔ آلات کا فطری مقام یہی ہے کہ وہ کاریگروں کے مقاصد کو برائے کار لائیں۔

قرآن نے تمام انسانوں کو یکساں طور پر واجب التکریم قرار دے کر ان باطل تصورات کا خاتمہ کر دیا اور غلامی جیسی لعنت کو ہمیشہ کے لئے مٹا دیا۔ تفصیل اس اجمال کی ”عورت“ سے متعلق باب میں ملے گی جہاں یہ بتایا جائے گا کہ غلام اور لونڈیوں کا تصور کس قدر

خلاف اسلام ہے۔

ہے کہ حکومت کا حق کسی انسان کو نہیں، بلکہ خدا کو ہے۔ اِنَّ الْحُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰) ”حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ لایشرک فی حکمہ احداً (۱۸/۲۶) ”وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں۔“

لیکن خدا تو ایک حقیقت مجرہ ہے۔ اسے نہ ہم دیکھ سکتے ہیں، نہ اس کی آواز سن سکتے ہیں۔ اس لئے ہم اپنے معاملات کے فیصلے اس سے کس طرح کرا سکتے ہیں۔ ہم اس کی محکومیت کس طرح اختیار کر سکتے ہیں؟ اس کے لئے اس نے بتایا کہ محکومیت ان قوانین کی اطاعت سے اختیار کی جائے گی جنہیں اس نے بذریعہ وحی قرآن کے اندر محفوظ کر دیا ہے۔

اَفَغَيَّرَ اللّٰهُ اِبْتِغَاءَ حُكْمًا وَّ هُوَ الَّذِيۥ اَنْزَلَ اِلَيْكُمْ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا (۲/۱۱۵)

(اے رسول ان سے کہہ دے کہ) کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا حاکم چاہوں، حالانکہ اس نے ایسی کتاب نازل کر دی ہے جو ہر بات کو نکھار کر بیان کرتی ہے۔

چونکہ یہ قوانین کسی انسان یا انسانوں کی کسی جماعت کے وضع کردہ نہیں، اس لئے ان کی اطاعت کسی انسان کی اطاعت نہیں، نیز چونکہ یہ قوانین تمام انسانوں پر یکساں طور پر نافذ ہوتے ہیں۔ کوئی انسان خواہ اس کی پوزیشن کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، ان کے دائرہ اطلاق سے باہر نہیں رہ سکتا۔ اس لئے اسلامی نظام میں حاکم اور محکوم کا امتیاز ہی نہیں ہوتا۔ جسے عرب عام میں ”حکومت“ یا ”مملکت“ کہا جاتا ہے، وہ اسلامی نظام میں قوانین خداوندی کو نافذ کرنے کی مشینری سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔

اب آگے بڑھئے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ

(۱) انسان عبارت ہے اس کے جسم اور اس کی ذات سے۔

(۲) انسانی جسم میں ہر آن تغیرات واقع ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے اس کے تقاضے بھی بدلتے رہتے ہیں لیکن انسانی ذات تغیرات سے نا آشنا ہے۔ اس پر خارجی تبدیلیوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ غیر متبدل رہتی ہے۔

چونکہ اسلامی نظام پورے کے پورے انسان (MAN AS A WHOLE) کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے، اس

لئے یہ ثبات و تغیر یعنی غیر متبدل اور قابل تغیر و تبدل عناصر کا آمیزہ ہوتا ہے۔ اقبال کے الفاظ میں :-

اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیات کلی کی روحانی اساس ازلی وابدی ہے۔ لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے

پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقت مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر مشتمل ہو اس کے لئے ضروری ہوگا

کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر عناصر میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے

پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں..... لیکن اگر ان ابدی اصولوں کے

متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے کے اندر تغیر کا امکان ہی نہیں..... تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد و متعصب بن کر رہ جائے گی۔

اس مقصد کے لئے قرآن کریم نے وہ اصول دیئے ہیں جو انسانی ذات کے غیر متبادل تقاضوں کی تسکین کرتے ہیں۔ یہ اصول ہمیشہ کے لئے غیر متبادل ہوتے ہیں۔ انہی کو مستقل اقدار کہتے ہیں۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُكَ حَقًّا قَدْ عَدَلْنَا لَكَ مُبَدَّلًا بِكَلِمَتِكَ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (۶/۱۱۶)

تیرے رب کی بات عدل اور سچائی کے ساتھ مکمل ہو گئی۔ اس کی باتوں (مستقل اقدار و اصول) کو کوئی بدلنے والا نہیں (اس لئے کہ یہ اصول کسی اندھی فطرت کے وضع کردہ نہیں بلکہ اس خدا کے متعین فرمودہ ہیں جو سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔

یہ غیر متبادل اصول (یا مستقل اقدار) وہ چار دیواری (BOUDARY LINES) ہے جس سے تجاوز کرنے کا کسی کو اختیار نہیں۔ ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے وہ ہر زمانے کے انسان کو آزادی دیتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق اپنے لئے جرنی قوانین خود مرتب کرے۔ یہ جرنی قوانین 'تبدیلی حالات کے ساتھ بدلتے رہیں گے' اور وہ اصول جن کے اندر رہتے ہوئے یہ قوانین مرتب کئے جائیں گے، ہمیشہ غیر متبادل رہیں گے۔ یہ جرنی قوانین نمائندگان امت کے باہمی مشورہ سے طے پائیں گے (۳۲/۳۸)۔ اس حد تک اسلامی نظام جمہوریت کا آئینہ دار ہوگا۔ قرآن مشاورت کی مشینری سے کوئی بحث نہیں کرتا۔ وہ صرف اس اصول کو دیتا ہے۔ اس کے مطابق اپنے اپنے حالات کے مطابق جو مشینری بھی وضع یا اختیار کر لی جائے وہ ٹھیک ہوگی۔

یہ غیر متبادل اصول (یا مستقل اقدار) کس قسم کی ہیں، اس کے متعلق ہم آئندہ کسی باب میں تفصیلی گفتگو کریں گے۔ اس مقام پر اتنا بیان کر دینا ضروری ہے کہ جب کوئی شخص اس نظام کے تابع زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کرے گا، تو اسے حتمی اور یقینی طور پر معلوم ہوگا کہ افراد آئیں اور افراد جائیں، حکومت بنے اور حکومت بگڑے۔ ان اصولوں میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کر سکے گا۔ اسی طرح دیگر اقوام عالم کو بھی اس کا یقین اور اطمینان ہوگا کہ یہ قوم ان اصولوں سے کبھی انحراف نہیں کر سکتی۔ آج دنیا کی حالت یہ ہے کہ امریکہ میں صدر کا انتخاب ہو یا روس میں سربراہ کی موت، ساری دنیا کا دل دھڑکنے لگ جاتا ہے کہ معلوم نہی برسر اقتدار پارٹی کی پالیسی کیا ہوگی۔ اس لئے کہ ان کے ہاں کوئی اصول ایسے نہیں جو غیر متبادل ہوں۔ ان کا آئین

لے قرآن نے اصولوں کے علاوہ، بعض قوانین بھی دیئے ہیں جو اصولوں کی طرح غیر متبادل ہیں۔ یہ قوانین بیشتر انسان کی حالی زندگی سے متعلق ہیں جسے قرآن بڑی اہمیت دیتا ہے۔

تک بھی بدلا جاسکتا ہے۔ لیکن اسلامی نظام میں حکومت کی تبدیلی یا کسی بڑے سے بڑے ذمہ دار فرد کی موت، مملکت کی پالیسی پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتی۔ یہ پالیسی ان مستقل اقدار کے تابع رہتی ہے جو انسانوں کی نہیں بلکہ خدا کی متعین کردہ ہیں اور جنہیں بدلنے کا کسی کو اختیار نہیں۔ ان کے ہاں آئین و قانون سازی کا اختیار غیر محدود نہیں۔ وہ ہمیشہ ان اصولوں کے تابع رہتا ہے۔ اسی لئے اس نظام میں 'اقتدارِ اعلیٰ' صرف خدا کی کتاب کو حاصل ہوتا ہے، جو تمام نوع انسان کے لئے آخری، مکمل اور غیر متبدل ضابطہ حیات ہے۔

اب سیاسی نظام کے دوسرے ستون کی طرف آئیے۔ یعنی نیشنلزم، جس نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے۔ قرآن کریم کا پیش کردہ

بنیادی تصور یہ ہے کہ انسانیت ایک غیر منقسم وحدت ہے، اور اسے مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کر دینا سب سے بڑا جرم۔ وحدتِ خالق کا تصور قرآنی تعلیم اور نظام کا

عالمگیر انسانیت کا تصور

سنگ بنیاد ہے۔ اس نے ساری دنیا کو پکار کر کہا کہ **كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً** (۲/۲۱۳) "یاد رکھو! پوری نوعِ انسانی ایک امت، ایک قوم، ایک عالمگیر برادری ہے۔ اس کی تخلیق اور اس میں زندگی کی نمود اور اٹھان کی مثال ایک فرد کی سی ہے۔ **مَا خَلَقَكُمْ وَلَا نَعْتَكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ** (۳۱/۲۸) "تمہاری تخلیق اور بعثت بس ایک فرد کی تخلیق و بعثت کی مانند ہے۔ جو تعلیم خدا کی طرف سے آتی رہی اس کا مقصد عظیم نوعِ انسانی کی وحدت کو برقرار رکھنا تھا۔ وہ اس تعلیم کی مخالفت کرنے والوں کے خلاف سب سے بڑا جرم ہی عائد کرتا ہے کہ **يَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُؤْتَلَ** (۲/۲۷۱) "جسے خدا نے ملانے رکھنے کا حکم دیا تھا یہ اُسے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں۔"

قرآنی تعلیم کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ صرف نظریات و تصورات ہی پیش نہیں کرتا۔ وہ ان تصورات کو عملاً متشکل کرنے کے

لئے پروگرام بھی تجویز کرتا ہے۔ اس نے وحدتِ انسانیت کے لئے جو عملی پروگرام دیا اس کی ابتداء حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ سے کی

گئی۔ قرآن میں بتاتا ہے کہ دنیا کی مختلف قوموں نے اپنے اپنے "قومی گھر" بنا رکھے تھے۔ اسی طرح مختلف مذاہب نے اپنے اپنے جدا جدا مرکز قائم کر رکھے تھے۔ ساری دنیا میں ایسا "گھر" کوئی

اس کا عملی پروگرام

نہیں تھا جسے نوعِ انسانی کا عالمگیر مرکز کہا جاسکے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے حضرت ابراہیمؑ سے کہا گیا کہ وہ ایک ایسے مرکز کی

بنیاد رکھیں جو "عالمگیر انسانیت کا گھر" قرار پاسکے۔ سورۃ آل عمران میں ہے: **إِنَّا أَوَّلَ بَنِي دَاوُدَ وَضَعْنَا لِنَّاسٍ لِلذِّكْرِ بَلَدًا**

مُبَارَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ (۳/۹۶) "یہ حقیقت ہے کہ وہ پہلا گھر جو تمام انسانیت کے مفاد کے لئے بنایا گیا تھا

(یہی کعبہ تھا جو) مکہ کی بابرکت زمین میں تعمیر ہوا تھا اور جسے تمام اقوامِ عالم کی راہ نمائی کے لئے روشنی کے مینار کا کام دینا تھا۔

اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ **مَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا** (۳/۹۶) "جو اس کی پناہ میں آجائے ساری دنیا کے خطرات سے

محفوظ ہو جائے۔“

ظاہر ہے کہ ”گھر“ سے مراد مٹی اور پتھر کا مکان نہیں۔ اس سے مراد ایک ایسا عالمگیر نظام ہے جو نوع انسانی کی فلاح بہبود کے لئے متشکل کیا جائے۔ اس نظام کا مرکز محسوس کعبہ ہے جس طرح (مثلاً) جھنڈا، تخت، دار الخلافہ وغیرہ ایک سلطنت کے شعار (SYMBOLS) ہوتے ہیں۔ اسی طرح کعبہ بھی نظام خداوندی کی مرکزی حیثیت کی علامت (SYMBOL) ہے۔ ان چیزوں کو قرآن نے کہا ہی ”شعائر اللہ“ ہے۔ لہذا جب یہ کہا کہ کعبہ کو تمام نوع انسانی کا ”گھر“ قرار دیا گیا تو اس سے مفہوم یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے نظام کا تصور دیا جو عالمگیر انسانیت کو محیط ہو۔ دوسری جگہ ہے: **وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ** (۲/۱۲۵) ”جب ہم نے اس گھر کو نوع انسان کے لئے مرجع اور امن کی جگہ بنایا۔ اس سے بھی واضح ہے کہ کعبہ سے مراد اس نظام کا مرکز ہے جو وحدتِ انسانہ کے بنیادی تصور پر متشکل ہے۔ ان مقامات میں قرآن نے کہا ہے کہ جو انسان اس نظام کی پناہ میں آجائے گا وہ ہر قسم کے خطرات سے مامون ہو جائے گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ خطرات سے محفوظ ہو جانا بھی کم نعمت نہیں۔ لیکن یہ بہر حال ایک سلبي پہلو (NEGATIVE ASPECT) ہے۔ قرآن اس سے آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ **جَعَلَ اللَّهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِّلنَّاسِ** (۵/۹۷) ”اللہ نے کعبہ کو واجب الاحترام گھر بنایا تاکہ وہ انسانیت کے قیام کا مرکز بن سکے“ یعنی اس نظام کی اگلی خصوصیت یہ ہوگی کہ اس کی رو سے پوری کی پوری انسانیت اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جائے گی۔ دنیا میں کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محتاج نہیں ہوگا۔

کس نہ باشد در جہاں محتاج کس

نکتہ شرع میں این است و بس

سورہ الحج میں اس کی مزید تصریح کر دی کہ اس نظام کا مرکز ایک کھلے شہر (OPEN CITY) کی حیثیت رکھے گا اور دنیا کا ہر باشندہ اس کا شہری (CITIZEN) ہو سکے گا۔ **جَعَلْنَاهُ لِّلنَّاسِ سَوَاءً ۚ يٰۤاَعْلَٰفُ فِيْهِ دَٰرُ الْبَآئِ** (۲۲/۲۵) ”ہم نے اسے تمام نوع انسانی کے لئے یکساں قرار دیا ہے، خواہ وہ وہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر کے“

اس مرکز کی تعمیر کے بعد حضرت ابراہیم سے کہا گیا کہ **وَ اٰذِنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ** (۲۲/۲۷) تم تمام عالم انسانیت میں اعلان کر دو کہ لوگ اس مقام پر جمع ہوں تاکہ ان کے اُبھھے ہوئے معاملات دلیل و حجت سے طے پا جائیں (حج کے ہی معنی ہیں) اور **يَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ** (۲۲/۲۸) ”اور وہ اپنے مفاد کو اپنے سامنے مشہود شکل میں دیکھ لیں“ اقوام عالم اپنے اپنے مراکز، اپنے اپنے قومی مفاد کے تحفظ کے لئے بناتی ہیں۔ لیکن نظام خداوندی کا مرکز، تمام عالم انسانی کے مفاد کی خاطر بنایا گیا ہے۔

اس مرکز میں جمع ہونے کی دعوت عام ہے: **وَاللّٰهُ عَلَى النَّاسِ حَجُّ الْبَيْتِ مِمَّنْ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا وَّمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ** (۳/۹۷) "تمام نوع انسانی پر واجب ہے کہ ان میں سے جو یہاں تک پہنچنے کی راہ پائیں، اللہ کے لئے اس گھر کا حج کریں۔ یہ دعوت عام ہے۔ لیکن جو اس دعوت کو قبول نہ کرے تو اس سے اس کا اپنا ہی نقصان ہوگا۔ اللہ کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اللہ تمام اقوام عالم سے بے نیاز ہے۔" اس سے بھی ظاہر ہے کہ نوع انسانی کو دعوت دینے میں اس نظام کا کوئی اپنا مفاد مضمّن نہیں۔ یہ دعوت عالمگیر انسانیت کے مفادِ کلی کے تحفظ و بقا کے لئے تدابیر سوچنے اور پروگرام متعین کرنے کے لئے ہے۔ لیکن اس میں ایک شرط ہے اور وہ شرط بنیادی ہے یعنی یہ کہ اس میں شریک ہونے والے

ابھی کسی ذاتی منفعت کا خیال دل میں لے کر نہ آئیں۔ وہ عالمگیر انسانیت کے مفادِ کلی کے جذبے سے آئیں۔ اس حقیقت کبریٰ کو قرآن نے "لِلّٰهِ" سے تعبیر کیا ہے۔ دوسری جگہ ہے

انسانیت کی خاطر

وَآتَمُوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ (۲/۱۹۶) ان اجتماعات کو "اللہ کے لئے" پورا کرو۔ "اللہ کے لئے" سے مراد ہے اس پروگرام کی تکمیل کے لئے جسے اللہ نے نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے قرآن کریم میں متعین کیا ہے۔ اگر اس اجتماع میں شریک ہونے والوں کے دل میں قومی، گروہی، وطنی مفاد یا کسی غیر خدائی پروگرام کی تکمیل کا جذبہ ہو تو یہ شرکت "للّٰہ" نہیں ہے گی۔ یہ توحید نہیں شرک ہو جائے گا۔ اس لئے دوسرے مقام پر اس کی وضاحت کر دی گئی کہ اس مرکز میں جمع ہونا ہے تو حنفاءَ لِلّٰہِ..... **غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ** (۲۲/۳۱) کے انداز سے جمع ہو۔ یعنی خود غرضی کے ہر جذبہ کو دل سے نکال دو۔ ہر سمت سے کٹ کر سیدھا رُخ اللہ کی طرف کر کے، یہاں جمع ہو۔ اس میں کسی اور جذبہ کو شریک نہ ہونے دو۔ اسی بنا پر سورہ توبہ میں کہا گیا ہے کہ مشرکین "کعبہ کے قریب نہیں آسکتے" (۹/۲۸) اور اس کا (سب سے پہلی بار) اعلان بھی خود حج کی تقریب پر کیا گیا تاکہ نوع انسانی اس فیصلے سے مطلع ہو جائے۔ **وَ اٰذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَاَسْئُوْلُهُ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ اَلَا لِبِئْسَ اِنَّ اللّٰهَ بَرِيْءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَاَسْئُوْلُهُ.....** (۹/۳) اس اعلان کے بعد اگر کسی قوم کا ناماندہ دوسروں پر ظلم و زیادتی کے ارادے سے اس اجتماع میں شرکت کرے تو نہ صرف یہ کہ اسے باہر نکال دیا جائے گا بلکہ اسے اس کی سخت سزا بھی دی جائے گی۔ **وَمَنْ يُشْرِكْ فَاِنَّهٗ بِالْحَاۡدِ اِثْمٍ عَظِيْمٍ لِّبِئْسَ اٰلِيْمٍ** (۲۲/۲۵)

آپ نے غور فرمایا کہ قرآنی نظام کی اولین خصوصیت کیلئے؟ یہ نظام قومی، وطنی، نسلی، لسانی، مذہبی وغیرہ گروہ بندیوں کے تصور سے بلند ہو کر عالمگیر انسانیت کے مفادِ کلی کی خاطر قائم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ جس جماعت مومنین کے ہاتھوں اس کا قیام عمل میں آتا ہے اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ **كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ** (۳/۱۱۰)..... "تم ایک بہترین امت ہو جسے نوع انسان کے فائدے کے لئے پیدا کیا گیا

بین الاقوامی ملت

ہے۔ سورہ بقرہ میں پہلے یہ کہا گیا ہے کہ کعبہ کو تمہارے نظام کا مرکز تجویز کیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد ہے کہ وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ
 أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (۲۸۳۳) اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی امت بنا لیا ہے
 — یعنی ایسی امت جو افرادِ انسانیہ کے لئے یکساں فاصلے پر ہو۔ تاکہ تم تمام انسانوں (کے اعمال) کی نگرانی کر سکو اور تم پر
 تمہارا رسول (مرکزیت) نگران ہو۔ اس سے اس امت کے حصہ میں (حضرت ابراہیمؑ کی طرح) نوعِ انسانی کی امامت
 آجائے گی۔ (اِنْفِجَا عِلْفِ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۲۸۳۴)۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ امتِ مسلمہ کا فریضہ یہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ ایسا نظام متشکل کریں جس میں خدا کی طرف
 سے متعین کردہ مستقل اقدارِ انسانی معاشرہ میں عملاً نافذ ہو سکیں۔ اور اس طرح کاروانِ انسانیت اپنی منزل مقصود کی طرف شاداں و
 فرحال کا مزین ہو جائے۔ حج اس نظام کے عملی پروگرام کی ایک کڑی ہے جس میں امتِ مسلمہ تمام ایسی اقوام کو جو اس مقصد میں
 ان سے تعاون کی خواہاں ہوں، دعوت دیتی ہے کہ وہ اس نظام کے مرکز میں جمع ہو کر فلاح و بہبودِ انسانیت کے کاموں میں
 عملی تائید کا ثبوت دیں۔ اس طرح قرآن اپنے نظام کو عالمگیر بنانے کی راہیں کشادہ کرنا چلا جاتا ہے تاکہ ساری زمین اپنے
 نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔ (۳۹/۶۹)

آپ نے غور کیا کہ اس نظام میں قرآن کس طرح شروع سے اخیر تک "الناس" کا ذکر کرنا چلا جاتا ہے۔ یہ دنیا میں
 پہلا نظام ہے جو نوعِ انسان کے عالمگیر مفاد کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ اس نظام کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ وَتَوَلَّوْا
 دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ (۲۲/۴۰) "اگر اللہ ایسا انتظام نہ کرے کہ
 مذہبی آزادی | بعض لوگوں کے ذریعے دوسرے لوگوں کو ظلم و تعدی سے باز رکھے تو یقیناً راہبوں کی خانقاہیں
 عیسائیوں کے گرجے، یہودیوں کی عبادت گاہیں اور (مسلمانوں کی) مساجد جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے منہدم
 کر دی جائیں۔ اس مقصد کے لئے اللہ ایسی جماعتوں کو تیار کرتا ہے جو سینہ سپر ہو کر تمام اہل مذاہب کی پرستش گاہوں
 کی حفاظت کریں۔ جو جماعت اس طرح "اللہ کی مدد" کرتی ہے۔ اللہ (کا قانون) اس کی ضرورت درمدا کرتا ہے۔ اللہ (کا قانون)
 بڑی قوتوں اور غلبہ کا مالک ہے۔"

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ قرآنی نظام عالمگیر انسانیت کا نظام ہے جو قومیت، وطنیت
 اور مذہبیت کے تنگ دائروں سے نکال کر "عالمینیت" کی حدود فراموش فضاؤں میں لے جاتا ہے۔ اسی لئے اس
 نظام کا دینے والا خدایتِ العالمین (۱/۱)۔ جس رسول کی وساطت سے یہ نظام ملا وہ رحمۃ للعالمین (۲۱/۱۰۷) اور اس
 نظام کا ضابطہ ذکر ہی للعالمین (۶/۹۱) ہے۔

عدل کے راستے میں حاصل ہو جائیں یا تم گول مول سی (دورِ مخی) بات کر جاؤ۔ یا پہلو تہی کر کے اپنا دامن بچانے کی کوشش کرو۔ یاد رکھو! جو کچھ تم کرتے ہو وہ اللہ کی نگاہ میں ہے۔

اس نظام پر قیامِ عدل کا فریضہ عالمگیر حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی یہی نہیں کہ یہ نظام اپنے دائرہ عمل و نفوذ میں ہی عدل کا ذمہ دار ہے۔ اس کا فریضہ یہ بھی ہے کہ دنیا میں کہیں بھی ظلم اور نا انصافی ہو اسے روکنے کے لئے سینہ سپر ہو جائے۔ اس کے لئے اگر اسے تلوار بھی اٹھانی پڑے تو اٹھائے۔ قرآن کہتا ہے کہ تلوار بنائی ہی اس مقصد کے لئے گئی ہے یعنی حق اور عدل کی حفاظت کے لئے۔ سورہ حدید میں ہے:-

لَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ بِالْبَيِّنَاتِ وَآتَيْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۗ وَآتَيْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (۵۷/۲۵)

ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل سے کر بھیجا اور ان کے ساتھ ضابطہ قوانین اور میزانِ عدل بھی نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔ ان سب کے ساتھ ہم نے فولادی شمشیر بھی نازل کی جس میں شدت کی سختی ہوتی ہے۔ اور نوعِ انسان کے لئے نفع بخشی کا سامان۔

جنگ کی اجازت | جنگ کے سلسلے میں دوسرے مقام پر ہے کہ جنگ اس وقت تک ناگزیر ہوگی جب تک جنگ کا خاتمہ نہ ہو جائے۔ حَتَّى تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا (۲۴/۴) تاکہ خود جنگ اپنے

ہمتیاری رکھ دے۔

جنگ کے سلسلے میں جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے، اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اسلامی نظام میں جنگ کی اجازت حسب ذیل مقاصد کے لئے دی جاسکتی ہے۔

(i) ہر مذہب کی عبادت گاہوں کی حفاظت کے لئے۔

(ii) نظامِ عدل کے قیام اور حفاظت کے لئے۔ یعنی دنیا سے ظلم اور نا انصافی مٹانے کے لئے۔

(iii) دنیا سے خود جنگ کا خاتمہ کرنے کے لئے۔

مذہبی آزادی کے سلسلے میں اتنی مزید وضاحت کی ضرورت ہے کہ قرآن کی رو سے دین کے معاملے میں کسی قسم کی زبردستی نہیں کی جاسکتی۔ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ (۲/۲۵۶) "دین میں کسی قسم کی زبردستی نہیں"۔ اس کا واضح اعلان ہے۔ ایمان دراصل کسی دعوے کو دل کی رضا مندی سے تسلیم کر لینے کا نام ہے۔ اس لئے زبردستی اور ایمان دو متضاد چیزیں ہیں جو ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ نہ کسی کو دین کے اندر جبراً داخل کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی کسی کو جبراً اس کے اندر رکھا جاسکتا ہے جس

کا جی چاہے دین اختیار کرے اور جب جی چاہے اسے چھوڑ کر الگ ہو جائے۔ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ (۱۸/۲۹) ”جس کا جی چاہے اسے مانے، جس کا جی چاہے اس سے انکار کرے۔“ دین میں زبردستی سے ہی مراد نہیں کہ کسی کو بزورِ شمشیر مسلمان کیا جائے۔ قرآن اسے بھی زبردستی قرار دیتا ہے کہ کسی کی عقل و فکر کو معطل کر کے کوئی بات منوائی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بار بار اس کی وضاحت کرتا ہے کہ ہم نے نبی اکرمؐ کو قرآن کے سوا اور کوئی معجزہ نہیں دیا۔ خدا رسولؐ سے کہتا ہے: اَقَانَتْ تَلْكِرُهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (۱۷/۹۹) ”کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا تا آنکہ وہ ایمان لے آئیں؟“

جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے قرآن کے نظامِ حکومت کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تمام نوعِ انسان کو ایک قوم (عالمگیر برادری) قرار دیتا ہے۔ كَانِ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً (۲/۲۱۳) اس لئے وہ رنگ، نسل، زبان اور وطنیت کی بنا پر انسانوں کو مختلف گروہوں (قوموں) میں تقسیم کرنے کے خلاف ہے۔ وہ ساری دنیا کو ایک ملک اور تمام انسانوں کو ایک وحدت بتاتا ہے اور ان میں تفریق کا صرف ایک معیار قرار دیتا ہے۔ یعنی آئیڈیالوجی کا فرق۔ بالفاظِ دیگر دنیا کے تمام وہ انسان جو وحی کی رو سے متعین کردہ مستقل اقدار کو زندگی کا نصب العین قرار دیں، اس کے نزدیک ایک قوم کے افراد ہیں (خواہ وہ دنیا کے کسی حصے کے رہنے والے اور کسی نسل سے متعلق ہوں)۔ اور وہ لوگ جو اس نصب العین کے خلاف کوئی اور نصب العین اختیار کریں وہ دوسری قوم کے افراد۔ اس کو قرآن کی اصطلاح میں کفر اور ایمان کی تقسیم کہا جاتا ہے۔ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُؤْمِنٌ (۲۴/۲۱) اس کے علاوہ اور کوئی معیارِ قومیت قرآن کی رو سے قابلِ قبول نہیں۔

لیکن اس تقسیم کے معنی یہ نہیں کہ جو لوگ اس کے نصب العین کو اختیار نہیں کرتے (یعنی جو مومن نہیں) وہ انہیں ”اچھو“ سمجھتا ہے۔ بالکل نہیں۔ وہ انہیں جملہ حقوقِ انسانیت کا حامل قرار دیتا ہے۔ اور ان کے ان حقوق کی حفاظت کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیتا ہے۔ خواہ وہ (غیر مسلم) اس کی حدودِ مملکت کے اندر ہوں یا اس سے باہر۔ جیسا کہ نظامِ ربوبیت سے متعلق عنوان میں بتایا جا چکا ہے، وہ غیر مسلموں کی پرورش اور نشوونما کو مملکت کا بنیادی فریضہ قرار دیتا ہے اس کے معاوضے میں ان سے کچھ نہیں مانگتا۔ وہ ان سے کہتا ہے کہ اِنَّمَا نَطْعُكُمْ لِيُوجِبَ اللَّهُ لَكُمْ جَزَاءً وَلَا تَشْكُرُوا (۷۱/۹) ”ہم تمہارے لئے سامانِ رزق فراہم کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ ہم پر فریضہِ خداوندی ہے۔ ہم اس کے لئے تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتے۔ حتیٰ کہ اتنا بھی نہیں کہ تم ہمارے شوگر گزار ہو“ جسے ”جزیہ“ کہا جاتا ہے اس کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ جو

غیر مسلم اہل کتاب نبی اکرمؐ کے زمانے میں رعایا بن کر رہنا چاہتے تھے وہ ان کی اطاعت شعاری کا نشان تھا (۹/۲۹)۔ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ قرآن کریم کا منتہی یہ ہے کہ ساری دنیا میں ایک ہی نظام قائم ہو اور اس کا مقصد ان مستقل اقدار کا نفاذ اور تحفظ ہو جو نوع انسان کی خوشحالی اور ترقی کے لئے وحی کی رو سے ملی ہیں۔

جب تک ساری دنیا میں ایسا نظام قائم نہ ہو جائے اور دنیا اقوام کے دائروں میں بٹی رہے۔ اسلامی نظام تمام معاملات میں جو نوع انسانی کی کھلانی کے لئے ہوں، دیگر اقوام سے تعاون کرے گا۔

تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (۵/۲)

نوع انسانی کے لئے کشتی اور قوانین خداوندی کی نگہداشت کے کاموں میں تعاون کرو۔ اور ایسے معاملات میں تعاون نہ کرو جن سے انسانیت میں اضمحلال پیدا ہو جائے۔ یا جو لوگوں کو قوانین خداوندی کی سرکشی پر آمادہ کریں۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ جب قرآنی نظام تمام نوع انسانی کو امت واحدہ قرار دیتا ہے اور دنیا کے تمام مومنین کو ایک قوم کے افراد تسلیم کرتا ہے تو قرآنی مملکت کے اندر مذہبی فرقوں، سیاسی پارٹیوں کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ وہ فرقہ بندی کو شرک قرار دیتا ہے (۳۰/۲۱) اور رسولؐ سے کہتا ہے کہ ”ایسے لوگوں سے اسے کوئی واسطہ نہیں جو فرقے پیدا کرتے ہیں“ (۶/۱۰۰) باہمی اختلاف اس کے نزدیک خدا کا عذاب ہے (۳/۱۰۴) اور اس سے محفوظ رہنا اس کی رحمت (۱۱/۱۱۸)۔ باقی رہیں سیاسی پارٹیاں سو وہ ان کے وجود کو ”حکمت فرعونی“ کا کرشمہ قرار دیتا ہے (۲۸/۴)۔ اس نظام میں سب کے لئے ایک ہی آئین ہوگا جس کے اصول غیر متبدل ہوں گے۔ اور اس آئین کی رو سے پوری امت نظام عدل و ربوبیت قائم کرے گی۔ اور اس کے لئے کوئی ناجائز ذریعہ یا طریقہ اختیار نہیں کیا جائے گا۔ ساری دنیا کو ایک عالمگیر برادری بنانا اس کا مقصد ہوگا۔ اور تمام نوع انسانی میں امن قائم کر کے ان کی مضر صلاحیتوں کے لئے سامان نشوونما فراہم کرنا اس کا منتہی۔ وَذَلِكِ الدِّينُ الْقَيِّمُ۔

آج نیشنلزم کا ستایا ہوا انسان ایک ایسے مذہب کی تلاش میں ہے جو اس کے سینے پر سے اس کا بوس کو اتار سکے چنانچہ (J.M. MURRAY) اپنی کتاب (ADAM AND EVE) میں لکھتا ہے :-

چونکہ انسانوں کے دل سے خدا کا عقیدہ نکل گیا ہے اس لئے اس خالی مکان پر نیشنلزم کے شیطان نے قبضہ

کر لیا ہے۔ اب آسٹریا کو ایک مذہب کی ضرورت ہے جو نیشنلزم کے جذبہ پر غالب آسکے۔ (صفحہ ۲۶-۲۷)

مغربی مدبرین نے اس مصیبت کا حل انٹرنیشنلزم کے نظریہ میں محسوس کیا۔ چنانچہ انہوں نے پہلے لیگ آف نیشنز قائم کی اور اس کی ناکامی کے بعد انجمن اقوام متحدہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ نظریہ اور اس کا عملی اقدام کس حد تک اس مسئلہ کا حل بن سکتا ہے اس کے متعلق (EMREY REVES) اپنی کتاب (THE ANATOMY OF PEACE) میں لکھتا ہے:-

لیگ آف نیشنز ناکام رہ گئی۔ اس لئے کہ وہ انٹرنیشنلزم کے غلط عقیدہ پر قائم ہوئی تھی۔ اس عقیدہ پر کہ مختلف قوموں کے درمیان صلح قائم رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے نمائندوں کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تاکہ وہ اپنے اختلافی معاملات کا تصفیہ بحث کے ذریعہ کر لیا کریں۔ (کس قدر غلط تھا یہ تصور)۔ ان تنازعات کا حل ممکن ہی نہیں جب تک قوموں کے تعلقات کی بنیاد میں اصلاح نہ ہو جائے (اور وہ بنیاد ہے نیشنلزم)۔ (صفحہ ۱۶۱)

اس کے بعد (REVES) لکھتا ہے:-

ہم انٹرنیشنلزم سے کافی کھیل چکے ہیں۔ جو مسئلہ دنیا کے سامنے پیش ہے وہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو قوموں کے حل کرنے کا ہو (وہ تو خود قوموں کا پیدا کردہ ہے)۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم کے نظریہ نے انسانی معاشرہ میں ایک فساد برپا کر دیا ہے۔ لہذا ایسے ممکن ہے کہ خود نیشنلزم، خواہ وہ انٹرنیشنلزم ہی کیوں نہ بن جائے، اس کا حل دریافت کرے۔ اس مسئلہ کا حل انسانی عالمگیریت (UNIVERSALISM) میں ہے۔ ایک ایسا عقیدہ یا تحریک جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ قومیت اور بین الاقوامیت کی سطح سے اوپر جا کر خالص انسانی سطح پر دنیا میں امن قائم کرنا چاہتی ہے۔ (صفحہ ۱۶۲)

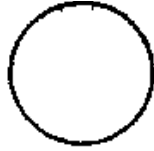
سابقہ صفحات میں جو کچھ اسلامی نظام سیاست کے سلسلہ میں لکھا گیا ہے اس پر ایک نظر پھر ڈالنے اور دیکھنے کہ مسٹر (REVES) جس عقیدہ یا تحریک کو دورِ حاضر کی مصیبتوں کا حل تجویز کرتا ہے وہ اسلام کے سوا اور کہاں مل سکتا ہے؟ اس نکتہ کو اور وضاحت سے بیان کرتا ہے جب وہ لکھتا ہے کہ (FREDICH HERTZ)

اب اس حقیقت کو ہر ایک محسوس کر رہا ہے کہ خالی انٹرنیشنلزم کی کوئی مشینری بھی کوئی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی، اگر اس میں صحیح روح نہیں ہے۔ لیکن پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ روح کس طرح پیدا ہو اور قوموں میں کس طرح پھونکی جائے۔ اس کے لئے بڑے بڑے بلند آہنگ دعاوی کچھ کام نہیں دے سکتے۔ نہ ہی یہ کہہ دینا کافی ہے کہ قومیں از خود اپنے اندر اس روح کی تعلیم عام کریں۔ اس کے لئے ایک عملی اسکیم اور تربیت کرنیوالوں کی جماعت کی ضرورت ہے۔... یہ تعلیم وحدت انسانی کے جذبہ کو پیدا کرنے کے لئے ہوگی اس کے لئے اسکو بھی

صحیح مقام نہیں۔ اس کا تعلق زندگی کے تمام اہم سیاسی، معاشی اور معاشرتی معاملات سے ہے اور یہ اُسی صورت میں ممکن ہے کہ دنیا کی تمام اقوام اپنے اپنے ہاں ایک جیسے معاشی اور معاشرتی نظام قائم کر لیں۔

(خاتمہ کتاب، صفحہ ۴۱۲)

یعنی اس کے نزدیک ان مشکلات کا حل اس کے سوا کچھ نہیں کہ ساری دنیا میں ایک جیسا معاشی اور معاشرتی نظام قائم ہو۔ یہ وہ حل ہے جسے قرآن نے آج سے چودہ سو سال پہلے تجویز کیا تھا جب دنیا عالمگیر انسانیت کے نام تک سے آشنا نہ تھی۔



تقدیرِ اُمم

(قوموں کے عروج و زوال کے اٹل قوانین)

یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم نے خدا کا جو تصور دیا ہے اس کی رُو سے اس نے ایسے قوانین متعین کر دیئے ہیں جن کے مطابق کائنات کا یہ عظیم سلسلہ سرگرم عمل ہے۔ اسی قسم کے قوانین اس نے انسانی دنیا کے لئے بھی مقرر کر رکھے ہیں انسانی دنیا میں ایک تو افراد کی زندگی ہے۔ ان قوانین کا اطلاق ایک فرد کی طبعی زندگی اور اس کی ذات کی نشوونما دونوں پر ہوتا ہے لیکن اس سے کہیں اہم اقوام کی زندگی ہے۔ قوم اگرچہ افراد ہی کے مجموعے کا نام ہے لیکن اس کی نفسیات منفرد اور مختص ہوتی ہیں۔ قرآن نے وہ قوانین بھی دیئے ہیں جن کے مطابق قوموں کے عروج و زوال اور ان کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ اگر ایک قوم خدا کے متعین کردہ قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتی ہے۔ یعنی وہ ایسا نظام اور معاشرہ تشکیل کرتی ہے جس کی بنیادیں خدا کے مقرر کردہ قوانین پر استوار ہوں، تو اس قوم کو سرفرازیوں اور سر بلندیاں نصیب ہوتی ہیں اور اگر وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کرے تو وہ تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ اس کا نام اجتماعی قانونِ مکافاتِ عمل ہے اور یہ اسی طرح اٹل اور غیر متبدل ہے جس طرح افراد کے لئے قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔ قرآن کی رُو سے تاریخ اسی اجتماعی قانونِ مکافاتِ عمل کے ریکارڈ کا نام ہے۔ یعنی وہ یہ بتاتی ہے کہ فلاں قوم نے فلاں نظریہ زندگی کے مطابق معاشرہ قائم کیا تو اس کا یہ انجام ہوا اور فلاں قوم نے فلاں تصورِ حیات کے مطابق زندگی بسر کی تو اس کا مال یہ ہوا۔ دورِ حاضر کی اصطلاح میں لے لے "سائنس" تاریخ کی اہمیت

آف ہسٹری" یا "فلاسفی آف ہسٹری" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تاریخ کو ایک فلسفہ یا سائنس کی حیثیت سے سب سے پہلے قرآن نے پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تاریخ کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اتنی اہمیت کہ وہ تاریخ کو اپنے دعاوی کی صداقت کے لئے بطور شہادت پیش کرتا ہے۔ یعنی وہ کہتا ہے کہ جب ہم نے کہا ہے کہ جو قوم اس انداز کی زندگی بسر کرے گی وہ تباہ و برباد ہو جائے گی تو اس دعوے کی صداقت کا ثبوت یہ

ہے کہ تم تاریخ انسانیت پر غور کرو اور دیکھو کہ جس جس قوم نے جس جس ملک اور جس جس زمانے میں یہ روشن اختیار کی اس کا انجام تباہی اور بربادی ہوا یا نہیں۔ قرآنی دعاوی (یا خدا کے اٹل قوانین) کے پرکھنے کے لئے یہ ایک ایسا معیار ہے جو ساری دنیا کے لئے کھلا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اپنے متبعین کو خاص طور پر تاکید کی ہے کہ وہ تاریخ کا گہرا مطالعہ کریں۔ اس سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو قرآنی دعاوی کی صداقت کے شواہد ان کے سامنے آجائیں گے اور دوسرے وہ اس بات کا اندازہ کرتے رہیں گے کہ ان کا کوئی قدم غلط رستے کی طرف تو نہیں اٹھ رہا۔ چنانچہ اس نے کہا ہے کہ ہم نے تمہاری راہ نمائی کے لئے قرآن میں دو چیزیں دی ہیں۔ وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ آيَاتٍ مُّبِينَاتٍ وَ

قرآن اور تاریخ

مطابق قوموں کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہیں اور دوسرے اقوام سابقہ کے احوال و کوائف (تاریخ) جن سے ان قوانین کی صداقت پرکھی جاسکتی ہے۔ آپ قرآن کو دیکھتے۔ اس میں اقوام سابقہ کے احوال و مال اس تفصیل و تکرار سے دیئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ تاریخ کی کتاب ہے۔ لیکن وہ تاریخ کی کتاب نہیں۔ اس کا اندازہ یہ ہے کہ وہ پہلے ان قوانین کو بیان کرتا ہے جو قوموں کے عروج و زوال کو متعین کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد اقوام گذشتہ کے حالات سامنے لا کر یہ بتاتا ہے کہ دیکھو ان قوانین نے اپنا اٹل نتیجہ کس طرح مرتب کیا۔ اور پھر اس سے توجہ فوراً اس طرف مبذول کر دیتا ہے کہ اگر تم نے بھی اس قسم کی روش اختیار کی تو تمہارا انجام بھی ایسا ہی ہوگا۔ وہ قرآن کے نظام حق و صداقت کے مخالفین کے متعلق کہتا ہے کہ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ يَلْتَمِسُونَ... كَانُوا يَكْسِبُونَ (۳۰/۸۲) ”کیا یہ لوگ زمین پر چلے پھرے نہیں کہ یہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ جو قومیں ان سے پہلے ہو گزری ہیں اور انہوں نے ان کی طرح غلط روش اختیار کی تھی ان کا انجام کیا ہوا؟ ان کی اجر ٹی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات کی ٹھیکریاں ان کی عظمت گذشتہ کی داستا نہیں پکار پکار کر دہرا رہی ہیں۔ وہ قومیں تعداد میں بھی ان سے زیادہ تھیں (جو اب اس نظام کی مخالفت کر رہے ہیں) اور قوت میں بھی بڑھ کر۔ ان کی قوت و شوکت کے جھنڈے زمین میں گڑے ہوئے تھے۔ لیکن جب ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج

قوموں کا انجام

کے ظہور کا وقت آیا تو نہ ان کی تعداد کی کثرت ان کے کسی کام آسکی اور نہ ہی دولت و قوت انہیں اس تباہی سے بچا سکی۔ ان پر یہ تباہی اچانک نہیں آگئی تھی۔ خدا نے پہلے ان کی طرف اپنے پیغامبروں کو بھیجا تاکہ وہ انہیں تنبیہ کریں۔

WARNING دے دیں کہ جس رستے پر تم چل رہے ہو وہ تمہیں تباہی کے جہنم کی طرف لئے جا رہا ہے۔ فَلَمَّا جَاءَهُمْ نَذْرٌ... كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ (۳۰/۸۳)۔ لیکن جب خدا کے پیغامبران کی طرف ایسے واضح دلائل لے کر آئے تو انہوں نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ ہم جس طریق پر چلے جا رہے ہیں اس سے مطمئن ہیں۔ وہ ہمیں

مستروں کے جھولے جھلارہا ہے۔ تم خواہ مخواہ کہہ رہے ہو کہ ہم پر تباہیاں لا رہا ہے۔ لیکن آخر الامر انہیں اس تباہی نے آکر گھیر لیا جس کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے۔ فَلَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا قَالُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا كُنَّا بِمُشْرِكِينَ ۝ (۴۰/۸۴) جب انہوں نے اس تباہی کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا تو اس وقت کہنے لگے کہ ہم خدائے واحد پر ایمان لاتے ہیں اور جن قوتوں کو ہم اس کا ہمسر ٹھہرایا کرتے تھے ان سے انکار کرتے ہیں۔ لیکن فَلَمَّا نَكُتُ..... بَأْسَنَا (۴۰/۸۵) جب غلط روش کے نتائج مرتب ہو کر سامنے آجائیں تو اس وقت اس سے اجتناب کرنا کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ اور یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہ تھی جو صرف انہی کے ساتھ مختص تھی۔ سُنَّتَ اللَّهُ الَّتِي..... الْكَافِرُونَ (۴۰/۸۵) یہ خدا کا اہل قانون ہے جس کے مطابق تمام اقوام سابقہ کی موت و حیات کے فیصلے ہوئے ہیں۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں حق و صداقت کی روش سے انکار کرنے والے نقصان میں رہتے ہیں۔

دوسرے مقام پر ہے وَكَذَّبُوا..... قَوْمًا أَخْرَجْنَا (۲۱/۱۱)۔ کتنی ہی بستیاں ایسی تھیں جنہوں نے ظلم و استبداد کی روش اختیار کر رکھی تھی ہم نے انہیں (ان کی غلط روش کے نتیجے میں) ہلاک کر دیا اور ان کی جگہ دوسری قوم لے آئی۔ ان (تباہ ہونے والی قوم) کی حالت یہ تھی کہ انہیں ان کی غلط روش کے نتائج سے ہزار آگاہ کیا گیا لیکن انہوں نے ایک نہ سنا۔ لیکن فَلَمَّا أَحْسَبُوا بَأْسَنَا إِذَا هُمْ مِمَّنْهَا يَرْكُضُونَ (۲۱/۱۲) جب انہوں نے ہمارے عذاب کو محسوس شکل میں سامنے دیکھ لیا تو اس سے بھاگنے لگے۔ لیکن ہمارے قانون مکافات نے انہیں لٹکار کر کہا کہ لَا تَرْكُضُوا۔ بھاگو نہیں۔ تم بھاگ کر جا کہاں سکتے ہو؟

قانون مکافات کی گرفت

وَإِنْ جَعَلُوا..... تُسْأَلُونَ (۲۱/۱۳) چلو واپس اپنے محلات کی طرف اور اُس ساز و آرائی کی طرف جو ہمارے لئے اس قدر آسائشیں ہم پہنچاتا تھا۔ واپس چلو تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ اتنا مال و دولت تم نے کہاں سے لیا تھا؟ وہ مظلوم کون تھے جن کے خونِ ناحق کی رنگینی تمہارے محلات کے لئے وجہ آرائش بنی تھی۔ قَالُوا يُؤَيَّلْنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ (۲۱/۱۴) اس پر وہ پکار اٹھے کہ ہم واقعی بہت ظلم و ستم کیا کرتے تھے۔ یہ تمام ساز و سامان اُسی ظلم و ستم کا نتیجہ ہے۔ فَمَا تَرَأَيْتُ خَامِدِينَ (۲۱/۱۵) وہ یہی پکارتے رہے لیکن ان کی اس وقت کی پکار انہیں کچھ فائدہ نہ دے سکی۔ خدا کے قانونِ مکافات عمل نے انہیں ایسا کر دیا جیسے کٹے ہوئے کھیت (اور) بچھے ہوئے شعلے ہوں۔

مذکورہ بالا آیت (۲۱/۱۲) میں کہا گیا ہے کہ فَلَمَّا أَحْسَبُوا بَأْسَنَا۔ جب انہوں نے ہمارے عذاب کو محسوس شکل میں سامنے دیکھا۔ جب انہیں اس کا احساس ہوا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ غلط نظام تمدن و معاشرت اپنے تباہ کن نتائج تو روز اول ہی سے مرتب کرنا شروع کر دیتا ہے لیکن وہ اثرات بڑے غیر محسوس ہوتے ہیں اور انہیں صرف وہی آنکھ دیکھ

سکتی ہے جس پر مفاد پرستیوں کے پردے نہ پڑے ہوں۔ یہ نتائج اندر ہی اندر آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ تاآنکہ ایک دن محسوس شکل میں سامنے آجاتے ہیں۔ ”محسوس شکل میں سامنے آنے“ کے معنی یہ ہوتے کہ ان کی تباہی ایسے اسباب و ذرائع سے ہوتی ہے جو محسوس طور پر نظر آتے ہیں لیکن یہ اسباب ان کے غلط نظام کو تباہ کرنے کا فقط ذریعہ (INSTRUMENT) ہوتے ہیں۔ اس کا اصلی سبب (REAL CAUSE) تو

تباہی کا اصلی سبب

ان کی غلط روش زندگی ہوتی ہے۔ وقائع نگار (جن کے نزدیک تاریخ فقط واقعات و حوادث کے ریکارڈ کا نام ہے) ان محسوس اسباب کو ان کی تباہی کا سبب قرار دے دیتے ہیں لیکن قرآن جو تاریخ کو ایک سائنس یا فلسفہ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، ان واقعات و حوادث (یعنی ظاہری اسباب) کو چنداں اہمیت نہیں دیتا۔ وہ علاماتِ مرض کی بجائے علتِ مرض کی نشاندہی کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ ان کی تباہی کا حقیقی سبب وہ تھا۔

آپ نے یہ بھی دیکھا ہے کہ قرآن نے اس قانون کو جس کی رو سے قوموں کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہیں ”سنت اللہ“ سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے لفظی معنی ہیں ”خدا کی عادت“ اور اس سے مراد ہے وہ قانون مکافاتِ عمل جو شروع سے یکساں چلا آتا ہے اور غیر متبدل ہے۔ فطرت کے تمام قوانین

سنت اللہ

”سنت اللہ“ میں جن میں کبھی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ سورۃ احزاب میں ہے: سُنَّةَ اللّٰهِ..... قَدْ اَرٰ اَمَقْدُوْمًا (۳۲/۲۹) ”یہ اللہ کی عادت ان لوگوں کے متعلق تھی جو اس سے پہلے ہو گزرے ہیں“ اللہ کی عادت کیا؟ یہ اس کا فیصلہ ہے جو ایک اٹل قانون کی شکل اختیار کر چکا ہے؛ اسی سورت میں ذرا آگے چل کر ہے: سُنَّةَ اللّٰهِ..... تَبْدِيْلًا (۳۲/۴۱) یہی قانونِ خداوندی ہے جس نے اقوامِ سابقہ کی تقدیروں کے فیصلے کئے تھے۔ تو قانونِ خداوندی میں کبھی تبدیلی نہیں پائے گا۔ اسی طرح سورۃ فاطر میں اقوامِ سابقہ کے احوال و ظروف اور انجام و عواقب کے سلسلے میں کہا کہ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّةَ الْاَوَّلِيْنَ (۳۵/۳۳) یہ لوگ جو اس نظامِ خداوندی کی مخالفت کر رہے ہیں، انہیں ان کے سوا اور کسی چیز کا انتظار نہیں کہ خدا کے جس قانون کے مطابق اقوامِ گزشتہ کے فیصلے ہوئے تھے اسی قانون کا ان پر اطلاق ہو جائے۔ سوا نہیں معلوم ہونا چاہیے کہ خدا کا وہی قانون ان پر بھی منطبق ہو کر رہے گا۔ اس لئے کہ وَلَنْ تَجِدَ اِسْمَتِ اللّٰهِ تَخْوِيْلًا (۲۵/۳۳) تو نہ تو خدا کے قانون میں کوئی تبدیلی پائے گا اور نہ ہی ایسی صورت ہو سکے گی کہ جب وہ قانون آجائے تو کوئی اس کا رُخ کسی دوسری طرف پھیر دے۔

ہمارے زمانے میں (HEGEL) نے اور اس کے تابع میں مارکس (MARX) نے تاریخ کو ایک فلسفہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ لیکن ان کا فلسفہ تاریخ کیا ہے؟ ہیگل نے کہا کہ ایک تصور (IDEA) پیدا ہوتا ہے۔ پروان چڑھتا ہے۔ جب شباب تک پہنچتا ہے تو اس میں

ہیگل اور مارکس کا فلسفہ تاریخ

اخطاط شروع ہو جاتا ہے اور اس سے اس کی ضد ایک دوسرا تصور نمودار ہو جاتا ہے۔ اس کا بھی یہی حشر ہوتا ہے۔ اور اس میں سے ایک اور تصور پیدا ہو جاتا ہے جو اس کی ضد ہوتا ہے۔ ساری تاریخ انہی متضاد تصورات کی کشمکش کی داستان ہے۔ مارکس نے بھی یہی کہا اس تبدیلی کے ساتھ کہ یہ جنگ تصورات کی نہیں بلکہ نظائے معیشت (ECONOMIC SYSTEMS) کی ہے۔ ایک معاشی نظام پیدا ہوتا ہے۔ پروان چڑھتا ہے۔ پھر اس میں سے اس کی ضد ایک اور نظام نمودار ہوتا ہے جو پہلے نظام کو ختم کر کے اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کا بھی یہی حشر ہوتا ہے۔ جب ہیگل سے پوچھا گیا کہ اس ربط و نظم کے ساتھ یہ سلسلہ کشمکش کس قوت کی بنا پر جاری و ساری ہے تو اس نے کہا کہ یہ "روحِ زمانہ" (ZEITGEIST) کی کار فرمائی ہے۔ اور جب یہی سوال مارکس سے کیا گیا تو اس نے کہا کہ اس کا سبب تاریخی وجوہ (HISTORICAL NECESSITY) ہے۔

تاریخ کے اس فلسفہ کی رُو سے نہ کائنات کے سامنے کوئی مقصد اور منزل مقصود ہے۔ نہ کوئی تصوری ذاتہ خیر یا شر ہے۔ نہ کسی تصوری نظام میں آگے بڑھنے اور باقی رہنے کی صلاحیت ہے۔ نہ ہی اس تمام کارگاہِ ہست و بود کے پیچھے کوئی ایسی قوت ہے جو اس عظیم سلسلہ کو کسی مقصد کے مطابق چلا رہی ہو۔ کچھ اندھی قوتیں ہیں جو میکا کی طور پر مصروف کشمکش ہیں۔ اور یکس دے بس انسان ان تصادماتِ بے معنی اور تراحماتِ بے مقصد میں خواہ مخواہ پستا چلا جا رہا ہے۔

قرآنی فلسفہ تاریخ | لیکن قرآن نے جو فلسفہ تاریخ پیش کیا ہے وہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کائنات میں حق اور باطل کی کشمکش پیہم جاری ہے۔ حق، اٹل، مستحکم اور غیر متبدل ہے اور اس کا نتیجہ تعمیر و ارتقار۔ اس کے برعکس باطل مرغِ باد نما کی طرح ہر آن بدلنے والا ہے اور اس کا نتیجہ تخریب و تنزل ہے۔ حق و باطل کی اس کشمکش میں آخر الامر حق غالب آتا ہے۔ اس لئے کہ باطل پر غلبہ حاصل کرنا اس کی فطرت میں داخل ہے، **بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ (۲۱/۱۸) ہم حق کو باطل پر مارتے ہیں۔ اور اس کی ضرب ہائے پیہم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فَيَذَرُهَا حَقٌّ بَاطِلًا كَاسِرًا تَوْرًا دِيْتَابًا، فَاِذَا هُوَ نَارٌ اٰهَقٌ۔** پس وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلتا ہے؛ **وَلَكُمْ اَلْوَيْلٌ مِّمَّا تَصِفُوْنَ (۲۱/۱۸) تم لوگ اس نظریہ کے خلاف جو کچھ بیان کرتے ہو، اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔** اب سوال یہ ہے کہ یہ کشمکش حق و باطل اور آخر الامر حق کا غلبہ اور باطل کی شکست ہوتی کس مقصد کے لئے ہے؟

اور اس کے پیچھے کون سی قوت کار فرما ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ خدا نے یہ سلسلہ کائنات بال مقصد (WITH A PURPOSE) پیدا کیا ہے۔ یونہی بیکار (IN VAIN) پیدا نہیں کیا۔

سورۃ اللہاخان میں ہے کہ **وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ لَعِيْنٍ (۲۳/۲۸) ہم نے کائنات کی پستیوں**

اور بلندیوں کو اونہی کھیلے ہوئے پیدا نہیں کیا۔ مَا خَلَقْنَاهُمْ لَمَّا.....
لَا يَعْلَمُونَ (۴۲/۳۹) ہم نے اسے حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے

لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کا علم نہیں رکھتے اور سمجھتے ہیں کہ کائنات یونہی وجود میں آگئی ہے اور بلا مقصد سرگرم عمل ہے۔ یہ تصور غلط ہے۔ کائنات کی تمام قوتیں اس لئے سرگرم عمل ہیں کہ ہر عمل اپنا صحیح نتیجہ مرتب کرے رَلِيَ جَزْءُ كَبِّ الدُّنْيَا..... بِالْحُسْنَى (۵۲/۲۱) تاکہ وہ ان لوگوں کو جو ناسمجھ ہیں ان کی غلط روش کا تباہ کن نتیجہ دکھائے۔ اور جو لوگ سمجھاریاں اور خوشگواریاں پیدا کرتے ہیں انہیں اچھا بدلہ ملے۔

چونکہ کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے، اس لئے ہر وہ تصور، ہر وہ عمل، ہر وہ نظام زندگی جو حق (مستقل اقدار) کے مطابق ہو گا وہ زندہ رہے گا اور آگے بڑھے گا۔ جو اس کے خلاف جائے گا اور تعمیر انسانیت کے لئے مضر ہو گا وہ تباہ ہو جائے گا۔ اس مقام پر ممکن ہے یہ کہا جائے کہ ہمارا روزمرہ کا تجربہ اس کے خلاف ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ظالموں کی کھیتی پتی ہے اور جو لوگ عدل و دیانت کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں ان پر عرصہ حیات تنگ ہو جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ یہی ہے۔ لیکن کسی تصور حیات، نظام زندگی یا اس تصور و نظام کی حامل قوم کی کیفیات کا مشاہدہ ایک دن میں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے صدیاں درکار ہوتی ہیں۔ اس لئے قرآن نے کہا ہے کہ خدا کے کائناتی قوانین کا ایک ایک دن تمہارے

اقوام کی زندگی ماننے کے پیمانے

حساب و شمار کے مطابق ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔ سورہ الحج میں ہے۔ وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ. یہ لوگ کہتے ہیں کہ جس تباہی اور بربادی سے انہیں ڈرایا جاتا ہے وہ جلدی کیوں نہیں آتی۔ اگر ہماری روش غلط ہے تو ہم عذاب میں کیوں نہیں ماخوذ ہو جاتے؟ اس کے جواب میں کہا گیا کہ وَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ. تم اس کا یقین رکھو کہ خدا کا قانون مکافات اٹل ہے۔ اس میں کبھی خطا نہیں ہو سکتی۔ لیکن بات یہ ہے کہ اِنْ يَوْمًا عِندَنَا..... وَمَا تُعَدُّونَ (۲۲/۴۷) خدا کے قانون مکافات کا ایک ایک تمہارے حساب و شمار سے ہزار ہزار سال کا ہے۔ تو میں نہ ایک دن میں بنا کرتی ہیں نہ ایک دن میں ختم ہو جاتی ہیں۔ ان کی زندگی اور موت کے پیمانے افراد کے پیمانوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ لہذا اگر کسی قوم کے غلط نظام معاشرہ کا تباہ کن نتیجہ جلد سامنے نہیں آتا تو اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ ان کی اس غلط روش کا نتیجہ مرتب ہی نہیں ہو رہا۔ میزان کائنات میں ان کے ہر عمل کا ذرہ ذرہ ٹلتا ہے؛ فَمَنْ يَعْمَلْ..... شَأْنًا يَسْءُ (۹۹/۷-۸) جو ایک ذرہ کے

لے کائنات کے متعلق قرآنی نظریہ کی تفصیل آئندہ باب میں ملے گی۔

برابر بھی ٹھیک کام کرتا ہے اس کا نتیجہ بھی سامنے آجائے گا۔ جو ایک ذرہ کے برابر غلط کرتا ہے وہ اسے بھی دیکھ لے گا۔ یہاں
میزان عمل ہر وقت موجود رہتی ہے

اقوام کی صحت اور بیماری (اور زندگی اور موت) کا اصول ہے کہ جب تک اچھے کاموں کا پلڑا اچھا رہتا ہے قوم زندہ رہتی اور آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جب غلط کاموں کا پلڑا جھک جاتا ہے تو قوم کا تنزل شروع ہو جاتا ہے: **فَأَمَّا مَنْ..... هَادِيَةً (۹-۱۱/۹)** اس لئے کہ تعمیری امور تخریبی امور کے نقصان رسا اثرات کو ساتھ کے ساتھ زائل کرتے رہتے ہیں: **إِنَّ لِحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (۱۱/۱۱۴)** اس کے برعکس اگر تخریبی امور کا پلڑا جھکتا چلا جائے تو وہ قوم آہستہ آہستہ بتدریج ہلاکت کے جہنم کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ایسے غیر محسوس انداز سے کہ انہیں پتہ بھی نہیں چلتا کہ وہ تباہی کی جانب کشاں کشاں چلے جا رہے ہیں۔ قرآن کے الفاظ میں **سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ (۲۳/۶۸)** ہم انہیں بتدریج اس طریق سے پکڑتے ہیں جس کا انہیں علم بھی نہیں ہوتا۔ اگر وہ قوم اپنی ہلاکت سے پہلے اپنی روش کی اصلاح کرنے اور اس کی جگہ صحیح طریق زندگی اختیار کرنے تو وہ تباہی سے بچ جاتی ہے لیکن اگر وہ ایسا نہیں کرتی اور تباہی کے جہنم تک پہنچ جاتی ہے تو پھر اس کے لئے باز آفرینی کا کوئی موقع نہیں رہتا۔ **وَحَرَامٌ عَلَىٰ قَرْيَةٍ..... تَنْجِعُونَ (۹۵/۲۱)** اور وہ اس طرح ہلاک ہوتی ہے کہ **فَمَا بَلَّغْتُ..... مُنْظِرِينَ (۲۹/۴۲)** کہ ان کی تباہی پر نہ آسمان روتا ہے نہ زمین۔ نہ ہی انہیں ہہلت دی جاتی ہے۔

جس طرح افراد کی طبعی زندگی سے متعلق بیماریاں مختلف ہوتی ہیں اسی طرح اقوام کے نظامائے تمدن و معیشت کی خرابیاں بھی متنوع ہوتی ہیں۔ پھر جس طرح ہر مرض اور اس کی وجہ سے آنے والی موت کا درمیانی عرصہ مختلف ہوتا ہے۔ تب دق سے مریض برسوں میں گھل گھل کر مرتا ہے لیکن گردن توڑ بخار چند دنوں کی بھی ہہلت نہیں دیتا۔ اسی طرح نظامائے تمدن و معیشت کی خرابی اور اس کی وجہ سے آنے والی ہلاکت میں بھی ہہلت کا وقفہ مختلف ہوتا ہے۔ اسی ہہلت کے وقفہ

اجل کا مفہوم

الکی آخری حد کو قرآن کی اصطلاح میں **أَجَلٌ** کہتے ہیں۔ سورہ یونس میں ہے کہ **بِكُلِّ أُمَّةٍ..... لَا يَسْتَفِيدُونَ (۱۱/۴۹ تا ۲۳/۴۳)** ہر قوم کے لئے ایک اجل ہوتی ہے اُس وقت سے پہلے تو ان کے لئے اصلاح احوال کی گنجائش ہوتی ہے لیکن جب وہ آخری وقت آجاتا ہے تو اس میں ایک گھڑی کا تقدم و تاخر بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ طبعی امراض کی طرح اجتماعی زندگی اور موت کے لئے بھی اٹل قانون مقرر ہے اور یہ سب کچھ اس قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں یہ کہا گیا ہے کہ **بِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ (۱۱/۴۹)** ہر قوم یا ہر نظام کے لئے ایک اجل ہوتی ہے تو دوسری جگہ یہ کہہ کر اس کی وضاحت کر دی کہ **بِكُلِّ أُمَّةٍ كِتَابٌ (۱۲/۲۸)** ہر اجل کے لئے

ایک قانون مقرر ہے۔ قوموں کا محدود ثبات اسی قانون کے مطابق ہوتا ہے (يَمْنَحُوا اللّٰهُ..... وَيُثَبِّتُ) اور یہ سب کچھ خدا کی اس مشیت کے مطابق ہوتا ہے جس کی رو سے افراد اور اقوام کی موت اور زندگی کے لئے قوانین مرتب ہوئے ہیں۔ وَعِنْدَنَا أُمُّ الْكِتَابِ (۱۳/۳۹) "قانون کی اصل و بنیاد اس کے پاس ہے۔"

تصریحات بالا سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کی رو سے قوموں کی موت و حیات نہ یو نہی ہنگامی اور اتفاقی طور پر واقع ہوتی ہے اور نہ ہی "فطرت کی کسی اندھی قوت" کی رو سے محض دھاندلی سے۔ یہ سب کچھ قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ لِيَهْلِكَ... عَنِ بَيْتِنَا (۸/۲۲) تاکہ جو

موت و حیات علی بصیرت

ہلاک ہو وہ بھی دلیل و برہان کی رو سے ہلاک ہو اور جو زندہ رہے وہ بھی دلیل و برہان کی رو سے زندہ رہے یہاں نہ زندگی بخشش کے طور پر ملتی ہے نہ ہلاکت اور تباہی دھاندلی سے ہوتی ہے

وَمَا كَانَ اللّٰهُ..... يَظْلِمُونَ (۲۹/۴۰) "خدا کسی قوم پر ظلم نہیں کرتا وہ قوم خود اپنے آپ پر ظلم کرتی ہے۔" اور اس کی وجہ سے تباہ ہو جاتی ہے۔ خدا کو (معاذ اللہ) کسی پر ظلم کر کے لذت نہیں ملتی کہ وہ دوسروں کو عذاب میں مبتلا کر کے (ان کے ٹپنے اور پھرنے کا تماشا دیکھے) وہ کہتا ہے کہ مَا

خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا

يَفْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ اِيْكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ (۳۱/۱۳۷) اگر تم خدا کے مقرر کردہ اصولوں پر قائم رہو اور زندگی کے لمحات کی قدر کرو تو اللہ نے تمہیں عذاب دے کر کیا کرنا ہے؟ جو قوم یہ سمجھتی ہے کہ سُبْحٰنَ اٰهٰلِنَا (۸۹/۱۶) "خدا نے ہمیں یوں ہی بے جرم و خطا ذلیل کر دیا۔" وہ ان سے لٹکا کر کہتا ہے کہ کَلَّا۔ ہرگز نہیں۔ تم غلط کہتے ہو۔ خدا نے بلا وجہ تمہیں ذلیل نہیں کر دیا۔ بَلْ لَّا تَشْكُرُوْنَ اَلَيْسِيْنَمْ (۷۹/۱۷) "تمہاری حالت یہ تھی کہ تم کسی ایسے انسان کی عزت نہیں کرتے تھے جو معاشرے میں تنہا رہتا ہے۔" وَلَا تَخْضَعُونَ عَلٰی طَعَاوِرِ الْمُسْكِيْنَ (۸۹/۱۸) نہ تم ایک دوسرے کو ترغیب دیتے تھے کہ جس کا

چلتا ہو آکار و بار رک جائے اس کی روٹی کا انتظام کرنا چاہیے۔ اس کے برعکس تمہاری حالت یہ تھی کہ وَتَأْكُلُونَ التَّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا (۸۹/۱۹) تم باپ دادا سے ملی ہوئی دولت کو سمیٹ کر خود ہی کھا جاتے تھے۔ وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا

(۸۹/۲۰) اور دولت سے اس قدر محبت کرتے تھے کہ چاہتے تھے کہ دوسروں کا مال و متاع بھی تمہارے قبضے میں آجائے۔

تم نے ایسا نظام قائم کر رکھا تھا جس کا لازمی نتیجہ تمہاری ذلت و خواری تھی۔ یہ وجہ تھی کہ تم ذلیل ہو گئے۔ خدا نے تمہیں یوں ہی بلا وجہ ذلیل نہیں کر دیا۔ خدا ایسا قطعاً نہیں کیا کرتا۔ جب تک کوئی قوم صلاحیت بخش نظام پر کار بند رہتی ہے ہلاکت سے محفوظ رہتی ہے۔ وَ مَا كَانَ رَبُّكَ..... مُضِلِّحُونَ (۱۱/۱۱۷) ہلاکت انہی کی ہوتی ہے جو صحیح قالب چھوڑ کر اپنے لئے

غلط پیکر اختیار کر لیتے ہیں؛ فَهَلْ يُهْلِكُ اِلَّا الْقَوْمَ الْفٰسِقُوْنَ۔ (۳۶/۳۵)

سوال یہ ہے کہ قوموں کی ہلاکت سے مراد کیا ہے؟ اس سے یہ مراد نہیں کہ اس قوم کا ایک ایک فرد موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے، اور اس طرح کا نام و نشان صفحہ ہستی سے مٹ جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسانی زندگی کے ابتدائی ادوار میں ایسا بھی ہوتا تھا کہ پوری کی پوری قوم طبعی طور پر تباہ ہو جاتی تھی۔

ہلاکت اہم سے کیا مراد ہے؟ اور اس طرح ان کا نام و نشان مٹ جاتا تھا، لیکن قرآن کہتا ہے کہ قوموں کی ہلاکت سے دراصل مراد یہ ہے کہ اُس قوم سے قوت و سطوت اور غلبہ و حکومت چھین جاتے ہیں۔ اور اس کی جگہ کوئی اور قوم لے لیتی ہے۔ اسے قانون استبدال و استخلاف اقوام

(LAW OF SUCCESSION AND

SUBSTITUTION OF NATIONS)

کہا جاتا ہے۔ مثلاً سورہ محمد میں ہے: هَآفَئْتُمْ... الْفُقَرَاءُ (۲۸/۴۷) دیکھو تمہاری حالت یہ ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ تم (اپنی فاضلہ دولت کو) نوع انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے دے دو تو تم میں وہ لوگ ہیں جو ایسا کرنا نہیں چاہتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ساری کی ساری دولت سمیٹ کر اپنے مفاد کی خاطر جمع رکھی جائے سو تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ جو شخص دولت کو اس طرح سمیٹ کر دوسروں کو ان کی نشوونما سے محروم رکھنا چاہتا ہے وہ دراصل اپنی ذات کو نشوونما سے محروم رکھتا ہے۔ خدائے جب تم سے کہا تھا کہ اس دولت کو دوسروں کی نشوونما کے لئے دے دو تو یہ تمہارے ہی بھلے کی بات تھی۔ اسے تمہاری دولت کی ضرورت نہیں۔ وہ تمہارا محتاج نہیں۔ تم اس کے محتاج ہو۔ بہر حال تم اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو کہ ان تَتَوَتَّوْا..... اَمْثَلُكُمْ (۲۸/۴۷) "اگر تم صحیح نظام زندگی سے پھر گئے (جس میں معاشرہ کا فریضہ تمام نوع انسان کی نشوونما ہوتا ہے) تو خدا تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تمہارے جیسے نہیں ہوں گے۔"

یہاں قرآن نے اتنا ہی کہا ہے کہ وہ قوم جو تمہاری جگہ لے گی تمہاری جیسی نہیں ہوگی۔ دوسرے مقام پر کہا ہے کہ وہ تم سے بہتر ہوگی۔ اِنَّا لَقَدْ مُؤَدُّنٌ..... مِنْهُمْ (۲۰/۷۰) اس سے ظاہر ہے کہ جو قوم کسی دوسری قوم کی جگہ لیتی ہے وہ جانے والی قوم سے بہتر ہوتی ہے۔

قوموں کا باہمی تصادم ایک تو مادی سطح پر ہوتا ہے۔ اس میں جس قوم کے پاس مادی قوت زیادہ ہو اسے غلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ یعنی ان میں سے کسی کے پاس بھی صحیح نظام نہیں ہوتا۔ جنگل کا قانون "ان کا ضابطہ ہوتا ہے۔ اس لئے ان کا ٹکراؤ حیوانی سطح پر ہوتا ہے۔ اس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ ذَکٰذٰلِکَ... یُکْسِبُوْنَ (۷۸۳۰) "اس طرح ہم ظالموں کے ایک گروہ کو ظالموں کے دوسرے گروہ پر حاکم بنا دیتے ہیں" یا ایک ہی قوم میں خانہ جنگی شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ... بِاَسْ لِعَظْمِ (۶/۶۵) یعنی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قوم پرستہ حکام عذاب

بن کر مسلط ہو جاتے ہیں اور عوام ان کے نیچے پستے چلے جاتے ہیں۔ اس کا رد عمل یہ ہوتا ہے کہ نیچے سے عوام اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور حکام کے خلاف بغاوت برپا کر دیتے ہیں۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ لیڈر اور عوام مل کر الگ الگ پارٹیاں بنا لیتے ہیں اور یہ پارٹیاں ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار ہو جاتی ہیں۔ ان تمام تصادمات کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ لیکن قرآن جس مقام کو ابھار کر سامنے لاتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک قوم کے پاس قوت اور دولت کی بھی کمی نہیں۔ تعداد بھی ان کی بہت ہے۔ انہیں غلبہ اور اقتدار بھی حاصل ہے لیکن چونکہ ان کا نظام غلط بنیادوں پر استوار ہے اس لئے وہ تباہ و برباد ہو جاتی ہے مثلاً سورہ روم میں ہے۔

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْأُمَمِ الَّتِي كَانَتْ أَكْثَرًا وَأَكْثَرًا... نَظَلُّونَ (۳۰/۹) کیا یہ لوگ زمین پر چلے پھرے نہیں جو یہ دیکھتے کہ جو قومیں ان سے پہلے ہو گزری ہیں ان کا انجام کیا ہوا۔ وہ لوگ ان سے قوت میں بڑھ چڑھ کر تھے۔ انہوں نے زمین کو زراعت

غلط اور صحیح نظام کا ٹکراؤ

کے قابل بنایا اور اسے ایسا آباد کیا کہ ان لوگوں نے بھی ویسا آباد نہیں کیا۔ لیکن ان کا نظام غلط تھا۔ اس لئے ہمارے پیغمبر ان کے پاس آئے لیکن انہوں نے ان کی باتوں پر توجہ نہ دی اور تباہ ہو گئے۔ سوائڈ نے ان پر ظلم نہیں کیا تھا۔ انہوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا تھا۔ دوسرے مقام پر قرآن کہتا ہے کہ یہ نہیں کہ یہ لوگ وحشی اور ظالم تھے۔ یہ عقل و بصیرت رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود نہیں سمجھتے تھے کہ ان کا نظام معاشرہ کس قدر کمزور بنیاد پر استوار ہے۔ چنانچہ وہ عادی نمود رکھتے تھے۔

مُتَّبِعِينَ (۲۹/۲۸) ان کی تباہی ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے

علم و بصیرت کے باوجود تباہی

کھنڈرات سے ہو رہے ہیں۔ ان کی ذاتی مفاد پرستیاں ان کے غلط نظام کو ان کی نگاہوں میں نہایت درخشاں اور تابناک بنا کر دکھاتی تھیں۔ اور اس طرح انہیں صحیح راستے پر چلنے سے روکتی تھیں۔ حالانکہ وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ دوسرے مقام پر ہے۔

وَلَقَدْ مَكَنَّاكُمْ فِي طِبْرِ الْأَرْضِ وَمَجْعَلُنَا لَهُمُ... أَنفِدَاؤُا اور ہم نے سمع و بصر اور قلب بھی عطا کیا تھا۔ ان کے ذرائع علم بہت وسیع تھے اور دانش و بینش سے بھی بہرہ وافر عطا ہوا تھا۔ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ... يَسْتَهْزِئُونَ (۳۶/۲۶) لیکن چونکہ وہ قوانین خداوندی سے انکار کرتے تھے اور معاشرہ کو اپنے خود ساختہ اصولوں کے مطابق چلاتے تھے۔ اس لئے ان کے سمع و بصر اور قلب ان کے کسی کام نہ آئے۔ اور انہیں اس تباہی نے آیا جس پر وہ ہنسا کرتے تھے۔ یہ وہ مقام جسے قرآن ابھار کر سامنے لاتا ہے۔ یعنی ایک قوم کے پاس دولت کی فراوانیاں ہیں۔ سامان زریست کی کمی نہیں۔ قوت و سطوت شوکت و حشمت جاہ و جلال سب کچھ ہے۔ اس کے ساتھ دنیاوی علوم کی بھی کمی نہیں۔ لیکن ذاتی مفاد پرستی کے جذبات اس قدر شدید

ہیں کہ وہ ان کے کافروں کو بہرہ اور ان کی آنکھوں کو اندھا کئے ہیں۔ اور انہیں نظر ہی نہیں آتا کہ جس راستے پر وہ چل رہے ہیں اس کا انجام کیا ہے۔ ان کے سامنے صحیح نظامِ خداوندی پیش بھی کیا جاتا ہے لیکن (چونکہ وہ ان کے عاجلانہ مفاد کے خلاف جاتا ہے اس لئے) وہ اس کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ ان کا نظام غلط بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

تدبیر کی فسوں کاری سے قائم رہ نہیں سکتا

جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

سلطنتِ روما کا زوال | تاریخِ تہذیب کا مشہور مؤرخ برقا (BRIFAULT) سلطنتِ روما کی تباہی کے اسباب و علل پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے :-

انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔ خواہ اس نظام باطل کو کیسے ہی تدبیر اور دانشمندی سے کیوں نہ چلایا جائے۔ اس کی بنیادی کمزوری خارجی نظم و ضبط اور ادھر ادھر کی جزئی مرمت سے کبھی رفع نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس کی اصل باقی ہے اس کے لئے تباہی مقدر ہے۔ روما کی سلطنت عام انسانوں کی لوٹ کھسوٹ سے ایک خاص جماعت کو متمول بنانے کا ذریعہ تھی۔ انہوں نے ”سوداگری“ کو نہایت قابلیت اور تدبیر، خلوص اور دیانتداری سے چلایا۔ لیکن حسن انتظام کی یہ تمام خوبیاں بنیادی باطل کو اس کے فطری نتائج سے نہ بچا سکیں۔ غلط بنیادوں کے اثرات بلا رو رعایت نتیجہ خیز ہو کر رہے۔

(صفحہ ۱۵۹)

آگے چل کر یہی مؤرخ لکھتا ہے :-

اگر انسان بادلوں سے اور پھاڑنے لگ جاتے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ انسانیت کی سطح بھی اتنی ہی بلند ہو گئی۔ نہ ہی سو میل فی گھنٹہ کی رفتار کے معنی ترقی ہیں۔ انسان اگر ستاروں کو توڑنے کے قابل ہو جائے اور علوم و فنون کے وسیع پیمانوں میں گھوڑے دوڑانے لگ جائے تب بھی اس کے جوہر ذاتی میں قلبِ باہیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ انسانی معاملات اس سے گہرے ہوتے ہیں..... قوتِ تہذیب کلچر بے معنی چیزیں ہیں اگر ان کے ساتھ اخلاقی برائیاں شامل ہوں۔ وہ صحیح پیمانہ جس سے انسانی دنیا کی قدر و قیمت پائی جا سکتی ہے، اخلاقی پیمانہ ہی ہے۔ (صفحہ ۲۵۹)

اس قسم کے غلط نظام کے آل و انجام کے متعلق وہ کہتا ہے :-

وہ نظامِ تہذیب جس میں حق و صداقت کو عادی طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہو آخر الامر تباہ ہو کر رہتا ہے۔ بانصاف

سے کوئی فرد کیسا ہی کامیاب کیوں نہ ہوتا چلا جائے وہ اجتماعی نظام جس کا وہ جزو ہے اور وہ جماعت جو اس ناانصافی کے ثمرات سے نفع اندوز ہوتی ہے اس ناانصافی کی وجہ سے انجام کار برباد ہو جاتی ہے۔ انتخاب طبعی کے اٹل قانون کی بنا پر گناہ کی اجرت موت ہے۔ (صفحہ ۲۶۲)

یہ تو ایک قدیم تمدن کی تباہی کے اسباب و علل کا تجزیہ تھا۔ تہذیب مغرب جس کی چمک دمک اچھے اچھے دیدہ وروں کی نگاہ میں خیرگی پیدا کر دیتی ہے اس کے انجام و مال کے متعلق خود مغرب کے مفکرین جس بڑی طرح داویلا مچا رہے ہیں اس پر ان کی آئے دن شائع ہونے والی تصانیف و مقالات شاہد ہیں۔ (RENE GUENON) **تہذیب مغرب کا مال** اپنی تصنیف (THE CRISIS OF MODERN WORLD) میں لکھتا ہے۔

عہد حاضر کی تہذیب رفتہ رفتہ تنزل کی طرف گرتی گئی ہے۔ حتیٰ کہ یہ انسان کے پست ترین عناصر کی سطح پر جا کر غرق ہو گئی ہے۔ اس کا نصب العین اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انسانی فطرت کے محض مادی گوشے کے تقاضوں کی تسکین کا سامان فراہم کیا جائے۔ یہ نصب العین خود ایک فریب ہے۔ اس لئے کہ یہ جس قدر انسانی ضروریات کو پورا کر سکتا ہے اس سے زیادہ مصنوعی ضروریات کو پیدا کر دیتا ہے۔ اس عہد کے انسان نے نہ صرف اپنی ذہنی کاوشوں کو مشینوں کی ایجاد اور ساخت کے لئے وقف کر رکھا ہے بلکہ وہ خود رفتہ رفتہ مشین بن چکا ہے۔

یہ ایجادات جن کا شمار دن بدن بڑھتا جا رہا ہے اور بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ اس لئے کہ وہ ان قوتوں کو بڑے کارلاری ہی ہیں جن کی اصل حقیقت کا علم ان انسانوں کو نہیں جو انہیں استعمال کرتے ہیں۔ جو لوگ مادہ کی وحشی قوتوں کو بے لگام چھوڑ دیتے ہیں وہ خود انہی قوتوں کے ہاتھوں تباہ ہو جاتے ہیں۔ دور حاضر میں مادی قوانین کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ مادہ اس انسان کو برباد کرے گا جو خود مادہ سے بلند ہوئے بغیر اس کی تسخیر چاہتا ہے۔ اس لئے بعید نہیں کہ موجودہ دنیا خود ان ایجادات ہی کے ہاتھوں تباہ ہو جائے۔

پروفیسر آن سٹائن، اپنی کتاب (OUT OF MY LATER DAYS) میں لکھتا ہے۔

ہم نے تلخ تجارب کے بعد یہ سیکھا ہے کہ معاشرتی زندگی کی گتھیاں تنہا عقل کی رو سے نہیں سلجھ سکتیں۔ سائنس کی تحقیقات اکثر اوقات نوع انسان کے لئے بڑی ہلک ثابت ہوئی ہیں۔ ان سے انسان کو طبعی زندگی میں آرام و عشرت تو ضرور مل گئے لیکن اس کی داخلی دنیا میں عجیب قسم کا کرب و اضطراب پیدا ہو گیا جس سے وہ اپنے ٹیکنیکل ماحول کا غلام بن کر رہ گیا۔ اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ اسے خود اپنی تباہی کے لئے بڑے بڑے سامان مل گئے۔ اس لئے ہمیں تنہا عقل کو اپنا خدا نہیں بن لینا چاہیے۔ اس خدا کے عضلات تو بہت مضبوط ہیں لیکن اس

کی ذات نہیں ہے۔ عقل، ذرائع و اسباب پر تو خوب نگاہ رکھتی ہے لیکن مقاصد و اقدار کی طرف سے بالکل اندھی ہوتی

یہ تو ہے اس تہذیب کے ہاتھوں معاشرہ کی حالت۔ فرد کی حالت اس سے بھی زبوں تر ہے۔ ڈاکٹر بنگت اپنی عمر بھر کی تحقیقات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ

عصر حاضر کا انسان مفلوج انسان ہے۔ اندھے حوادث کے مقابلہ میں خوف سے ہراساں۔ یعنی ان حوادث کے مقابلہ میں ہراساں جن پر وہ اپنے دور کی سیاسی و معاشی تدابیر کے زور پر قابو نہیں پاسکتا۔ یہ تو ہے اس کی خارجی حالت۔ اور اگر وہ اس خارجی دنیا سے ہٹ کر اپنی داخلی دنیا کی طرف جھانکتا ہے تو وہاں اسے باہر سے بھی زیادہ تاریکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

(MODERN MAN IN SEARCH OF SOUL.)

یہی وہ انسان ہے جس کے متعلق حکیم الامت (اقبال) نے بہت پہلے کہا تھا کہ

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کرنے کا
زندگی کی شب تاریک سحر کرنے کا

”زندگی کی شب تاریک“ میں نور سحر ان مستقل اقدار کے خورشید جہان تاب سے آئینہ پاش ہوتا ہے جو وحی کے ذریعے ملتی ہیں اور جو آج قرآن کی دفتین میں محفوظ ہیں۔ جب تک دین کا نظام ان اقدار کی بنیادوں پر قائم نہیں ہوتا، تاریکیاں چھٹ نہیں سکتیں۔

اس مقام پر یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ وہ کیا چیز ہے جس کے نہ ہونے سے قومیں اس قدر دولت و حشمت، ثروت و عقل و دانش اور علم و بصیرت کے باوجود تباہیوں کے جہنم میں جا گرتی ہیں؟ یہ سوال بڑا اہم ہے۔ لیکن قرآن نے اس کا جو جواب دیا ہے جوں جوں نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے انسان وجد میں آجاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یاد رکھو!

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ
وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (۸/۵۳)

یہ اس لئے ہوتا ہے کہ اللہ نے جو نعمت کسی قوم کو دے رکھی ہو، وہ اس سے کبھی نہیں چھینتا تا وقتیکہ وہ قوم اپنی ذات (نفسیاتی دنیا) میں تہریلی نہ کرے۔ یاد رکھو! اللہ سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

قرآن نے اس چھوٹی سی آیت میں قوموں کے عروج و زوال کا وہ فلسفہ بیان کر دیا ہے جو بڑی بڑی ضخیم مجلدات میں بھی نہیں سما سکتا۔ وہ کہتا ہے کہ خارجی دنیا دراصل انسان کی داخلی دنیا کا عکس

داخلی تبدیلی

ہوتی ہے۔ جب تک اس کی داخلی دنیا میں تبدیلی نہ ہو اس کی خارجی دنیا میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ پھر جس قسم کی تبدیلی اس کی داخلی دنیا میں ہوگی اسی قسم کی تبدیلی اس کی خارجی دنیا میں ہو جائے گی۔ اس کی داخلی دنیا میں تبدیلی اس چیز سے ہوتی ہے جسے قرآن اپنی اصطلاح میں "ایمان" سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی صحیح زاویہ نگاہ۔ راست نصب العین حیات، وحی کی عطا کردہ مستقل اقدار پر یقین محکم۔ اس سے انسان کی داخلی قوتیں ایک نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہیں اور اس سے ایسے میجر العقول نتائج مرتب ہوتے ہیں جن کا تصور بھی ویسے نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وہ "شے" ہے جس کے فقدان کا ردنا رشتے ہوئے برٹریڈرسل لکھتا ہے کہ

ایمان کا فقدان | ہماری موجودہ مشکل یہ ہے کہ ہم نے خارجی قوتوں کو بے حساب انداز سے مسخر کر لیا ہے لیکن ان قوتوں کو قطعاً مسخر نہیں کیا جو خود ہمارے اندر ہیں ضبط نفس

بیشہ معتمدین اخلاق کا سب سے پہلا سبق رہا ہے۔ لیکن زمانہ سابقہ میں اس کا کوئی واضح مفہوم سامنے نہیں ہوتا تھا اس کا مفہوم یہی ہے کہ خارجی قوتوں کو کس طرح صحیح اقدار کے تابع صرف کیا جائے۔

(AUTHORITY AND THE INDIVIDUAL.)

ڈاکٹر ٹینگ (جس کا ذکر ابھی کیا جا چکا ہے) اس باب میں لکھتا ہے:-

میں نے اپنی زندگی کے نصف آخر میں جس قدر مریضوں کا تجربہ نفس کیا ان میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جسے زندگی کے مسائل کے حل کے لئے مذہبی زاویہ نگاہ کی تلاش نہ ہو۔ ان میں سے ہر ایک کی بیماری کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اس "شے" کو ضائع کر دیا تھا جو زندہ مذہب انسان کو مہیا کرتا ہے۔ اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہیں پھر وہی "شے" دے دی جاتی جو ان سے کم ہو چکی تھی۔ یہی ان کی دوا تھی۔ عقیدہ "امیدِ محبت" نگہ خود بین۔ (ص ۲۶۳)

عصر حاضر کے ان محققین و مورخین کی یہ تمام تحقیقات تشریح و توضیح ہیں قرآن کی اس آیت کی جسے ہم نے اوپر درج کیا ہے۔ نیران اللہ لا یغیبر..... بَأَنْفُسِهِمْ (۱۳/۱۱) قرآن آدموں کے عروج و زوال کا راز ان کے تغیر نفس میں بتاتا ہے اور تغیر نفس پیدا ہوتا ہے وحی کی اقدار پر یقین محکم سے۔

اوپر کا طبقہ پہلے بگڑتا ہے | قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ قوموں میں خرابیوں کی ابتداء ان کے اوپر کے طبقے سے شروع ہوتی ہے۔ اور وہاں سے پھیل کر یہ نیچے کے طبقے کو متاثر کرتی ہیں،

وَكَذَلِكَ... رَلَيْمَكَرُفَافِيهَا (۶/۱۲۲) یہ بڑے بڑے مجرمین اس امر کی تدبیریں کرتے رہتے ہیں کہ ان کے قائم کردہ غلط نظام کے بندھن ڈھیلے نہ ہونے پائیں۔ یہ "اکابر مجرمین" وہ ہیں جو دوسروں کی کمائی پر عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں: وَأَسْبَغَ

الَّذِينَ..... مُتَجَرِّمِينَ (۱۱/۱۱۶) یہ لوگ اپنی مفاد پرستیوں اور عیش سامانیوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور اس طرح ظلم استبداد اور غضب و نہب کا چلن عام ہو جاتا ہے۔ یہی لوگ ہیں جو کاروانِ ملت کے قافلہ سالار بنتے ہیں لیکن قافلہ کو تباہیوں کے گھر میں جا کر اتار دیتے ہیں۔ سورۃ ابراہیم میں ہے: اَلَمْ تَرَ... بِئْسَ الْقَرَارُ (۱۲/۲۸-۲۹) ”کیا تو نے ان لوگوں کی حالت پر غور نہیں کیا جو خدا کی دی ہوئی نعمتوں کی ناسپاس گزاری کرتے ہیں اور قوم کے قافلہ کو اس منڈی میں لے جاتے ہیں جہاں اس جنس کا سد کا کوئی خریدار نہیں ہوتا۔ یعنی اسے تباہیوں اور بربادیوں کے جہنم میں جا اتارتے ہیں۔ اور وہ کیسی بُری منزل ہے۔“

لیکن قرآن لیڈروں کو مورد الزام قرار دے کر عوام کو بری الذمہ نہیں ٹھہرا دیتا، وہ انہیں بھی برابر کا مجرم قرار دیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کا منشا یہ نہیں کہ عوام بیٹروں کی طرح سر نیچا کئے چرواہے کی آواز پر چلتے جائیں۔ وہ عوام کی ذمہ داری قرار دیتا ہے کہ وہ کھرے کھوٹے کی پہچان کریں اور صرف اسی راستے پر چلیں جو ان کے نزدیک عافیت اور سلامتی کا راستہ ہو۔ قرآن نے اس حقیقت کو بڑے دلاؤ و زاندازہ میں بیان کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ لیڈر اور ان کے متبعین (FOLLOWERS) دونوں جہنم میں جمع ہوں گے اور ایک دوسرے کو طعن و تشنیع کریں گے۔ عوام لیڈروں سے کہیں گے کہ تم نے ہمیں تباہ کیا۔ اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور صحیح راستے پر چلتے (۳۲/۳۱)۔ لیڈر اس کے جواب میں کہیں گے کہ قصور سارا تمہارا اپنا ہے اور ناحق الزام ہم پر دھرتے ہو۔ صحیح راستہ تمہارے سامنے تھا۔ اگر تم اس پر چلنا چاہتے تو تمہیں کون روک سکتا تھا؟ ہم نے تمہیں کبھی نہیں کہا کہ تم صحیح روئے زندگی چھوڑ کر ہمارے پیچھے لگو۔ مجرم تو خود ہو اور الزام ہمارے سر دھرتے ہو (۳۲/۳۲)۔ اس کے جواب میں عوام کہیں گے کہ یہ ٹھیک ہے کہ تم زبان سے تو ہمیں نہیں کہتے تھے کہ ہم جرائم کے مرتکب ہوں۔ لیکن تم دن رات اس قسم کی سازشوں اور تہذیبوں میں مصروف رہتے تھے جن سے بچ نکلنا سادہ لوح عوام کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس طرح تم بالواسطہ ہمیں مجبور کر دیتے تھے کہ ہم قوانین خداوندی کو چھوڑ کر تمہاری تجویز کردہ راہوں پر چل نکلیں (۳۲/۳۲)۔ دوسری جگہ ہے کہ یہ متبعین خدا سے درخواست کریں گے کہ ہمارے یہ بڑے بڑے لیڈر جنہوں نے اپنے ساتھ ہمیں بھی تباہ کیا ہے انہیں دو چند عذاب دیجئے۔ ایک حصہ ان کے اپنے جرائم کا اور ایک حصہ ان جرائم کا جو انہوں نے ہم سے کر لئے (۳۲/۴۶)۔

ان اور اسی قسم کے دیگر کئی ایک مقامات میں لیڈروں اور عوام کے اسی قسم کے مکالمات کے تمثیلی بیان سے اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ قوموں کی تباہی میں عوام اور اکابر دونوں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ اکابر اس لئے کہ وہ اپنی مفاد پرستیوں کی خاطر عوام کو اپنا آلہ کار بناتے ہیں۔ اور عوام اس لئے کہ وہ ان غلط کار اکابرین کی جوس پرستیوں کی خاطر

آلہ کار بننے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ لیڈروں کی قوت و حقیقت عوام ہی سے ہوتی ہے۔

پھر جس طرح ایک قوم کے مختلف طبقات ایک دوسرے سے متاثر ہو کر، تباہی اور بربادی کی زنجیروں کی مختلف کڑیاں بنتے ہیں، اس طرح ایک قوم، دوسری قوم کی نقالی سے تباہی کے جہنم میں جا گرتی ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے کہ کُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَعْنَتٌ اُخْتَتَهَا (۴/۳۸) جب کبھی ایک قوم جہنم میں داخل ہوگی تو وہ اپنی بہن دوسری قوم پر لعنت کرے گی کہ ہمیں اس نے تباہ کیا۔ یَحْتٰی اِذَا اَدَّاسٌ کُوِّرَ فِيْهَا..... مِنْ النَّارِ (۴/۳۸) یہاں تک کہ جب تمام اقوام تباہی کے جہنم میں اکٹھی ہو جائیں گی تو بعد میں آنے والی قومیں اپنی

تابع اور متبوع قومیں

پیشرو قوموں کے متعلق کہیں گی کہ اے ہمارے پروردگار! انہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا سو انہیں دو گنا عذاب دے: قَالَ رَجُلٌ ضِعْفًا وَّلٰیٰکِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ (۴/۳۸) اس کے جواب میں ان سے کہا جائے گا کہ تم میں سے ہر ایک کے لئے دو گنا عذاب ہے۔ اس لئے کہ اگر پیشرو قومیں اس لئے دو گنے عذاب کی مستحق ہیں کہ انہوں نے دوسروں کو گمراہ کیا تو ان کے پیچھے لگنے والی قومیں اس لئے دوسرے عذاب کی سزا وار ہیں کہ وہ آنکھیں بند کر کے ان کے پیچھے کیوں لگیں؟ (جیسا کہ ہم وحی اور عقل کے عنوان میں دیکھ چکے ہیں) قرآن کے نزدیک اپنی عقل و فکر سے کام نہ لینا اور دوسروں کی اندھی تقلید کئے جانا، ایسی روش ہے جو افراد اور اقوام دونوں کو سیدھا جہنم کے گڑھے میں جا گراتی ہے۔ اس لئے قرآن کی رو سے ہر قوم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی عقل و فکر سے کام لے اور جو راہ قوانین خداوندی نے متعین کی ہے اس پر چلے۔ اس سے وہ شادا بہوں اور سرفرازیوں کی جنت کے راستے پر چل نکلے گی۔ لیکن اگر اس نے اپنی دانش و بینش سے کام لینا چھوڑ دیا تو اس کا یہی جرم اس کی تباہی کے لئے کافی ہو گا۔ قرآن تو اچھی روش پر بھی بلا سوچے سمجھے چلنے کی اجازت نہیں دیتا (۲۵/۲) چہ جائیکہ کسی دوسری قوم کی تقلید محض اس لئے کی جائے کہ اسے دنیا میں زیادہ قوت و اقتدار حاصل ہے (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) عارضی غلبہ و اقتدار اور دولت و ثروت (کچھ عرصہ کے لئے) غلط نظام سے بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کا انجام بہر حال تباہی اور بربادی ہوتا ہے: وَ کَمَا اَهْلٰکْنَا..... نَحْنُ الْوَارِثِیْنَ (۲۸/۵۸) اور کتنی بستیاں ایسی تھیں جنہیں ہم نے سامانِ زیست کی فراوانیوں کے باوجود تباہ و برباد کر دیا (اس لئے کہ ان کا نظامِ معاشرہ غلط بنیادوں پر استوار تھا) یہ دیکھو! ان کے مکانات ہیں جو ان کے بعد بہت کم آباد ہوئے اور ان کے وارث ہم ہی ہوئے: فَهٰی خٰوِیَةٌ..... قَضِیْرٌ مَّشِیْدٌ (۲۲/۲۵) ان کے ریح اٹانے محلات کھنڈرات بن گئے۔ ان کے کنوئیں ویران ہو گئے۔ ان کا نام و نشان مٹ گیا: وَ جَعَلْنٰهُمْ اَحَادِیْثَ (۲۳/۲۴) اور ان کی فقط داستانیں باقی رہ گئیں: قُلْ سِیَّرُوْا فِی الْاَرْضِ... الْمَجْرِمِیْنَ (۲۴/۲۹) ان سے کہو کہ تم مختلف ممالک کی سر کر دو اور ان کے کھنڈرات کی ٹھیکریوں سے یہ پوچھو کہ غلط رو قوموں کا انجام کیا ہوتا ہے؟

اس طرح قرآن اقوام گزشتہ کے احوال و کوائف سامنے لا کر (تاریخی شواہد کے مطالعہ سے) اس حقیقت کی طرف راہنمائی کرتا ہے کہ غلط نظام زندگی کا انجام کیا ہوتا ہے۔ لیکن وہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ ان تاریخی نوشتوں سے وہی قومیں سامانِ عبرت حاصل کر سکتی ہیں جو عقل و فکر سے کام لیتی ہیں۔ سورۃ الحج میں ہے اَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَكَيْفَ يُعَذِّبُهُمْ وَقَدْ آتَوْا الْأَرْضَ بِالْحَقِّ... يَسْمَعُونَ بِهَا (۳۲/۴۶) کیا یہ لوگ زمین پر چلے پھرے نہیں تاکہ ان کے دل ہوتے جن سے وہ سمجھتے یا کان ہوتے جن سے وہ سنتے۔ فَإِنَّهَا لَا تَعْمَىٰ..... فِي الضُّلُومِ (۳۲/۴۶) اس لئے کہ انسان کی (دماغ کی) آنکھیں اندھی نہیں ہوا کرتیں بلکہ وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینے کے اندر ہیں۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے، کسی قوم کے عروج و زوال اور اس کی موت و حیات کا فیصلہ اس نظام کے مطابق ہوتا ہے جسے وہ قوم اپنے لئے اختیار کرتی ہے ایسے نظام کی اساس و بنیاد، اس کے اجراءئے ترکیبی اور ماہ الامتیاز خصوصیات کیا ہیں، جو قوموں کے عروج و بقار کا ضامن بنتا ہے، اس کے متعلق سابقہ ابواب میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن اس ضمن میں قرآن کریم نے جو بنیادی اصول دیا ہے وہ اس قابل ہے کہ اسے دوبارہ سامنے لایا جائے اور وہ اصول یہ ہے کہ

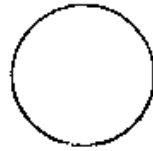
وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَمَا كُنتُمْ فِي الْأَرْضِ (۱۲/۱۷)

وہی نظریہ حیات، وہی اصول زندگی، وہی نظام معاشرہ، دنیا میں باقی رہ سکتا ہے جو تمام نوع انسان کے لئے نفع رساں ہو۔ یعنی ایک تو وہ نفع رساں اور منفعت بخش ہو، اور دوسرے یہ کہ اس کی منفعت بخشی، کسی خاص گروہ، خاص پارٹی، خاص ملک، خاص قوم تک محدود نہ ہو، بلکہ وہ ساری کی ساری انسانیت کے لئے نفع رساں ہو۔

یہ ہے وہ عالمگیر اصول جس کی بنیادوں پر قرآن اپنا نظام زندگی استوار کرتا ہے۔ اور یہی اصول قوموں کی زندگی کا حقیقی ضامن بن سکتا ہے۔

ہم نے پچھلے صفحات میں کہا ہے کہ اگر کوئی قوم فطرت کی قوتوں کو مستحضر کر لے۔ دولت اور قوت میں بڑھی ہوئی ہو۔ دنیا کے ایک بڑے حصے پر اس کی حکومت مستحکم ہو۔ اسے علوم و فنون سے بھی بہرہ وافر ملا ہو۔ دانش و مینش میں بھی کسی سے کم نہ ہو۔ لیکن ان تمام اسباب و عناصر کے باوجود، اگر اس کا نظام غلط بنیادوں پر استوار ہے، تو اسے نہ اطمینان نصیب ہو سکتا ہے اور نہ ہی استحکام۔ جب تک وہ نظام موجود رہتا ہے لوگ مضطرب و ہراساں

رہتے ہیں، اور اس کے ساتھ ہی وہ نظام، اپنی بنیادی خرابیوں کی وجہ سے، خود بخود زوال و انحطاط کی طرف بڑھے چلے جاتا ہے۔ عصرِ حاضر کی تہذیب، قرآن کے اس دعوے کی کس طرح زندہ شہادت ہے۔ اس کا اجمالی ذکر آئندہ باب میں ملے گا۔



باب چہارم

انسان اور خارجی کائنات

افراد ہوں یا اقوام (باخصوص اقوام) ان کی موت اور حیات کے فیصلے کے لئے ایک اہم عنصر یہ بھی ہے کہ خارجی کائنات کے متعلق ان کا زاویہ نگاہ یا ردِ عمل کیا ہے؟ یہ وہ سوال ہے جس نے انسان کو ہمیشہ وقفِ اضطراب رکھا ہے۔ قرآن نے اسے بڑی اہمیت دی ہے اور اس کا صحیح جواب نہایت واضح اور بین الفاظ میں پیش کیا ہے۔

جب انسانی شعور نے پہلے آنکھ کھولی تو اس نے اپنے آپ کو عجیب دنیا میں پایا۔ سر پر آتشباری کرنے والا ایک عظیم اور مہیب گولا، چاروں طرف بڑے بڑے پہاڑ، ادھر ادھر ساحل، نا آشنا سمندر اور اس کی خوفناک تلاطم انگیزیاں، یہاں وہاں کف بردہاں اور سیلاب درآغوش دریاؤں کی خوف سامانیاں، میلوں تک ڈراؤنے جنگل اور ان میں بڑے بڑے خطرناک درندے اور اڑدھے، کبھی بادل کی لرزہ خیز گرج، کبھی بجلی کی جگر پاش کڑک، کبھی وحشت انگیز آندھی، کبھی بلا خیز جھکڑ، کبھی کوہِ آتش فشاں کی مرگ سیاں کی یلغار، کبھی زلزلوں کی تباہ کاریوں کا ہجوم، شش جہات میں اس قسم کی خوفناک بلاؤں کا اژدھام اور ان کے اندر گھرا ہوا بے یار و مددگار اور بے سروسامان ہنتا ابن آدم۔ آپ سوچئے کہ ان حالات میں خارجی کائنات کے متعلق اس کا ردِ عمل اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ جو بلا سامنے آئے، یہ گڑگڑانا شروع کرے، جہاں کوئی

خطرہ آنکھ دکھائے یہ اس کے سامنے سرنگوں ہو جائے۔ اس طرح فطرت کی مختلف قوتیں

انسان کا پہلا ردِ عمل اس کا "اللہ" اور یہ ان قوتوں کا پرستار بن گیا، چاند سورج، ستارے، کڑک، بارش، آندھی، آگ، دریا، سانپ، شیر، حشی کہ وہ بانی امراض سب دیوی دیوتا تصور کر لے اور ان کی بارگاہ میں نذر و نیاز، منت سماجت اور مدح و ستائش سے انہیں خوش کرنے اور راضی رکھنے کی تدابیر اختیار کی جانے لگیں۔ یہ تھا (اُس ماحول میں) انسان کا اولین ردِ عمل خارجی کائنات کے متعلق۔ رفتہ رفتہ اس ردِ عمل نے مذہب کی شکل اختیار کر لی اور آپ جانتے ہیں کہ جب کوئی عقیدہ

یا تصور، مذہب کی شکل اختیار کر لے تو حالات کتنے ہی کیوں نہ بدل جائیں، اس میں تبدیلی نہیں آیا کرتی۔ چنانچہ دنیا کے بیشتر مذاہب، کائنات کے متعلق انسان کے اس اوّلین ردّ عمل کے مظاہر ہیں۔

یہ دنیا تو ہم پرستی کی دنیا تھی۔ دوسری طرف جہان علم و بصیرت کی طرف آئے تو وہاں (بد قسمتی سے) انسانیت ایک اور حادثے سے دوچار ہوئی جس نے اسے تو ہم پرستی کی جہالت سے بھی زیادہ نقصان پہنچایا۔ جہاں تک تاریخی نوشتے ہماری راہ نمائی کرتے ہیں، علم و حکمت کا اوّلین گہوارہ خطہ یونان تصور کیا جاتا ہے۔ اور سقراط کو وہاں کے حکماء کا ابوالآب بار قرار دیا جاتا ہے۔ سقراط کا نظریہ یہ تھا کہ مطالعہ کے قابل صرف انسان کی ذات ہے۔ خارجی کائنات نہیں۔ افلاطون جو سقراط کا شاگرد

لیکن خود ایک الگ مکتب فکر کا امام ہے، اس سے بھی دو قدم آگے بڑھا۔ اس نے کہا کہ یہ دنیا ہے **افلاطونی نظریہ** (WORLD OF IDEAS) محسوسات (خارجی کائنات) درحقیقت اپنا کوئی وجود نہیں رکھتی۔ حقیقی دنیا، عالم امثال کی ہے جو کہیں آنسوئے افلاک واقع ہے۔ اور یہ مرئی کائنات اس کا عکس ہے۔ اس نظریہ

سے جو منطقی نتیجہ مرتب ہو سکتا تھا وہ ظاہر ہے۔ یعنی جب یہ عالم محسوسات درحقیقت اپنا وجود نہیں رکھتا بلکہ محض فریب اور سراب ہے (بلکہ عالم خواب) تو اس کے متعلق جو علم انسانی حواس (SENSES) کے ذریعے حاصل ہو گا وہ بھی کچھ حقیقت نہیں رکھے گا۔ حقیقی علم وہی ہو گا جو انسان کو — چشم بند و گوش بند و لب بہ بند کے بعد — اپنی دنیا میں جذب ہو جانے سے حاصل ہو۔ یہی علم قابل اعتماد اور یقینی ہو گا۔ محسوسات کا علم (PERCEPTUAL KNOWLEDGE) قطعاً قابل اعتماد نہیں ہو گا۔

یہ تھا کائنات اور علم محسوسات کے متعلق افلاطون کا وہ نظریہ جس پر یونانی تصوف کی عمارت استوار ہوئی۔ یہ تصوف وہاں سے نکل کر ساری دنیا کو متاثر کر گیا۔ اس نے ہندوستان میں پہنچ کر ویدانت کی شکل اختیار کی چنانچہ اس فلسفہ کی رُح سے پراکرتی (مادی دنیا) بایا (فریب) ہے۔ کائنات: برہما (خدا) کا خواب ہے۔ جس دن اس کی آنکھ کھل گئی یہ خواب معدوم ہو جائے گا۔ یہ عظیم کارگر کہ کائنات ایشور کی سیلا (نائلک کھیل) ہے جس میں کوئی شے اپنے حقیقی رنگ میں سامنے نہیں آتی بلکہ حقیقت کی تمثیل ہوتی ہے۔ یہی فلسفہ ہے جو ایرانی معجزوں کے ہاتھوں "شراب معرفت" بن کر جھلکا اور عیسائیت کی خانقاہوں تک کو کیف آلود کر گیا۔ اسی فلسفہ کا نتیجہ تھا کہ کائنات کو باطل قرار دے دیا گیا اور دنیا ایک قابل نفرت شے تصور کر لی گئی جس سے دور بھاگنے میں ہی انسانی نجات کا راز پوشیدہ سمجھا گیا۔

یہ تھا کائنات کے متعلق ذہن انسانی کا ردّ عمل اس زمانے میں جب قرآن نازل ہوا۔ یعنی دنیائے مذاہب کا سنائی

قوتوں کو معبود بنا کر ان کے سامنے سجدہ ریز تھی اور جہانِ فکر اور عالمِ تصوف کائنات کو باطل قرار دے کر اس سے نفرت میں روحانی ترقی کا راز پارہا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن سے پہلے بعض قرآن ایسے ملتے ہیں جن میں کائنات کی صحیح پوزیشن بھی سامنے آجاتی ہے۔ یہ وحی پر مبنی تعلیم کا اثر تھا جو مختلف انبیائے کرام کی وساطت سے وقتاً فوقتاً آتی رہی۔ لیکن چونکہ نزول قرآن کے وقت وحی کی تعلیم اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں کہیں موجود نہ تھی۔ اس لئے فکر انسان کی عمومی حالت وہی تھی جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

قرآن آیا اور اس نے سب سے پہلے مذہب کی دنیا کو للکارا۔ اس نے پہلے ہی پارہ میں انسان اور کائنات کے باہمی تعلق کو قصہ آدم کے تمثیلی انداز میں بیان کیا۔ واضح رہے کہ قصہ آدم کسی فرد (بابا آدم) کی داستان نہیں، آدم خود آدمی ہے اور اس کا قصہ آدمی کی اپنی کہانی۔ اس نے کہا کہ آدمی کا مقام یہ ہے فطرت کی تمام قوتیں (جنہیں قرآن ملائکہ کہہ کر پکارتا ہے) کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا

قرآن کا تصور

لِأَدَمَ فَسَجَدُوا (۲/۲۴) اس ایک (القلاب انگیز) اعلان سے قرآن نے مسجود کو ساجد اور ساجد کو مسجود بنا دیا۔ اس نے انسان سے کہا کہ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَاللَّيْلَ وَالنَّهَارَ (۱۴/۳۲) خدا نے چاند اور سورج کو تمہارے تابع تسخیر کر دیا کہ وہ تمہاری خدمت میں مدام مصروفِ خرام رہیں، وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ (۱۴/۳۲) اس نے دن اور رات کو بھی تمہارے لئے تابع فرمان بنا دیا، وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ (۱۴/۳۲) اس نے دریاؤں (اور سمندروں) کو بھی تمہارے لئے مسخر کر دیا۔ المختصر یہ کہ وَسَخَّرَ لَكُمُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِمَّا خَلَقْنَا (۲۵/۱۳) کائنات کی بلندیوں اور پستیوں میں جو کچھ ہے اسے تمہارے لئے تابع تسخیر کر دیا۔ یہ سب خدا کے مقرر کردہ قوانین کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں تمہارا کام یہ ہے کہ تم ان قوانین فطرت کا علم حاصل کرو اور اس کے ذریعے ان تمام قوتوں کو اپنے کام میں لاؤ۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن نے کس طرح، مقامِ آدم کو بے نقاب کر کے، کائنات اور خود انسانی دنیا کا نقشہ بدل دیا! اس کی اس حقیقت کشا تعلیم سے ذہن انسانی کے تراشیدہ، دیوی دیوتا، جن، بھوت، پریت سب اس کے حضور خدمت کے لئے دست بستہ کھڑے ہو گئے اور پتھروں کے آگے ماتھا گڑنے والا انسان کس طرح آسمان کی بجلیوں تک کا مخدوم و مسجود بن گیا! دوسری طرف قرآن نے دنیائے تصوف کو للکارا اور ایک غلغلہ انگیز نعرہ سے طلسم افلاطون کی دھجیاں فضائے بیط میں بچیر کر رکھ دیں۔ اس نے کہا کہ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا "کائنات کی بلندیوں اور پستیوں کو اور جو کچھ ان کے

طلسم افلاطون کی شکست

نے تفسیر ان امور کی میری کتاب "ابلیس و آدم" میں ملے گی۔

درمیان ہے ہم نے باطل پیدا نہیں کیا: ذَلِكْ ظَنُّ الَّذِينَ كَفَرُوا..... (۲۸/۲۷) یہ ان لوگوں کا وہم اور قیاس ہے جو حقیقت کا انکار کرتے ہیں: فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مِنَ النَّارِ (۳۸/۲۷) اور جو حقیقتِ ثابتہ کا انکار کر کے کائنات کو باطل بتاتے ہیں ان کی سعی و عمل راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ جاتی ہے اور آخر الامر ان کے حصے میں ندامت و پشیمانی اور تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن نے کائنات کے متعلق غلط زاویہ نگاہ کو کفر (اور اس کے برعکس صحیح زاویہ نگاہ کو ایمان) قرار دے کر اس سوال کو کتنی اہمیت کا حامل بتایا ہے! جو شخص کائنات کو باطل قرار دے وہ قرآن کی رو سے مومن نہیں، کافر ہے۔ خدائے کائنات کو باطل پیدا نہیں کیا: خَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ. اس نے کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے۔ اس کا وجود فریب اور دھوکا نہیں۔ یہ فی الحقیقت موجود ہے اور ایک مقصد کے لئے پیدا کی گئی ہے، اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ هُوَ مُبِينٌ (۲۹/۲۲) ”اس میں ایمان والوں کے لئے بڑی نشانی ہے“

کائنات کو ایشور کی لیل قرار دینے والوں سے اس نے کہا کہ ذَمَّا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَعِبْنِيْنَ (۲۲/۳۸) ”ہم نے کائنات کی بلندیوں اور پستیوں کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، یونہی کھیلنے ہوئے پیدا نہیں کیا“ ذَمَّا خَلَقْتَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۲۲/۳۹) ہم نے انہیں بالحق پیدا کیا ہے۔ یہ خیال کہ کائنات یونہی بطور کھیل تماشاکے پیدا کر دی گئی ہے ان لوگوں کا وہم ہے جو علم و حقیقت سے بے خبر ہیں۔

کائنات کے متعلق زاویہ نگاہ میں اس قدر تحیر انگیز انقلاب پیدا کرنے کے بعد ضروری تھا کہ علم بالحواس (SENSE PERCEPTION) کے متعلق انسانی نقطہ نظر میں تبدیلی پیدا کی جائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اس نے کہا کہ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ (۱۷/۳۶) جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ یا اور کھو۔ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْتَهُ مَسْئُوْلًا (۱۷/۳۶) ”تمہارے سمع، بصر اور فؤاد سب سے یہ پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے اس بات کے صحیح ہونے کی شہادت دی تھی جسے صحیح سمجھا گیا تھا؟ یہ آیت بڑی غور طلب ہے۔ اس میں علم سے کہا گیا ہے جس کی شہادت سمع و بصر اور فؤاد دیں۔ سمع و بصر انسانی حواس (SENSE) ہیں جن کا کام یہ ہے کہ وہ خارجی کائنات کے متعلق معلومات فراہم کر کے فؤاد (MIND) تک پہنچادیں۔

اور پھر فؤاد (MIND) ان سے استنباط کرے۔ علم کی اس تعریف (DEFINITION) میں علم بالحواس (PERCEPTUAL KNOWLEDGE) اور فکری و تصویری علم (CONCEPTUAL KNOWLEDGE) دونوں آجاتے ہیں۔ قرآن کے نزدیک ”سمع و بصر و قلب“ کی اہمیت کس قدر ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس نے صاف الفاظ میں

کہہ دیا کہ جو لوگ اس سے کام نہیں لیتے وہ انسانی سطح پر نہیں، حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں اور جہنمی ہیں۔ سورہ اعراف میں

سَمِعَ وَبَصَرَ كَمَا تَلْمِزُونَ الْجَاهِلِينَ هُمْ يَرْجِئُونَ ۝ (۷۱/۹۱) اِنْسِ شَهْرِي اور صحرائی آبادیوں میں اکثریت

ان لوگوں کی ہے جو اس قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں جو انہیں سیدھی جہنم کی طرف لے جاتی ہے۔ یعنی لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَ لَهُمْ اُذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا۔ ان کی حالت یہ ہے کہ وہ سینے میں دل رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان رکھتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ اُولَئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔ یہ انسان نہیں حیوان ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔ اُولَئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ۝ (۷۱/۹۱) اس لئے کہ یہ لوگ حقائق کائنات سے بے خبر رہتے ہیں۔

ان کے برعکس وہ ایک اور گروہ کا ذکر کرتا ہے جن کے متعلق کہتا ہے کہ اِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَاٰخِرَاتِ الْاَيِّمٰنِ وَ النُّجُوْمِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ اَلْبٰبِ (۳/۱۹۰) یقیناً کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کی تخلیق اور رات دن کی گردش میں صاحبان عقل و شعور کے لئے (بڑی بڑی) نشانیاں ہیں، ان ارباب دانش و دانش کے لئے جن کی حالت یہ ہے کہ

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ رِقٰمًا وَّ قَعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ (۳/۱۹۱) جو اٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے ہر وقت قانون خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔

کائنات میں غور و فکر کر نیوالے

وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَاٰخِرَاتِ الْاَيِّمٰنِ اور تخلیق ارض و سما میں انتہائی غور و فکر کرتے ہیں اور اپنے مسلسل تجربات اور پیہم مشاہدات کے بعد علی وجہ البصیرت اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مَا بَدَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (۳/۱۹۱) اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس عظیم سلسلہ کائنات کو باطل پیدا نہیں کیا۔ سُبْحٰنَكَ یہ تجھ سے بہت بعید تھا کہ تیرا تخلیقی پروگرام بلا مقصد ہوتا۔ تیرے متعلق ایسا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ محض ہماری کوتاہ علمی اور ریسرچ (تحقیق) کی کمی ہے جو ہم کائنات کی بہت سی چیزوں کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر رہتے ہیں۔ اور اس لئے ان کی زہر پاشیوں سے بھلتے اور تڑپتے رہتے ہیں۔ ہماری آرزو یہ ہے کہ تو ہمیں ایسی توفیق عطا فرما کہ ہم عدم علم کی بناء پر اشیائے کائنات کے تخریبی پہلو سے محفوظ رہیں۔ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۳/۱۹۱) اس لئے کہ جو قومیں اشیائے فطرت کے متعلق تحقیق نہیں کرتیں اور اس لئے ان کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر رہتی ہیں وہ دنیا میں ذلت و رسوائی کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ مَا بَدَا اِنَّكَ مَن تَدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْرَجْتَهُ

(۳/۱۹۲) اور ایسی قوموں کا دنیا میں کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا۔ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِن اَنْصٰرٍ (۳/۱۹۲)

اس مقام پر ان لوگوں کو جو اشیائے کائنات سے متعلق تحقیق و تدقیق کے بعد رموز فطرت کی عقدہ کشائی کرتے ہیں،

قرآن نے صاحبانِ عقل و بصیرت کہا ہے۔ دوسرے مقام پر انہیں ”مومنین“ سے یہی مومن و متقی ہیں تعبیر کیا ہے۔ جہاں کہا ہے کہ إِنَّ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّلْمُؤْمِنِينَ

(۲۵/۳) یقیناً کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں مومنین کے لئے نشانیاں ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خدا اور اس کے قوانین کے متعلق حتمی یقین رکھتے ہیں۔ وَ فِي خَلْقِكُمْ ذَمًا يَبُتُّ مِنْ دَابَّةٍ آيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ (۲۵/۴) اور تمہاری پیدائش میں اور دیگر جانداروں کی افزائش نسل میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو کائنات کے بالحق ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ صاحبانِ عقل و بصیرت ہیں: وَ اخْتَلَفَ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ ذَمًّا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مَنًى ذَرِيْقًا فَأَخْيَرَ بِهِ الْآرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ تَصْوِيفِ الرِّيحِ آيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (۲۵/۵) اور دن رات کی گردش میں اور بارش میں جسے خدا بادلوں سے برساتا ہے اور اس سے زمین مردہ کو حیات تازہ عطا کرتا ہے۔ اور ہواؤں کے رُخ کی تبدیلی میں اربابِ عقل و فکر کے لئے نشانیاں ہیں۔

کائنات پر غور و فکر کی اس قدر تاکید کے بعد کہا گیا کہ تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ تَشَاوَرَهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ۔ یہ وہ اشد کی آیتیں ہیں جنہیں خدا حق کے ساتھ تیرے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہ لوگ جو اس کے بعد بھی حق پر ایمان نہیں لاتے ان سے پوچھو کہ فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعَدَ اللَّهُ وَ آيَاتِهِ يُؤْمِنُونَ (۲۵/۶) یہ لوگ اللہ اور اس کی اس قسم کی آیات کے بعد اور کس چیز پر ایمان لائیں گے؟ آپ نے غور کیا کہ قرآن نے اس مقام پر کتنی عظیم حقیقت بیان کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا پر ایمان لانے

انہی سے ایمان حاصل ہوتا ہے

کے دو گوشے ہیں۔ ایک ایشائے فطرت پر غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچنا کہ کائنات کے نظام کو ایک علیم و خبیر مستی اپنے محکم اٹل اور تعمیری قوانین کی رُو سے چلا رہی ہے۔ دوسرے قرآنی تعلیم میں تدبیر و تفکر جس نے اس زمانے میں انسان کے لئے تسخیر کائنات کا اعلان کیا، جب ساری دنیا، یا تو کائناتی قوتوں کو معبود بنائے ہوئے تھی اور یا اسے فریبِ فطر اور قابلِ نظر سمجھ کر اس سے دُور بھاگتی تھی۔ ایسے ماحول میں اس قسم کی انقلاب آفریں آواز بلند کرنا کسی انسانی ذہن کا کام نہیں۔ اس ”آواز“ کا سرچشمہ یقیناً وہی خدائے علیم و بصیر ہو سکتا ہے جو انسان اور کائنات دونوں کے صحیح مقامات سے باخبر ہو۔ لہذا اگر کوئی شخص مطالعہ فطرت اور قرآن میں غور و تدبیر کے بعد بھی خدا پر ایمان نہیں لاتا تو پھر کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہتی جس سے وہ خدا پر ایمان لاسکے۔

ایمان، وہ تصویر حیات ہے جو انسانی زندگی کا نصب العین قرار پاتا ہے۔ اس کے بعد تقویٰ آتا ہے۔ تقویٰ کے متعلق یوں سمجھئے کہ یہ وہ مسلک اور منہاج ہے جس کے مطابق مومن اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ مومنین کے لئے خارجی کائنات کے

شواہد و مظاہر پر غور و فکر کس قدر ضروری ہے اس کے متعلق ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، دوسری جگہ قرآن کہتا ہے کہ یہ غور و فکر متقیوں کے لئے بھی ویسا ہی ضروری ہے۔ سورۃ یونس میں ہے: **رَانَ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لِيُظْهِرَ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ** (۱۰/۶) یقیناً اختلافِ لیل و نہار اور جو کچھ اللہ نے آسمانوں اور زمینوں میں پیدا کیا ہے ان میں تقویٰ شعار قوم کے لئے نشانیاں ہیں۔

ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ قرآن نے "سَمَوَاتٍ وَالْأَرْضِ" پر غور و فکر کرنے کی تاکید کی ہے، سَمَوَاتٍ (اجرامِ فلکی) پر غور و فکر کا ایک شعبہ تو وہ ہے جسے علم الافلاک (ASTRONOMY) کہتے ہیں۔ لیکن قرآن اس سے بھی آگے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زمین میں ہی نہیں بلکہ اجرامِ فلکی میں بھی ذی حیات مخلوق ہے اور اس کے متعلق غور و فکر کرنا بھی ضروری ہے۔ سورۃ شوریٰ میں ہے: **وَمِنْ آيَاتِهِ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ فِي سَاعٍ وَمَا يَشْعُرُ بِهِمَا مِنْ أَتَاتٍ** (۲۲/۲۹) اور اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے ارض اور سموات کو پیدا کیا اور ان دونوں (یعنی ارض اور سموات) میں ذی حیات مخلوق کو کھپلا دیا۔ غور فرمائیے کہ آسمانی کتوں میں زندہ مخلوق کی نشاندہی بھی سب سے پہلے قرآن ہی نے کرانی ہے۔

آسمانوں میں ذی حیات مخلوق

قرآن کی رُو سے علم کی تعریف (DEFINITION) کیا ہے یہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ یعنی علم وہ ہے جس کی شہادت انسان کے حواس دیں اور اس کی تائید اس کا قلب (MIND) کرے۔ اب یہ دیکھتے کہ قرآن کے نزدیک عالم کون ہے؟ قرآن میں "علماء" کا لفظ دو جگہ آیا ہے۔ ایک جگہ سورۃ شعراء میں **أَدَلُّكُمْ يَكُنْ لَهُمْ آيَةٌ**

عالم کی تعریف

جگہ سورۃ فاطر میں جہاں "خدا کے بندوں میں سے علماء کا ذکر ہے۔ اس تذکرہ کی ابتداء یوں ہوتی ہے: **الَّذِينَ آمَنُوا أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهَا** (۲۵/۴۷) کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ اللہ کا قانون کس طرح بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور اس سے انواع و اقسام کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ **وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بَيْضٌ وَحُمْرٌ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ** (۲۵/۴۷) اور پہاڑوں میں کس کس انداز کے سرخ و سفید طبقات ہیں جن کے رنگ اور اقسام مختلف ہیں اور ان میں بعض گہرے سیاہ رنگ کے ہیں۔ **وَمِنَ النَّاسِ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَلِكَ** (۲۵/۴۸) اور اس طرح انسانوں اور دیگر جانداروں اور مویشیوں کے بھی مختلف اقسام ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ ان آیات میں کون کون سے امور کا ذکر ہو رہا ہے؟ کائنات کے مختلف گوشوں کا۔ بساطِ فطرت کے متنوع شعبوں کا۔ سائنس کے مختلف علوم کا جن میں طبیعیات (PHYSICS) نباتیات (BOTANY) حیوانیات

(ZOOLOGY) طبقات الارض (GEOLOGY) فضائیات (METEOROLOGY) اور عالم انسانیت کے تمام

شعبے آجاتے ہیں۔ ان علوم و فنون کے تذکرہ کے بعد فرمایا: اِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ اِحقیقت یہ ہے کہ اس کے بندوں سے علماء ہی وہ ہیں جن کے دل پر اس کی عظمت و ہیبت چھا جاتی ہے۔ (اِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ غَفُوْرٌ ۲۸/۳۵) کیونکہ وہ علی وجہ البصیرت اس حقیقت کا مشاہدہ کر لیتے ہیں کہ خدا کتنی بڑی قوتوں کا مالک ہے اور کس طرح اس عظیم کارگاہ کائنات کو ہر قسم کی تخریب سے محفوظ رکھ کر اس کی منزل مقصود کی طرف لئے جا رہا ہے۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن نے علماء کا لفظ کن لوگوں کے لئے استعمال کیا ہے۔ ان لوگوں کے لئے جنہیں دورِ حاضر کی اصطلاح میں سائنٹسٹ اور کائناتی مفکر کہا جاتا ہے۔ قرآن نے یہ بھی کہا ہے کہ جس طرح خدا کی عظمت و ہیبت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو کائناتی مظاہر پر غور و فکر کریں۔ اسی طرح قرآن کے حقیقت ثابتہ ہونے کا یقین بھی وہی لوگ کر سکتے ہیں جو خارجی کائنات اور دنیاۓ انسانیت میں غور و فکر کریں۔ اس کا ارشاد ہے:

نَفْسٌ وَّ اَفَاقٍ مِّمَّیٰ اٰیٰتٍ سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاَفَاقِ وَ فِیْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَلْبِثُوْنَ لَهَاۤ اِنَّهٗ الْحَقُّ

(۴۱/۵۳) ہم انہیں اپنی نشانیاں عالمِ آفاق اور عالمِ نفس میں دکھائیں گے تا آنکہ یہ بات ابھر کر ان کے سامنے آجائے کہ قرآن فی الواقعہ ایک حقیقت ثابتہ ہے۔ یعنی جوں جوں کا کل زمانہ کے بیچ و خم میں پلٹے ہوئے حقائق مشاطگی علم و تحقیق سے کھلتے جائیں گے قرآن کے دعاوی کے ثبوت ایک ایک کر کے سامنے آتے جائیں گے۔ یہ اس لئے کہ اَوَّلَمَّا یَلْفِ بِرَبِّکَ اِنَّهٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ (۴۱/۵۳) قرآن اس خدا کی کتاب ہے جس کی نگاہوں سے کوئی راز مستور نہیں۔ اس کے سامنے کائنات کی ہر شے بے نقاب رکھی ہے اور یہ چیز اس امر کی کافی دلیل ہے کہ حقائق کائنات کے متعلق جو کچھ خدا کے گا وہی یقینی طور پر درست ہوگا: اَنْزَلَهُ الَّذِیْ یَعْلَمُ الْغُوْیَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۲۵/۶۱) قرآن کو اس خدا نے نازل کیا ہے جو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کے اسرار و رموز سے واقف ہے۔ لہذا جو لوگ نفس و آفاق کی ان نشانیوں پر غور و فکر کریں گے انہیں ان میں تجلیاتِ خداوندی بے نقاب نظر آجائیں گی جو قوتیں ان آیاتِ اللہ سے آنکھیں بند کر کے گزر جاتی ہیں یوں سمجھ لو کہ انہیں خدا کو اس طرح بے نقاب دیکھ لینے پر یقین نہیں ہوتا: اَلَا اِنَّهٗمْ فِیْ مِرٰیۃٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ (۴۱/۵۳)۔ حالانکہ انہیں اس کے لئے کہیں دُور جانے کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ جس شے کی بھی اس طرح ریسرچ شروع کر دیں اس میں خدا کا قانونِ ربوبیت جھلمل جھلمل کرنا نظر آجائے گا۔ اس لئے کہ اَلَا اِنَّهٗ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ (۴۱/۵۳) خدا کا قانون ہر شے کو محیط ہے۔ وہ کسی ایک شے کے ساتھ مختص نہیں۔

ہم نے شروع میں دیکھا ہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ کائنات میں مومنین اور متقین کے لئے ہر جگہ آیات اللہ ہیں۔ اس سے یہ

صرف تسخیر فطرت ایمان نہیں

نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ ایمان اور تقویٰ کے معنی اشیائے کائنات پر غور و فکر اور تحقیق و تدقیق ہے اور جو قومیں تسخیر فطرت کرتی ہیں وہ مومن اور متقی ہوتی ہیں۔

مومن اور متقی وہ ہیں جو تسخیر فطرت کے بعد فطرت کی قوتوں کو قوانین خداوندی (قرآن کریم) کے مطابق (نوع انسان کی ربوبیت علم) کے لئے صرف کرتے ہیں اور اس طرح اپنی ذات کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ مومن ہونے کے لئے یہ دونوں شرطیں ضروری ہیں۔ یعنی تسخیر فطرت اور اتباع قوانین خداوندی جو قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔ اگر کسی قوم میں ان دو شرطوں میں سے ایک کی بھی کمی

ہے تو وہ مومن اور متقی نہیں کہلا سکتی: وَمَنْ لَّمْ يَخُفْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكٰفِرُونَ (۵۱/۲۲) جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ کافر ہیں: جو قومیں تسخیر فطرت تو کر لیتی ہیں

لیکن امور زندگی کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق نہیں کرتیں وہ بھی کافر ہیں۔ انہیں فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لینے کی وجہ سے طبعی دنیا کے مفاد حاصل ہو جاتے ہیں لیکن چونکہ وہ ان قوتوں کو قوانین خداوندی کے مطابق صرف نہیں کرتیں اس لئے آخر الامر وہ بھی تباہ و برباد ہو جاتی ہیں جس طرح وہ جو سرے سے تسخیر فطرت ہی نہیں کرتیں یہی وہ قومیں جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے: اَعْمٰی اَعْمٰی عَنَهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا اَبْصَارُهُمْ وَلَا اَفْئِدَةٌ لَهُمْ مِنْ شَيْءٍ ؕ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ (۲۶/۲۶) ان کے سمع و بصر اور فؤاد ان کے کسی کام نہ آئے کیونکہ وہ قوانین خداوندی سے انکار کرتے تھے وہ تباہ و برباد ہو گئے۔ لہذا قرآن کی رو سے صورت حالات یوں ہوتی کہ

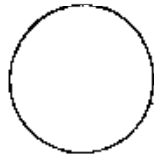
(۱) جو قومیں سمع و بصر و فؤاد سے کام لے کر تسخیر فطرت کرتی ہیں اور پھر فطرت کی قوتوں کو قوانین خداوندی (قرآن) کے مطابق صرف کرتی ہیں وہ مومن و متقی ہیں۔ ان کی اس دنیا کی زندگی بھی درخشندہ

داتا بنناک ہوتی ہے اور آخرت کی زندگی بھی خوشگوار و شاداب۔

(۲) جو قومیں تسخیر فطرت تو کرتی ہیں لیکن قرآن کی مستقل اقدار کا اتباع نہیں کرتیں وہ صرف مقام آدمیت تک پہنچتی ہیں، مومن اور متقی کے مقام تک نہیں پہنچتیں۔ وہ اس دنیا کی زندگی میں قوت و شوکت حاصل کر لیتی ہیں لیکن مستقبل ان کا تاریک ہوتا ہے۔ اس دنیا میں مستقبل بھی اور آخرت کی زندگی میں بھی۔

(۳) اور جو قومیں سرے سے تسخیر فطرت کرتی ہی نہیں وہ مومن و متقی ہونا تو کجا مقام آدمیت تک بھی نہیں پہنچ سکتیں۔ اُولَٰئِكَ مَا دَاٰهُمْ اَلْتَّٰمُ (۱۰/۸) ان کے لئے اس دنیا میں بھی ذلت و خواری ہے اور آخرت میں بھی تباہی و بربادی۔ اس لئے کہ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِہٖ اَعْمٰی فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی (۱۴/۲۲) جو یہاں کاندھا ہے

وہ وہاں کا بھی اندھا ہے۔
 وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے
 وہ قوم نہیں لائے ہنگامہ فردا
 جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے



مُستقل اقدار

(PERMANENT VALUES)

سابقہ ابواب میں یہ حقیقت سامنے آچکی ہے کہ دین کی عمارت، مستقل اقدار کے گرد گھومتی ہے۔ یا یوں کہئے کہ دین وہ مستقل اقدار دیتا ہے جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے یہ زندگی بھی جنت کی زندگی بن جاتی ہے اور آخرت کی زندگی بھی سرفرازیوں اور کامرائیوں کی ضامن۔ زیر نظر باب میں ان اقدار کا اجمالی سا تعارف کرایا جاتا ہے۔ اجمالی سا اس لئے کہ ان کی تفصیل کے لئے پورے کا پورا قرآن سامنے لانا ہوگا۔

مستقل اقدار میں بلند ترین قدر خود انسانی ذات ہے اس لئے سلسلہ کلام کا آغاز اسی کے تعارف سے کیا جاتا ہے۔

جیسا کہ پہلے باب میں بتایا جا چکا ہے، قرآن انسانی ذات کو "نفس" کہہ کر پکارتا ہے اور اسے الوہیٰ تُوَانائی (DIVINE ENERGY) قرار دیتا ہے۔ اگرچہ اس سلسلہ میں (پہلے اور دوسرے باب

میں) تفصیل سے لکھا جا چکا ہے لیکن غیر از محل نہ ہوگا اگر ہم اس میں سے کچھ اشارات کو یہاں دہرا دیں تاکہ اس تکرار سے بات زیادہ واضح اور دل نشین ہو جائے۔ جب قرآن تخلیق انسانی کے مختلف مراحل کا ذکر کرنے کے بعد (جس کا تعلق اس کی جسمانی اور طبعی ساخت سے ہے اور جو دیگر حیوانات میں بھی مشترک ہیں) کہتا ہے کہ "وَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ تُوَانِيهِ" (۳۲/۹) "خدا نے اس میں اپنی تُوَانائی پھونک دی" تو اس سے مراد یہی انسانی ذات ہے جس سے سلسلہ ارتقاء کی یہ کڑی (انسان) اپنی سابقہ کڑیوں (حیوانی زندگی سے یکسر جدید) الگ اور متمیز ہو جاتی ہے۔ "ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ" (۳۲/۱۴) "پھر ہم نے اسے بالکل دوسری مخلوق بنا دیا" سے اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ انسانی زندگی سے مقصود نفس انسانی کا نشو و ارتقاء (DEVELOPMENT) ہے جس کا طریقہ دین سکھاتا ہے: "قَدْ أَفْلَحَ مَنْ نَزَّلْنَا كَهَاةً وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا" (۹۱/۱۰-۹) "جس نے اس کی نشوونما کی وہ پھولا پھولا، جس نے اسے دبا دیا وہ تباہ و برباد ہو گیا" انسان کے ہر عمل (کام) کا اثر انسانی ذات پر ہوتا ہے۔ اعمالِ حسنہ (یا خیر)

وہ ہیں جن سے اس (ذات) میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔ اور اعمالِ سیئہ (شر) وہ ہیں جن سے اس میں ضعف و اضمحلال واقع ہو جاتا ہے۔ استحکامِ خودی سے انسان حیاتِ جاوید حاصل کر سکتا ہے۔ لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ (۵۴/۵۴) ”اس (جنت کی زندگی) میں وہ سوائے پہلی موت کے جو جسم پر وارد ہوتی ہے، موت سے دوچار نہیں ہوں گے۔“

”الوہیاتی توانائی“ کی اصطلاح ذرا وضاحت طلب ہے۔ کائنات میں ہر جگہ توانائی کا ظہور ہوتا ہے لیکن یہ توانائی مادی اسباب و علل یا طبعی قوانین کی رُو سے نمود میں آتی ہے۔ اسے مادی توانائی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جانداروں کے جسم میں بھی اس توانائی کی نمود ہوتی ہے۔ حسی کہ انسان کے جسم میں۔ لیکن انسان کی صورت میں، ایک اور توانائی بھی ہے جو اس کے اختیارِ ارادہ کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ توانائی مادی توانائی سے کہیں زیادہ قوی ہے کیونکہ مادی توانائی اس کے تابع کام کرتی ہے۔ اس توانائی کو مادی توانائی سے متمیز کرنے کے لئے خدا نے اسے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ اور ”رُوحَنَا“ کہہ کر پکارا ہے۔ اسی کو انسانی ذات کہتے ہیں۔ اس کے لئے ہم نے ”الوہیاتی توانائی“ کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ واضح رہے کہ انسانی ذاتِ خداوندی کا جبر و نہیں۔ یہ توانائی خدا کی عطا کردہ ہے۔ اسے مادی توانائی سے متمیز کرنے کے لئے الوہیاتی توانائی کہا جاتا ہے۔ (ورنہ یوں تو مادی توانائی بھی خدا ہی کی عطا کردہ ہے اور اسی کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ظہور میں آتی ہے)۔ انسانی ذاتِ بلند ترین مستقل قدر ہے۔ باقی اقدار اس کی نشوونما کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اور جب اس میں پختگی پیدا ہو جاتی ہے تو یہی اقدار سورج کی کرنوں کی طرح اس میں سے خود بخود بھوٹتی اور ابھرتی چلی آتی ہیں۔

واضح رہے کہ اس سے یہ مراد نہیں کہ انسانی جسم کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ قرآن کی رُو سے انسانی جسم (یعنی انسان کی طبعی زندگی اور اس کے ساز و سامان) اپنی اقدار رکھتے ہیں۔ جن کا تحفظ ضروری ہے لیکن یہ اقدار مستقل نہیں، اضافی ہیں جب طبعی زندگی اور انسانی ذات کے مفادات میں تصادم ہو جائے تو انسانی ذات کے مفاد کے تحفظ کے لئے طبعی زندگی اور اس کے مفاد کو قربان کر دینا چاہیے۔ تفصیل ان اشارات کی آگے چل کر آئے گی۔

سو پہلی اور بنیادی قدر ہے، انسانی ذات۔

۲۔ احترامِ آدمیت | چونکہ انسانی ذات ہر انسانی بچہ کو یکساں طور پر ملتی ہے۔ اس لئے ہر انسان محض انسان ہونے کی حیثیت سے واجب الاحترام قرار پا جاتا ہے۔ ”وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ“ (۱۷/۷۰)

”یہ حقیقت ہے کہ ہم نے تمام فرزندِ آدم کو واجب الشکریم بنایا ہے۔ لہذا احترامِ آدمیت ایک مستقل قدر ہے جسے کسی مفاد اور مقصد کی خاطر کسی حالت میں بھی قربان نہیں کیا جاسکتا۔ اس سے ذاتِ پات، حسبِ نسب اور رنگ و نسل کے تمام امتیازات بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ قرآن تمام نوعِ انسان کو مخاطب کر کے کہتا ہے خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ (۲۱/۲۱) ”ہم نے

تم سب کو نفس واحدہ (ایک LIFE-CELL) سے پیدا کیا ہے۔ نیز پیدائش کے اعتبار سے مرد اور عورت کو بھی ایک دوسرے پر کوئی تفوق نہیں۔ چنانچہ مذکورہ صدر آیت کا اگلا حصہ یہ ہے کہ وَخَلَقْنَا مِنْهَا نَرًا وَجَهًا وَبَنَاتٍ مِنْهَا رَجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً (۴/۱) "اس نے اس خلیہ زندگی (LIFE CELL) کو دو حصوں میں تقسیم کر کے لے جوڑا بنا دیا۔ (یعنی OYUAL) مادہ خلیہ اور (SPERMATAZOOON) نر کا خلیہ) اور ان سے مردوں اور عورتوں کی کثیر تعداد دنیا میں پھیلا دی۔" البتہ بعض خصوصیات مردوں میں ایسی رکھ دی گئی ہیں جو عورتوں میں نہیں۔ اور بعض خصوصیات عورتوں میں ایسی ہیں جو مردوں میں نہیں۔ اور اس طرح ایک جنس کو دوسری جنس پر (مردوں کو عورتوں پر اور عورتوں کو مردوں پر) فیضیت دے دی گئی ہے (۴/۲۲)۔ تفصیل ان امور کی آئندہ باب میں ملے گی۔

لہذا دوسری مستقل قدر "احترام آدمیت" ہے۔

۳۔ مدارج بہ اعتبارِ عمل | پیدائش کے اعتبار سے تمام انسان یکساں طور پر واجب الاحترام ہیں لیکن اس کے آگے احترام کے مدارج ان کے اعمال (کاموں) کے مطابق متعین ہوں گے۔

وَإِن كَلَّ دَرَجَاتٍ مِّمَّا عَمِلُوا (۳۶/۱۹) "ہر ایک کے مدارج ان کے اعمال (کاموں) کے مطابق مرتب ہوں گے جو سب سے زیادہ قوانین خداوندی کی نگہداشت کرے گا وہ سب سے زیادہ واجب التکریم ہوگا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا
إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ (۲۹/۱۳)

اے نوع انسانی ہم نے تمہیں نر اور مادہ (کے خلیہ) سے پیدا کیا اور تمہیں قبیلوں اور خاندانوں میں تقسیم کر دیا تم نے اپنے لئے قبائل اور خاندان بنائے) مقصد اس سے صرف یہ ہے کہ تم پہچانے جا سکو (ورنہ جہاں تک عزت و تکریم کا تعلق ہے اس اصول کو یاد رکھو کہ) تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ اس کے قوانین کی نگہداشت اور اپنے فرائض کی پابندی کرتا ہے۔

تیسری مستقل قدر یہ ہے کہ عزت و تکریم کا معیار انسان کے جوہر ذاتی میں نہ کہ اضافی نسبتیں۔

۴۔ عدل | تمام انسانوں کو پیدائش کے اعتبار سے یکساں سمجھنا۔ ہر ایک کے لئے اس کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے یکساں مواقع مہیا کرنا اور سعی و عمل کے لحاظ سے ان کے مقامات و مدارج متعین کرنا۔ محنت کے

اپنی مرضی کے تابع چلائے۔ اور نہ ہی مذہب کی دنیا میں (اور تو اور) کسی نبی تک کو اس کا اختیار ہے کہ وہ لوگوں کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنائے۔ ہر فرد کی آزادی اور اس آزادی کا احترام ایک بنیادی اور مستقل قدر ہے جسے کسی عالم میں بھی پامال نہیں کیا جاسکتا۔

۱۔ قانون کی اطاعت

لیکن یہ ظاہر ہے کہ کوئی معاشرہ اور کوئی نظام قائم نہیں ہو سکتا اور نہ باقی رہ سکتا ہے جب تک افراد پر کچھ پابندیاں عائد نہ کی جائیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ پابندیاں قانون کی رو سے عائد ہوں گی۔ اور اس قانون کی اصولی حدود و حج کی رو سے (خدا کی طرف سے) متعین ہوں گی۔ چنانچہ سورہ آل عمران کی جس آیت (۳/۷۸) کا پہلا کلمہ اوپر دیا گیا ہے یعنی "مَا كَانَ لِشَيْءٍ مِنْ دُونِ اللَّهِ" اس کا باقی حصہ یہ ہے، "وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكُتُبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تُذَرِّسُونَ" (۲/۱۲۹) پوری آیت کا ترجمہ یوں ہوگا کہ "کسی انسان کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ خدا سے ضابطہ قوانین، حکومت اور نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا سے میرے محکوم اور غلام بن جاؤ، اسے یہی کہنا چاہیے کہ تم سب ربانی (خدا کے نظام ربوبیت کے علمبردار) بن جاؤ، اس ضابطہ قوانین کی رو سے (جو تمہیں خدا کی طرف سے ملا ہے) جس کی تم ایک دوسرے کو تعلیم دیتے ہو اور اسے اپنے دلوں پر منقوش کرتے رہتے ہو۔"

اس سے دو باتیں واضح ہیں، ایک یہ کہ کسی انسان کو خواہ اسے جزیئی قوانین وضع کرنے یا قانون نافذ کرنے کے اختیارات بھی کیوں نہ سونپ دیئے جائیں یا اسے خدا کی طرف سے نبوت بھی کیوں نہ مل جائے۔ اس کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان سے اپنی مرضی منوائے۔ وہ صرف قانون کی اطاعت کر لے گا۔ اور دوسرے یہ کہ اس قانون کے اصول و مبنی بھی انسانوں کے خود وضع کردہ نہیں ہوں گے، خدا کی طرف سے متعین شدہ ہوں گے۔ لہذا اطاعت درحقیقت قوانین خداوندی کی ہوگی، نہ کہ انسانوں کے خود ساختہ ضوابط کی۔ "اتَّبِعُوا مَا نَزَّلَ إِلَيْكُمْ مِنْ تَرَاتُكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْيَاءَ" (۱۳/۴) "جو کچھ تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے اس کا اتباع کرو۔ اس کے سوا اور کسی سرپرست کا اتباع نہ کرو۔"

اس قانون کا اطلاق ہر فرد معاشرہ پر یکساں طور پر ہوگا اور کوئی بڑی سے بڑی ہستی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہوگی۔ حتیٰ کہ رسول جس کی وساطت سے قوانین خداوندی دوسرے انسانوں کو ملتے ہیں وہ بھی اسی حقیقت کبریٰ کا اعلان کرتا ہے کہ "إِن تَتَّبِعُوا إِلَّا مَا يَنْزِلُ إِلَيْكُمْ" (۲۶/۹) "میں اس کے سوا جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے اور کسی چیز کا اتباع نہیں کرتا۔" اور

اس طرح "أَنَا أَوْلُ الْمُسْلِمِينَ" (۶/۱۶۳) میں ان میں سب سے پہلے میرے ہوں جو قوانین خداوندی کے سامنے جھکتے ہیں۔ یعنی رسول سب سے پہلے خود اس قانون کی اطاعت کرتا ہے اور پھر دوسروں سے اسی کی اطاعت کرتا ہے۔ یوں کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محکوم اور غلام نہیں ہوتا۔ متنازعہ فیہ امور کے فیصلے کتاب خداوندی کی رو سے ہوتے ہیں جس کا اطلاق سب افراد پر یکساں ہوتا ہے۔ وَمَنْ لَّمْ يَخُفْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ۝ (۵/۴۳) جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتا۔ جو حکومت خدا کی کتاب کے مطابق قائم نہیں ہوتی۔ تو یہی لوگ کافر ہیں۔

قانون خداوندی کی اطاعت کرنا اور کرانا مستقل قدر ہے۔

۱۱۔ ہر کام کا نتیجہ | قانون کی اطاعت کے معنی یہ ہیں کہ کسی شخص کا کوئی عمل (کام) بلا نتیجہ نہ رہنے پائے۔ اچھے کام کا اچھا نتیجہ مرتب ہو کر سامنے آجائے اور بُرے کام کی سزا مل جائے۔ "اچھے کام سے مراد ہے قانون خداوندی کے مطابق عمل کرنا اور بُرے کام کے معنی ہیں اس قانون کی خلاف ورزی کرنا۔ معاشرہ اس مقصد کے لئے پولیس اور عدالت کا انتظام کرتا ہے لیکن جس خدا نے مستقل اقدار کو متعین کیا ہے اس کا انتظام یہ ہے کہ کسی کا کوئی کام خواہ وہ پولیس کی نظروں سے اوجھل کیوں نہ رہ جائے، کسی حالت میں بھی اپنا صحیح نتیجہ مرتب کئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ کائنات کی یہ عظیم القدر اور حیرت انگیز مشینری اس مقصد کے لئے سرگرم عمل ہے۔ کہ ہر عمل اپنا صحیح نتیجہ مرتب کرتا ہے: وَخَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُحْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝ (۲۲/۲۵) اللہ نے ارض و سما کے سلسلے کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس مقصد کے لئے پیدا کیا ہے کہ ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ مل جائے اور اس میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ ہو" اس کا نام خدا کا "قانونِ مکافاتِ عمل" ہے جس کی گرفت سے (محسوس اعمال تو ایک طرف) دل کی لغزشیں اور نگاہ کی خیانتیں بھی نہیں بچ سکتیں۔ يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ ۝ (۱۹/۴۰) "وہ نگاہ کی خیانت اور دل کے رازوں تک کو جانتا ہے" اس لئے فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝ (۹۹/۷-۸) "جو شخص ایک ذرہ برابر بھی قانون کے مطابق کام کرتا ہے اس کا خوشگوار نتیجہ اس کے سامنے آجاتا ہے اور جو ذرہ برابر قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ اس کے عواقب سے دوچار ہوتا ہے۔ اس باب میں اور تو اور خود رسول کی بھی استثناء نہیں ہوتی۔ سورۃ یونس میں رسول اللہ سے کہا گیا کہ تم اعلان کر دو کہ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا مَا يُوقَعُ إِلَيَّ. میں تو صرف اس کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔ إِنْ يَخَافُ أَنْ عَصَيْتُمْ مَا جِئْتُ بِكُمْ بِهِ يَوْمَ الْعَظِيمِ ۝ (۱۰/۱۵) اگر میں اس (وحی) کی خلاف ورزی کروں تو مجھے بھی خدا کا عذاب پکڑے گا اور میں اس کی گرفت

سے بہت ڈرتا ہوں۔ خدا کے قانون مکافات کی گرفت بڑی سخت ہے۔ اِنَّ نَفْسًا لَّسَانًا لَّسَانًا (۸۵/۱۲) اس قانون کی رو سے کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کسی کی محنت رائیگاں چلی جائے۔ اِنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلًا عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکْرِ اَوْ اُنْثٰی (۲/۱۹۵) میں تم میں سے کسی کام کرنے والے کے کام کو ضائع نہیں کرتا، وہ عورت ہو یا مرد۔ وَلَا یُظْلَمُوْنَ نَفِیْنًا (۲/۱۲۴) ”کسی کے اجر میں ذرا کمی نہیں کی جاتی“ نہ ہی ایسا ہوتا ہے کہ کسی کو یونہی بلا سنی و عمل کچھ بخش دیا جائے: لَیْسَ لِیْلِ نَسَانٍ اِلَّا مَا سَعٰی (۵۳/۲۹) کسی انسان کو بجز اس کی سعی و عمل کے کچھ نہیں ملتا۔

لہذا ہر عمل کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب کرنا مستقل قدر ہے۔

۱۲۔ انسانی نظام عدل | یہ عدل (ہر عمل کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب ہونا) تو خدا کے کائناتی نظام کے مطابق کارفرما ہوتا ہے۔ جہاں تک انسانوں کے وضع کردہ عدالتی نظام کا تعلق ہے اس کے لئے الگ مستقل اقدار دیئے گئے ہیں۔ مثلاً

(i) حق کو جانتے بوجھتے کبھی نہ چھپایا جائے: وَلَا تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲/۴۲)

(ii) نہ ہی حق اور باطل میں التباس (CONFUSION) پیدا کیا جائے: وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ (۲/۴۲)

(iii) شہادت کو کبھی نہ چھپایا جائے: وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ (۲/۲۸۳)

(iv) کسی قسم کے لالچ یا ذاتی منفعت یا کسی کی رورعایت یا بغض و عداوت کے خیال کے بغیر محض حق کی خاطر سچی

شہادت دی جائے:-

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ سُهٰدًاۤ اَعْلٰی اللّٰهِ وَ لَوْ عَلٰی اَنْفُسِكُمْ اَوْ اَوْلَادِكُمْ

وَالْاَقْرَبِيْنَ اِنْ يَكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاَللّٰهُ اَوْلٰی بِهِنَّ فَاَلَا تَتَّبِعُوْنَ الْهٰوٰی اَنْ تَعْدُوْا

وَ اِنْ سَلُوْا اَوْ لَعْرَضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمًا تَعْمَلُوْنَ خَيْرًا (۲/۱۳۵)

”اے مستقل اقدار پر یقین رکھنے والو! تم ہمیشہ عدل کے علمبردار بن کر رہو۔ شہادت صرف اللہ کے لئے (نہ کہ مدعی یا مدعا علیہ کے لئے) دو۔ خواہ وہ خود تمہارے اپنے خلاف کیوں نہ جائے۔ یا تمہارے ماں باپ یا دیگر اعزہ و اقربا کے خلاف۔ خواہ وہ امیر ہو یا غریب (ان میں سے کسی کی رعایت نہ کرو اس لئے کہ) اللہ کا حق ان کے مقابلے میں بہر حال فائق ہے۔ دیکھنا! کبھی ایسا نہ ہو کہ تمہارے ذاتی جذبات اور رجحانات انصاف کے راستے میں حائل ہو جائیں۔ اگر تم نے شہادت توڑنے روڑتے یا اس سے پہلو تہی کی کوشش کی تو سمجھ رکھنا چاہیے کہ خدا کا قانون مکافات تمہارے ہر کام سے باخبر ہے۔ (تم اس کی عدالت کو دھوکا نہیں دے سکتے، نہ ہی اس سے بچ کر کہیں جاسکتے ہو)۔“

(۷) نہ ہی مجرموں کی طرف سے وکالت کی جا سکتی ہے، وَلَا تَكُنْ لِلْخَائِبِينَ خَصِيمًا (۳۱/۵) ”تو خیانت کریموالوں کے (CAUSE) کو (PLEAD) کرنے والوں میں سے مت ہو“ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَلُونَ أَنفُسَهُمْ (۲/۱۰۷) ”جو لوگ اپنی ذات یا اپنے لوگوں کے خلاف بددیا تھی برتیں ان کی طرف سے وکالت مت کر“

نہ ہی مجرمین کا پشت پناہ بنا جا سکتا ہے۔ حضرت موسیٰ نے خدائے تعالیٰ سے کہا: فَلَنْ أَكُونَ ظَهِيرًا لِّلْمُجْرِمِينَ (۲۸/۱۷) ”میں کبھی مجرمین کا پشت پناہ نہیں بنوں گا“ لہذا دنیا میں نظامِ عدل قائم کرنا اور اس کے قیام و بقا میں پوری پوری مدد دینا مستقل اقدار ہیں۔

۱۳۔ قانون کے مطابق چلانا | معاشرہ میں ہر شخص کا اور خود قرآنی معاشرہ کا فریضہ ہے کہ وہ ہر ایک کو قانون خداوندی کے مطابق چلنے کا حکم دے اور قانون کی خلاف ورزی سے روکے: كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳/۱۱۰) ”تم ایک بہترین قوم ہو جسے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے باہر لایا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم سب کو قانونِ خداوندی کے مطابق چلنے کا حکم دو اور قانون کی خلاف ورزی سے روکو“

لہذا، ایسا معاشرہ قائم کرنا ایک مستقل قدر ہے۔

۱۴۔ لاقانونیت نہ پھیلانی جائے | لاقانونیت پھیلانا یا قانونِ خداوندی سے سرکشی برتنا جسے قرآن کی اصطلاح میں فساد کہتے ہیں، بہت بڑا جرم ہے۔ سورہ بقرہ میں ہے: وَإِذَا تَوَلَّى سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا (۲/۲۰۵) ”تم ایسے شخص کو بھی دیکھو گے کہ جب وہ صاحبِ اقتدار ہو گا تو ملک میں لاقانونیت پھیلا دے گا۔ وہ پہلے خود آئین و قانون کو پس پشت ڈال کر آمرِ مطلق DICTATOR بن کر لوگوں کو اپنی مرضی کے ڈنڈے سے ہانکے گا اور اس کی دیکھا دیکھی باقی لوگ بھی قانون سے سرکشی برتنا شروع کر دیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ لوگوں کے دل سے قانون کا احترام اٹھ جائے گا۔ ایسے لوگوں کے لئے سخت ترین سزائیں تجویز کی گئی ہیں۔ (۵/۳۳)

دنیا میں صحیح نظامِ حکومت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ مستقل اقدار کو معاشرہ میں نافذ اور رائج کرے۔ لیکن مستقل اقدار

۱۵. مشاورتی نظام حکومت

بالعموم بنیادی اصول (FUNDAMENTAL PRINCIPLES) یا حدود

(BOUNDARY LINE) کی شکل میں ہوتی ہیں۔ ان اصولوں کی عملی

جزئیات ہر زمانے کے لحاظ سے نظام معاشرہ کو خود متعین کرنی ہوتی ہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ کام بھی کسی ایک فرد کے سپرد نہ کیا جائے بلکہ نمائندگان ملت کے باہمی مشورے سے سرانجام پائے: **وَ اَمْرُهُمْ شُورًا بَيْنَهُمْ** (۳۲/۳۸)۔ اس معاشرہ کے امور باہمی مشورہ سے طے پائیں گے۔ حتیٰ کہ خود رسول کو بھی اس سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا گیا۔ اس سے بھی کہہ دیا گیا کہ **شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ** (۳/۱۵۹)۔ معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرو۔ لہذا نظام مملکت میں باہمی مشاورت بھی ایک مستقل قدر ہے لیکن یہ مشاورت مغرب کا جمہوری نظام نہیں جس میں ۵۱ ووٹ والوں کا ہر فیصلہ ۴۹ ووٹ والوں کے لئے واجب التسلیم ہو جاتا ہے۔ یہ مشاورت مستقل اقدار کی حدود کے اندر رہتے ہوئے جزئی معاملات طے کرنے کے لئے ہوگی۔

∴

۱۶. امور مملکت نااہلوں کے سپرد نہ کئے جائیں

صحیح معاشرہ میں ارباب حل و عقد درحقیقت متاع ملت کے امین ہوتے ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے

کہ یہ امانت صرف انہی کے سپرد کی جلتے جو اس کی حفاظت کے اہل ہوں۔ اسے نااہلوں کی تحویل میں نہ دیا جائے۔ **اِنَّ اِلٰهَ يٰۤاْمُرُكُمْ اَنْ تَقُوْذُوْا اِلَیْ اٰهْلِهَا ؕ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ** (۴/۵۸)۔ اللہ تمہیں اس امر کا تاکید ہی حکم دیتا ہے کہ تم امانات کو ان کے سپرد کرو جو ان کے اہل ہوں۔ اور جب لوگوں میں فیصلہ کرو تو ہمیشہ عدل کی رو سے فیصلہ کرو۔

یہ بھی ایک مستقل قدر ہے۔

∴

۱۷. رزق کی ذمہ داری معاشرہ پر ہے

معاشرہ یا نظام مملکت کے قیام کے بنیادی مقاصد میں سے یہ بھی ہے کہ تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی کا ہمتا

کرنا اس کے ذمے ہو۔ یعنی یہ معاشرہ کی ذمہ داری ہے کہ ہر فرد کو اس کی بنیادی ضروریات زندگی بہم پہنچتی رہیں: **وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَیْ اللّٰهِ بِرِزْقِهَا** (۱۱/۶)۔ زمین میں کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔ قرآن کا کہنا یہ ہے کہ جو مملکت قوانین خداوندی کے نفاذ کے لئے وجود میں آتی ہے وہ ان تمام ذمہ داریوں کو اپنے اوپر لے لیتی ہے۔ جنہیں خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ یہ مملکت تمام افراد کو اس امر کی ضمانت دیتی ہے کہ **لَنْ يَخْرُجُ**

فَتَزِرُ وَفُقُكُمُ وَإِنَّا هُمُ ﴿۶۱/۵۱﴾ ”ہم تمہارے اور تمہاری اولاد کے رزق کے ذمہ دار ہیں“ رزق میں جسمانی پرورش اور انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کے سامان و ذرائع سب آجاتے ہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں اس کے لئے ”زکوٰۃ“ کا جامع لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس کے لفظی معنی ”نشوونما“ ہیں۔ ایسے زکوٰۃ یعنی ”تمام نوع انسان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانا“ قرآنی معاشرہ کا اولین فریضہ ہے، اَلَّذِينَ اِنْ مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوْا الزَّكٰوةَ ﴿۲۲/۴۱﴾ ”یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ نظامِ صلوة قائم کریں گے اور نوع انسان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچائیں گے۔“

لہذا، تمام افراد کے رزق کی ذمہ داری، نظامِ معاشرہ کے لئے ایک مستقل قدر ہے جسے کسی حالت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

جو نظام اتنی بڑی ذمہ داری اپنے اوپر لے یہ ضروری ہے کہ ذرائع رزق اس کی تحویل اور نگہداشت میں رہیں۔ اس لئے قرآن نے ذرائع رزق (SOURCES OF PRODUCTION) **۱۸. ذرائع رزق**

کے متعلق واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ انہیں تمام انسانوں کے فائدے کے لئے پیدا کیا گیا ہے، هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَدِيدًا ﴿۲۱/۲۹﴾ ”خدا وہ ہے جس نے وہ سب کا سب جو زمین میں ہے تم سب کے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے“ یعنی اس لئے پیدا کیا ہے کہ تم سب اس سے مستمتع ہو۔ اس لئے ہیں کہ چند افراد یا کوئی مخصوص گروہ ان پر قابض ہو کر بیٹھ جائے۔ دوسری جگہ ہے: وَ لَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْاَرْضِ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ ﴿۴۱/۱۰﴾ ”یہ حقیقت ہے کہ ہم نے تمہیں زمین میں متمکن کیا ہے اور اس میں تم سب کے لئے سامانِ معاش رکھائے“ اس سامان کو سَوَآءٌ لِّلنَّسَاءِ ﴿۳۱/۱۰﴾ تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیے۔ یعنی یہ سامان زیست لوگوں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ لہذا اس کا انتظام ایسا ہونا چاہیے کہ کوئی فرد رزق سے محروم نہ ہونے پائے۔ لہذا، وسائل رزق کا تمام نوع انسان کے لئے کھلا رہنا بھی ایک مستقل قدر ہے۔

۱۹. زائد از ضرورت

نہ صرف یہ کہ ذرائع رزق اور وسائل پیداوار کو ذاتی ملکیت نہیں بنایا جاسکتا بلکہ یہ بھی کہ جو کچھ کسی کے پاس، اس کی جائز ضروریات سے زائد ہو اسے بھی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے کھلا رکھا جائے تاکہ معاشرہ سے اس مقصد کے لئے حسب ضرورت صرف میں لاسکے: يَسْئَلُوْا فَلَئَا مَا ذَا يُنْفِقُوْنَ مِمَّا قَبْلُ الْعَفْوُ ﴿۲۱/۱۹﴾ ”تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی کمائی میں سے کس قدر دوسروں کی فلاح و بہبود کے لئے

کھلا رکھیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زائد ہو، سب کا سب، لہذا یہ بھی ایک مستقل قدر ہے۔
ان مستقل اقدار پر یقین رکھنے والوں کی کیفیت یہ ہوگی کہ وہ زائد از ضرورت مال و اسبابِ زیست کو دوسروں کی پرورش کے لئے کھلا رکھیں گے اور ان سے کسی معاوضہ کے خواہاں نہیں ہوں گے۔ حتیٰ کہ شکر یہ تک کے بھی نہیں۔ وہ ان سے کہہ دیں گے کہ اِنَّمَا نَطْعِمُكُمْ لَوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكْرًا (۶/۹) ”ہم تمہارے لئے جو سامانِ رزق مہیا کرتے ہیں تو اس سے ہمارا کوئی ذاتی مفاد وابستہ نہیں۔ ہم خالصتہً لوجہ اللہ ایسا کرتے ہیں۔ ہم تم سے نہ کسی معاوضہ کے متمنی ہیں نہ شکر یہ تک کے خواہاں“

۲۰۔ رِجَالٌ بِبَيِّنَاتٍ | ہم ایسا اس لئے کرتے ہیں کہ دوسروں کی پرورش (ریلو بیت) ایک مستقل قدر ہے جس پر ہمارا ایمان ہے۔ اور اس سے خود ہماری ذات (PERSONALITY) مستحکم (STRENGTHEN) ہو جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے: تَلْبِيتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (۲/۲۵۵) ”(الفاق) سے ان کا اثباتِ نفس ہو جاتا ہے۔“

۲۱۔ حِفَاظَتِ عَصْمَتِ | قرآن کی رو سے عصمت کی حفاظت بھی ایک مستقل قدر ہے۔ عصمت کی حفاظت سے مراد یہ ہے کہ مرد اور عورت کا جنسی تعلق صرف نکاح (MARRIAGE) کے معروف طریقہ کی رو سے ہو۔ اس طریقہ کے علاوہ جنسی تعلق کو زنا کہا گیا ہے جس کے قریب تک جانے سے روکا گیا ہے، وَلَا تَقْرَبُوا الْمَرْثِيَّ اِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا (۱۷/۳۲) ”اور زنا کے قریب بھی نہ جاؤ۔ یہ بے حیائی کا کام ہے اور نہایت بُرا راستہ“ جو اس فعل کا مرتکب ہو اسے سزا دی جائے گی (۲۴/۲۱)۔ نکاح بالغ عورت اور بالغ مرد کی باہمی رضامندی سے معاہدہ کا نام ہے۔ عورتوں کی رضامندی کے بغیر زبردستی ان کا مالک بن جانا نکاح نہیں کہلا سکتا، لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرْتَابُوا النِّسَاءَ كَسْرًا (۴/۱۹) ”یہ تمہارے لئے حلال نہیں (حرام ہے) کہ تم عورتوں کے زبردستی مالک بن جاؤ“ نکاح سے مقصود محض جنسی جذبہ کی تسکین نہیں۔ اس سے مطلوب، باہمی مودت اور محبت کے تعلقات استوار کرنا ہیں۔ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً..... (۳۰/۲۱) ”اُس نے تمہارے لئے خود تمہاری جنس سے جوڑے بنائے تاکہ تم اس سے سکون حاصل کر سکو۔ اور اس نے تم میں محبت اور رحمت کے جذبات پیدا کر دیئے“ اگر میاں بیوی میں یہ کیفیت باقی نہ رہے تو وہ معاہدہ نکاح کو فسخ کر سکتے ہیں (اسے طلاق کہا جاتا ہے)۔

جس شخص کے لئے نکاح کی صورت پیدا نہ ہو سکے وہ ضبطِ نفس سے کام لے اور اپنی عصمت کی حفاظت کرے وَلَا يَسْتَعْجِفِ الْذَّيْنُ لَا يَهْدُونَ نِكَاحًا حَتَّىٰ يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ (۲۴/۳۲)۔ جنسی بے راہ روی سے افراد کی صلاحیتوں میں اضمحلال

واقع ہو جاتا ہے۔ وَلَا يَزْنُونَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ يَلْقَ أَثَامًا ﴿۲۵﴾ اگر کوئی قوم اپنے ہاں زنا کو عام کر دے تو کچھ عرصہ کے بعد (جو محققین کی رائے میں تین پشتوں کا وقفہ ہے۔ یعنی تقریباً سو سال کا عرصہ ہے) اس میں قومی زوال اور انحطاط شروع ہو جاتا ہے۔

لہذا، حفاظتِ عصمت بھی ایک مستقل قدر ہے جس کا دامن کسی حالت میں بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا جاسکتا۔ شروع میں کہا جا چکا ہے کہ تمام انسانوں کی پیدائش "نفس واحدہ" سے ہوتی ہے (۲/۱) اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل (ORIGION) کے اعتبار سے تمام انسان ایک ہی برادری کے افراد اور ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں۔ لہذا تمام نوع انسان کا ایک

۲۲۔ نوع انسانی امت واحدہ ہے

عالمگیر برادری اور ایک قوم کی حیثیت سے رہنا مقصودِ حیات ہے۔ وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا..... (۱۰/۱۹) "نوع انسان امت واحدہ (ایک قوم) تھی۔ اس کے بعد انہوں نے باہمی اختلافات شروع کر دیئے۔" قوموں اور گروہوں میں بٹے ہوئے انسانوں کو ایک امت (عالمگیر برادری) بنانے کا طریق یہ ہے کہ ان سب کے لئے ایک ضابطہ قوانین ہو (جسے آجکل (ONE WORLD GOVERNMENT) کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے) قرآن نے اپنے آپ کو تمام عالم انسانیت کے لئے مشترکہ ضابطہ قوانین کی حیثیت سے پیش کیا ہے اِنَّا يٰهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَبِّكُمْ..... (۱۰/۵۷) "اے نوع انسانی یقیناً ہمارے نشوونما دینے والے کی طرف سے تمہارے پاس ایک ضابطہ قوانین آ گیا ہے۔"

لہذا، تمام نوع انسانی کا ایک ضابطہ حیات کے مطابق ایک امت بن کر رہنا بھی مستقل قدر ہے۔

∴

۲۳۔ انسانیت کے لئے نفع بخش | فلاح و بہبود کے کاموں کو پارٹیوں، گروہوں، ملکوں اور قوموں کے دائروں میں محدود کر دینا مستقل اقدار کے بنیادی تصور کے خلاف ہے۔

قرآن کی رو سے بقائے دوام صرف اسی عمل کو حاصل ہے جو تمام عالم انسانیت کی نفع بخشی کے لئے کیا جائے۔ اس کا واضح ارشاد ہے کہ وَمَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَكُفُّ رِى الْاٰتِزِىٰنِ ﴿۱۳۸﴾ "زمین میں استمرار اور دوام صرف اسی کو حاصل ہوگا جو تمام نوع انسانی کے لئے نفع بخش ہو۔"

اس کے لئے وہ پہلا قدم یہ تجویز کرتا ہے کہ تمام انسان (بلا تیز رنگ و نسل اور بلا تفریق قوم و ملک) تمام ایسے امور میں باہمی تعاون سے کام لیں جو انسانیت کے لئے کشاد اور مستقل اقدار کی نگہداشت میں ممد و معاون ہوں۔ اور ایسے کاموں

تعاون میں کبھی ایک دوسرے کی مدد نہ کریں جو انسانیت کے لئے ضعف و اضمحلال اور قانون سے سرکشی کا موجب بنیں: وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (۵/۲) لیکن جس

طرح ایسے انسانوں میں جو قانون کا احترام کریں اور ان میں جو اس سے سرکشی برتیں، ایک تین فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح ۲۴۔ معیار تفریق

قرآن تمام انسانوں کی تفریق و تقسیم اس معیار کی رُو سے کرتا ہے کہ جو انسان خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کا اقرار کریں اور ان کا احترام اپنا نصب العین حیات بنا لیں وہ ایک قوم کے افراد ہیں اور جو ان سے انکار کر کے اپنے خود ساختہ مسلک کے مطابق چلنا چاہیں وہ دوسری قوم کے افراد۔ اول الذکر کو ”مؤمن“ کہا جاتا ہے (یعنی ماننے والے) ثانی الذکر کو ”کافر“ (انکار کرنے والے) انسانوں کی بس یہی تقسیم ہے جو مستقل اقدار کے معیار کے مطابق عمل میں آتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور معیار تفریق و تقسیم نہیں۔ اسی کو دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں آئیڈیالوجی IDEOLOGY کہتے ہیں۔ لہذا قرآن کی رُو سے قومیت کا معیار آئیڈیالوجی ہے۔ رنگ، نسل، خون، زبان و وطن، کا اختلاف انسانوں میں وجہ تفریق نہیں بن سکتا۔ تقسیم کا یہ معیار بجائے خویش ایک مستقل قدر ہے۔ چنانچہ سورۃ تغابن میں ہے۔ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فِيمَنْ كُفْرًا وَّ فِيمَنْ كُفْرًا مِّنْهُ مَوْمِنٌ (۹۲/۲) ”اللہ وہ ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا۔ سو تم میں بعض کافر ہو گئے اور بعض مؤمن“۔

۲۵۔ لَا إِلَهَ إِلَّا فِي الدِّينِ | مستقل اقدار کو کسی سے زبردستی نہیں منوایا جاسکتا۔ ماننا یا انکار کرنا انسان کے دل کے فیصلے کا نام ہے۔ جو فیصلہ، رضا و رغبت نہ ہو اسے اس شخص کا فیصلہ

کہا ہی نہیں جاسکتا۔ فیصلہ وہی ہے جو اپنی مرضی سے کیا جائے گا۔ اس لئے دین (مستقل اقدار کے ضابطہ) کے معاملہ میں زبردستی نہیں کی جاسکتی: لَا إِلَهَ إِلَّا فِي الدِّينِ قَدْ بُيِّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (۲/۲۵۶) ”دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں سیدی راہ اور غلط راہ (وحی کی رُو سے) واضح ہو چکی ہے۔ اس لئے جو نسی راہ کسی کا جی چاہے اختیار کرے۔ قُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَ مَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ“ (۱۸/۲۹) ”ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے آگیا اب جس کا جی چاہے اسے قبول کرے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کرے“ جو حق کو اختیار کرے گا اس کے خوشگوار نتائج سے متمتع ہوگا۔ جو انکار کر کے دوسری روش اختیار کرے گا اس کے تباہ کن عواقب اس کے سامنے آئیں گے۔ ان انکار کرنے والوں (کافرین) کے خلاف محض اس بنا پر کہ انہوں نے اس روش سے انکار کیوں کیا ہے (یعنی اسلام کو چھوڑ کر دوسرا مذہب کیوں اختیار کر لیا ہے) کسی قسم کی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ نہ صرف یہ کہ ان کے خلاف کچھ نہیں کیا جائے گا، انہیں مذہب کی شخصی آزادی PERSONAL LIBERTY دی جائے گی اور ان کے معابد کی حفاظت قرآنی معاشہ کے ذمے ہوگی۔ سورۃ حج

میں ہے۔ وَ تَوَلَّاهُ اللَّهُ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَهْدًا مَّتَّ صَوَامِعُ وَ بَيْنَهُمْ وَ صَلَوَاتُ وَ مَسْجِدًا يُدَاكِرُهُ
فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَيْتَابًا (۲۶/۴۰) ”اگر خدا ایک گروہ کی مدافعت (و حفاظت) دوسرے گروہ سے نہ کرانا تو عیسائیوں
کے کلیسا، راہبوں کی خانقاہیں، یہودیوں کے صومعے اور مسلمانوں کی مساجد جن میں قانونِ خداوندی کو بکھرتے سامنے لا با
جاتا ہے سب منہدم ہو جاتے۔ لہذا ان (غیر مسلموں) کی پرستش گاہوں کی حفاظت اسلامی مملکت کے ذمہ
ہوگی۔ نہ صرف ان کی پرستش گاہوں کی حفاظت بلکہ ان کی جان، مال، عزت، آبرو، عصمت، ہر متاع کی حفاظت۔
نیز یہ لوگ ان تمام حقوق اور مراعات کے یکساں طور پر مستحق ہوں گے جو انسان ہونے کی جہت سے انہیں مستقل اقدار کی
رو سے ملتی ہیں۔

واضح رہے کہ اس باب میں تو کسی پر کسی قسم کا جبر نہیں کیا جاسکتا (نہ جسمانی جبر نہ ذہنی استبداد) کہ وہ اسلام قبول
کرے یا کوئی دوسرا مذہب اختیار کرے۔ لیکن جب کوئی شخص برضا و رغبت اسلام قبول کرے، مسلم معاشرہ کا فرد بن جائے تو
اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اسلامی قوانین کی اطاعت کرے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اسلامی معاشرہ (یاد ویرِ حاضرہ کی اصطلاح
میں اسلامی مملکت) کا فرد بن جانے کے بعد اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ جس قانون کی بھی چاہے اطاعت کرے اور
جس سے بھی چاہے یہ کہہ کر انحراف کرے کہ لَا اَكْفِرُ لَكَ فِي الدِّينِ (دین میں کسی قسم کی زبردستی نہیں)۔ جبر اس میں نہیں کہ وہ کونسا
مذہب اختیار کرتا ہے۔ لیکن جب وہ اپنی مرضی سے اسلامی معاشرہ کا فرد بن جاتا ہے تو اس معاشرہ کے قواعد و ضوابط کی پابندی
کو بھی برضا و رغبت اپنے اوپر لازم قرار دے لیتا ہے۔ اگر وہ ان قوانین و ضوابط کی پابندی نہیں کرنا چاہتا تو اسے اس کی اجازت
ہے کہ وہ اسلام کے دائرے سے نکل کر اور مذہب اختیار کرے۔

سابقہ صفحات میں قرآن میں بیان کردہ مستقل اقدار میں سے بڑی بڑی اقدار کا مختصر الفاظ
الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ میں تعارف کرایا گیا ہے۔ اس بیچ پر اگر آپ قرآن کریم کا مطالعہ کریں تو اس باب میں
نئی نئی حقیقتیں آپ پر منکشف ہوں گی۔ اصل یہ ہے کہ مستقل اقدار کا شہرِ چشمہ خود ذاتِ خداوندی ہے۔ قرآن نے جن صفاتِ
الہیہ کو اس حسن و خوبی سے بیان کیا ہے، نگاہِ تعمق دیکھا جائے تو ان میں اس قسم کی صفات مثلاً هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ
وغیرہ کو چھوڑ کر باقی صفات جنہیں عام طور پر ETHICAL ATTRIBUTES کہا جاتا ہے) سب مستقل اقدار ہیں۔ انہیں
قرآن نے الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ ان صفاتِ خداوندی کو بطور معیار سامنے رکھ کر اپنے
اندر انسانی ممکنات کو مشہود کئے جانا مقصدِ دین اور مطلوبِ حیات ہے۔ جوں جوں انسانی ذات میں استحکام پیدا ہوتا جاگا

اس میں ان صفات (یعنی مستقل اقدار) کی نمود ہوتی چلی جلتے گی۔ مرد مومن اسے کہتے ہیں جس سے ان صفات کا ظہور از خود ہوتا جائے۔ بعینہ جس طرح ایک گہرا بدار سے روشنی کی شعاعیں بلا کاوش و بلا تکلف خود بخود باہر چلی جاتی ہیں۔ یہی وہ افراد ہیں جن سے قرآنی معاشرہ متشکل ہوتا ہے۔ آپ سوچئے کہ اگر عالم انسانیت میں اس قسم کا معاشرہ قائم ہو جائے جس میں مستقل اقدار کا احترام دل کی گہرائیوں سے اُبھرے اور انہیں کسی صورت میں کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے تو یہ دنیا کس طرح جنت میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس جنت میں ہر شخص کو اس امر کی ضمانت (SECURITY) حاصل ہوگی کہ اس کے ساتھ مستقل اقدار سے ہٹ کر کچھ نہیں کیا جائے گا۔ ”مومن“ کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ جو امن میں ہو اور دوسروں کو امن کی ضمانت دے۔ دنیائے انسانیت میں حقیقی امن صرف جماعتِ مومنین کے ہاتھوں قائم ہو سکتا ہے۔

اضافی اقدار

یہاں تک ہم نے ان اقدار کے متعلق لکھا ہے جو اپنی مستقل حیثیت رکھتی ہیں۔ ہم نے جو کہاوت کسی پچھلے باب میں درج کی ہے اسے ایک مرتبہ پھر سامنے لیتے۔ یعنی

مال صدقہ، جان، جان صدقہ، آبرو

اس میں آپ نے دیکھا تھا کہ مال بھی ایک قد ہے لیکن جب مال اور جان میں تصادم واقع ہو جائے تو مال کو جان کی خاطر قربان کیا جا سکتا ہے (بلکہ ایسا کرنا ضروری ہو جاتا ہے) اسی طرح جب جان اور آبرو میں تصادم واقع ہو جائے تو آبرو کی حفاظت کے لئے جان قربان کر دینا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مال اور جان اضافی اقدار ہیں۔ اور آبرو مستقل قد ہے۔ قرآن نے مستقل اقدار کے علاوہ اضافی اقدار کا بھی ذکر کیا ہے۔ مثلاً سورہ آل عمران میں ہے: **ذُنُوبِنَ لِلنَّاسِ حُبُّ**

الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَ الْبَنِينَ وَ الْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْأَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ (۳/۱۴) لوگوں کے لئے

”بیوی بچوں کی محبت، سونے چاندی کے ڈھیر، اعلیٰ قسم کے گھوڑے، مویشی، کھیتی و جبہ جاذ بیت بنانی گئی ہیں۔ گویا یہ چیزیں اپنی اپنی قیمت رکھتی ہیں۔ لیکن ایسے مواقع بھی آجاتے ہیں جن میں یہی اموال اور اولاد انسان کے لئے وجہ تخریب بن جاتے ہیں۔“

اقدار کی حفاظت کے لئے بڑے تو اپنی ضروریات سے زائد سارے کا سارا مال دے دینے کی تلقین کی گئی ہے (۲/۲۱۹)

۳۔ جان کی قیمت قرآن کی رو سے انسان کی جان، مال سے کہیں زیادہ بلند قدر ہے۔ اس کی قیمت اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس کے نزدیک مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا (۵/۳۲) جس نے کسی ایک فرد کو، بجز اس کے کہ اس نے کسی کو مار ڈالا ہو یا وہ ملک میں فساد برپا کرنے کا موجب ہو، قتل کر دیا تو یوں سمجھو گویا اس نے تمام نوع انسان کو قتل کر دیا۔ اور جس نے کسی ایک کی جان بچالی تو یوں سمجھو اس نے عالم انسانیت کی جان بچالی۔ لیکن اگر کوئی شخص کسی بے گناہ کو مار ڈالے یا صحیح معاشرہ کے امن کو درہم برہم کر ڈالے تو اس کی سزا موت تجویز کی گئی ہے۔ چنانچہ مندرجہ بالا آیت میں یہ الفاظ بھی ہیں: بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ” بجز اس کے کہ اس نے کسی کو مار ڈالا ہو یا ملک میں فساد برپا کرنے کا موجب ہو“ اسی کو دوسری جگہ ”بِالْحَقِّ“ جان لینا کہا گیا ہے: وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ (۱۷/۳۳) جس جان کو خدا نے واجب الاحترام قرار دیا ہے اسے مت قتل کرو، مگر حق کے ساتھ۔ ”حق“ کے یہی معنی ہیں، یعنی قاتل اور مفسد کو اس کے جرم کی پاداش میں موت کی سزا دینا۔

جان کی قیمت اور اہمیت کے پیش نظر اس کی سخت تاکید کی گئی ہے کہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھایا جائے جس سے انسان کی ہلاکت ہو جائے: وَلَا تَقْتُلُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ (۲/۱۹۵) ”اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں مت ڈالو“ یہ حکم جس طرح اجتماعی ہے اسی طرح الفراوی بھی ہے۔ لہذا اپنی جان کی حفاظت نہایت ضروری ہے۔ دوسری جگہ ہے: وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ (۲/۲۱۹) اس کے جہاں یہ معنی ہیں کہ ”اپنے لوگوں کو مت قتل کرو“ وہاں یہ بھی ہیں کہ ”اپنے آپ کو مت قتل کرو“ قرآن نے یہودیوں کے خلاف جو ”فرد جرم“ مرتب کی ہے اس میں یہ بھی ہے کہ وہ اپنے لوگوں کو قتل کر دیا کرتے تھے اور انہیں گھروں سے نکال دیتے تھے (۲/۸۵)۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کی رو سے جان کی قدر و قیمت کیا ہے۔ لیکن جب بلند اقدار کی حفاظت کے لئے جان کی ضرورت لاحق ہو جائے تو جو برضا و رغبت اسے مستغلی پر رکھ کر باہر نکل آئے اور خندہ پیشانی سے جان دے دے اسے بلند ترین مراتب کا مالک قرار دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ ”اسے مردہ مت کہو“ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْواتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ“ وَ لَكِن لَّا تَشْعُرُونَ (۲/۱۵۴) ”جو اللہ کی راہ میں قتل کئے جائیں انہیں مردہ مت کہو۔ وہ زندہ ہیں لیکن تم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر اسے نہیں سمجھ سکتے“ اس سے ظاہر ہے کہ جان، اس قدر عزیز ہونے کے باوجود، اضافی قدر ہے۔ اگر اس میں اور کسی مستقل قدر کی حفاظت میں تصادم واقع ہو جائے تو مستقل

قدر کے تحفظ کے لئے جان دے دینا باعث شرف انسانیت ہے۔ ”جان صدقہ آبرو“ سے یہی مراد ہے۔

۴۔ **حفاظتِ حرث و نسل** | قرآن نے اس شخص (قوم یا نظام) کو بدترین مجرم قرار دیا ہے جو کھیتی اور نسل کو تباہ کرے، **وَيُفْسِدُ الْخَرْبَ وَالنَّسْلَ** (۲/۲۰۵) لیکن جب کوئی قوم ظلم و استبداد پر اتر آئے اور اس کی انسانیت کش روش سے روکنے کے لئے جنگ کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہے تو اس کے خلاف جنگ کرنے کی اجازت ہے، **اِذْنٌ لِلَّذِينَ يُقْتَلُونَ بِانَّهُمْ ظَلِمُوا** (۲۲/۳۹) ”جن مظلوموں کے خلاف (سرخس لوگ) جنگ کے لئے چڑھ آئے ہیں انہیں (جنگ کی) اجازت دی جاتی ہے“ اور یہ ظاہر ہے کہ جنگ میں (بزار احتیاط کے باوجود) حرث و نسل کی تباہی ضرور ہوتی ہے۔ گویا ظلم کو روکنا ایک ایسی ضرورت ہے جس کے لئے اس سے کم قدر کی شے کا ضیاع روا رکھا گیا ہے خود جنگ کے لئے بھی قرآن نے کہا ہے کہ اُسے اس وقت تک جائز سمجھنا چاہیے: **حَتَّى تَضَعَ الْحَرْبُ اُذُنَهَا** (۲۱/۴) ”جب جنگ خود اپنے ہتھیار ڈال دے“ یعنی جنگ کی اجازت دنیا سے جنگ کے وجود کو ختم کرنے کے لئے دی گئی ہے۔

۵۔ **ایفائے عہد** | قرآن نے ایفائے عہد کو بڑی اہمیت دی ہے۔ وہ مومنین کا شعار یہ بتاتا ہے کہ **وَالْمُؤْمِنُونَ بَعَثُوا هِمًّا اِذَا عٰهَدُوْا** (۲/۱۷۷) ”جب وہ وعدہ یا معاہدہ کرتے ہیں تو اُسے پورا کرتے ہیں“ گویا عہد یا معاہدہ ایک ایسی قدر ہے جس کا احترام ضروری ہے۔ لیکن جس قوم کے ساتھ معاہدہ کیا جائے اگر اس کی طرف سے نقص عہد کا ڈر ہو تو اس وقت ان کے معاہدے کو ان کی طرف لوٹا دیا جاسکتا ہے، **وَاِنَّمَا تَخَافُنَّ مِنَ قُوَّةٍ خِيَانَةٍ فَاَنْبِئْهُمْ عَلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ** (۸/۵۸) ”لیکن اگر تمہیں کسی قوم سے خیانت کا ڈر ہو تو برابر کی شرائط پر ان کا معاہدہ ان کی طرف لوٹا دو“ واضح رہے کہ قرآن نے از خود معاہدہ توڑنے کی اجازت نہیں دی، کہا یہ ہے کہ جس معاہدہ قوم کی طرف سے نقص عہد کا ڈر ہو ان سے کہہ دو کہ اس کے بعد تمہارا اور ہمارا معاہدہ باقی نہیں رہے گا۔ یوں جب تم دونوں معاہدہ کے کالعدم ہو جانے سے ایک سطح پر آ جاؤ تو پھر تم دو سر اقدم اٹھا سکتے ہو۔ اس نقطہ نگاہ سے غور کیا جائے تو معاہدہ کا احترام ایک اضافی قدر نہیں رہتا بلکہ مستقل قدر بن جاتا ہے کیونکہ قرآن نے معاہدہ شکنی کی اجازت کسی حالت میں بھی نہیں دی۔ معاہدہ قوم کی طرف سے خیانت کی صورت میں معاہدہ کو کالعدم قرار دینے کی اجازت دی ہے۔ اس کے بعد جب اس قوم کے خلاف کوئی قدم اٹھایا جائے گا تو وہ معاہدہ کے خلاف اقدام نہیں ہوگا بلکہ ایسی قوم کے خلاف اقدام ہوگا جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی قوم سے معاہدہ کرتے وقت اس امر کی صراحت کر دینی ضروری ہوگی کہ یہ معاہدہ کن حالات

میں کالعدم قرار دیا جائے گا۔ معاہدہ شکنی کے علاوہ قرآن اس کی بھی سختی سے ممانعت کرتا ہے کہ تم معاہدات کو فریب دیجیے گا حربہ بناؤ۔ سورہ نحل میں ہے: **تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ أَنْ تَكُونَ أُمَّةٌ** (۱۶/۹۲) ”تم اپنی قسموں کو ایک دوسرے کو فریب دینے کا ذریعہ بناتے ہو تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ جائے“ اس سے آگے ہے: **وَلَا تَتَّخِذُوا أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ.....** (۱۶/۹۳) ”اپنی قسموں کو ایک دوسرے کو دھوکا دینے کا موجب مت بناؤ“

ان تصریحات سے واضح ہے کہ ایسے عہد کی سخت تاکید آئی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو معاہدات کا احترام ایک مستقل قدر ہے۔ لیکن چونکہ فریق مخالف کی طرف سے معاہدہ توڑ دینے کی صورت میں معاہدہ کے کالعدم قرار دینے کی اجازت ہے اس لئے ہم نے اسے اضافی اقدار کے تحت لکھا ہے۔ اس فرق کو یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ (مثلاً) عدل کرنا مستقل قدر ہے۔ یہ اس سے مشروط نہیں کہ جب تک فریق مقابل عدل کرے تم بھی عدل کرو اور جب وہ عدل کو ہاتھ سے چھوڑ دے تو تم ظلم پراتر آؤ۔ فریق مقابل عدل کرے یا نہ کرے تم عدل سے ہاتھ اٹھا ہی نہیں سکتے۔ لیکن ایسے عہد اس سے مشروط ہوتا ہے کہ فریق مخالف اس عہد کا پابند ہے۔ اگر وہ اس کا پابند نہ ہے تو تم بھی اس کے پابند بننے پر مجبور نہیں ہو سکتے۔ بس اتنا سا فرق ہے جس کے لئے اسے اضافی اقدار کے تحت لکھا گیا ہے۔ ورنہ یہ بھی ایک طرح مستقل قدر ہی ہے۔

∴

یہ ہیں مختصر الفاظ میں چند اضافی اقدار جن کا احترام عام حالات میں نہایت ضروری ہے، لیکن جنہیں ان سے کسی اعلیٰ قدر کی حفاظت کی خاطر قربان کیا جاسکتا ہے۔ اس باب میں استیعاب مقصود نہیں۔ قرآن کریم پر مزید غور کرنے سے ان اقدار کی فہرست میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

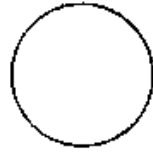
قرآن کریم نے مستقل اقدار اور اضافی اقدار کے باہمی تعلق اور ان میں تصادم کے وقت اول الذکر کی خاطر ثانی الذکر کو قربان کر دینے کے تصور کو سورہ توبہ کی اس آیت میں نہایت جامعیت سے سمٹا دیا ہے جسے پہلے بھی درج کیا جا چکا ہے لیکن جسے ہم آخر میں دہرا دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے:-

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَمْهَاتُكُمْ وَأَعِشِيْرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ
 فِيْكُمْ فَهُنَّ أَهْلُكُمْ فَكُونُوا بِرِّكُمْ ذَلِكَ خَيْرٌ مِّنْ ذَلِكُمْ إِن كُنْتُمْ مِّنْ عَابِدِيْنَ
 وَرَسُولِهِ وَجِهَادٌ فِيْ سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرٍ وَاللّٰهُ لَذِيْ
 الْقُوْمَةِ الْفَاسِقِيْنَ ۝ (۹/۲۳)

”ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے اہل خانہ اور مال و دولت جسے تم کماتے ہو۔ اور تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو۔ اور تمہارے مکانات جنہیں تم (اس قدر) پسند کرتے ہو۔ اگر یہ چیزیں تمہارے نزدیک اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو تم انتظار کرو یہاں تک کہ خدا کا فیصلہ آجائے (اور تم تباہ و برباد ہو جاؤ) اللہ ان لوگوں کی صحیح راستے کی طرف راہ نمائی نہیں کرتا جو صحیح راستے سے ایک طرف کو نکل جائیں“

زندگی کا صحیح راستہ یہ ہے کہ ہر شے کو اس کے اپنے مقام پر رکھا جائے۔ اور جب کبھی ادنیٰ اور اعلیٰ اقدار میں تصادم ہو تو اعلیٰ کی خاطر ادنیٰ کو قربان کر دیا جائے۔

اسی نظام زندگی کو اسلام کہا جاتا ہے۔ یہی مستقل اقدار سیاست کی زبان میں بنیادی حقوق انسانیت (FUNDAMENTAL HUMAN RIGHTS) قرار پا جاتے ہیں۔



باب شانزدہم

عورت

دنیا میں کسی حیوان نے اپنے جوڑے کے ساتھ وہ کچھ نہیں کیا جو انسان نے اپنے رفیق سفر کے ساتھ کیا ہے۔ حیوانات میں اس طبعی فریضہ کے علاوہ جو مادہ کے لئے فطرت کی طرف سے مخصص کیا گیا ہے، نر اور مادہ میں کوئی تمیز اور امتیاز نہیں ہوتا۔ لیکن مرد اور عورت کی باہمی تفریق کی خلیج اتنی وسیع اور گہری ہے گویا یہ دو مختلف جنسوں SPECIES کے افراد ہیں۔ ان کی یہ باہمی تفریق فطرت کی پیدا کردہ نہیں، انسان کی خود پیدا کردہ ہے۔ اور اس کی بنیاد خود مرد کے ہاتھوں رکھی گئی ہے۔ فطرت کے پردہ گرام کے مطابق، تمام حیوانات میں انسانی بچے کی پیدائش اور پرورش کا عرصہ (جو استقرار حمل سے شروع ہوتا ہے) سب سے زیادہ لمبا ہوتا ہے۔ اس عرصہ میں ایک مدت تک عورت زندگی کے عام کاروبار سے قریب قریب معذور ہوتی ہے اور باقی مدت میں اس قدر مصروف کہ اسے عام کاموں کے لئے بہت کم وقت مل سکتا ہے۔ مردان تمام فرائض و مصروفیات سے آزاد اور فارغ ہوتا ہے، لہذا تقسیم کار کے اصول کی رُو سے، وہ اکتسابِ رزق کرتا ہے اور عورت کی ضروریات پوری کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ (۴/۳۴)

فطرت نے یہ پردہ گرام، افزائش و تربیتِ نسل انسانی کی خاطر متعین کیا تھا لیکن مرد نے عورت کی اس مجبوری اور احتیاج سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور جس طرح ہر محتاج کے ساتھ ہوتا ہے، اسے اپنا محکوم اور زیر دست بنا لیا۔ محکومی کی زنجیروں کو مضبوط تر بنانے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ زیر دست کے دل میں اس خیال

عورت مرد فرود تر ہے کو راسخ کر دیا جائے کہ وہ حاکم اور فرمان بردار ہے اور فطرت نے اسے پیدا ہی اطاعت اور فرماں پذیری کے لئے کیا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے "مذہب" (یعنی انسانوں کا خود تراشیدہ مذہب) بڑا موثر حربہ ہوتا ہے۔ لہذا اس باب میں بھی مرد نے مذہب کو آگے بڑھایا اور اس نے اس عقیدہ کو عام کرنا شروع

کر دیا کہ عورت کا درجہ 'مرد کے مقابلہ میں نہایت پست ہے۔ یہ تمام مصیبتوں کا سرچشمہ اور گناہوں کا منبع ہے۔ یہ ناقص لعل ہے۔ اسے ہمیشہ مرد کے تابع فرمان رہنا چاہیے۔ چنانچہ آپ بائبل کو اٹھا کر دیکھتے۔ اس میں یہ عقائد عام ملیں گے۔ اس کی رو سے خدا نے مرد (آدم) کو اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا وہ جب تنہائی کی وجہ سے اداس اداس رہنے لگا تو اس کی دلجوئی کی خاطر اس کی پسلی سے عورت (حواء) کو پیدا کیا۔ یعنی مقصود بالذات تو مرد کی پیدائش تھی۔ عورت کو محض مرد کی دلجوئی کے لئے بطور کھلونا پیدا کر دیا۔ شیطان نے عورت کو پھسلا یا اور اس کی وجہ سے آدم کو جنت سے نکلنا پڑا۔ چنانچہ عورت کے اس جرم کی سزا کے لئے خدا نے فیصلہ کیا کہ وہ دردِ زہ سے بچتے جننے اور اس کے بچے، گناہوں کا بوجھ لادے دنیا میں آئیں اور مصیبتوں میں رہیں عیسائی

عیسائیت اور عورت

کلیسا میں ایک مدت تک یہ مسئلہ زیر بحث رہا کہ عورت میں رُوح بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ جہاں تک عورت کی "فطرت" کا تعلق ہے۔ اس کے متعلق کہا گیا کہ چونکہ یہ مرد کی پسلی سے پیدا ہوئی ہے اس لئے یہ پسلی کی ہڈی کی طرح ٹیڑھی ہوتی ہے۔ اگر اسے سیدھا کرنا چاہیں تو یہ ٹوٹ جائے گی لیکن سیدھی نہیں ہوگی۔ عورت کے متعلق یہ تصورات عیسائیت ہی سے مخصوص نہیں۔ دنیا کے قریب قریب ہر مذہب میں عورت کو یہی پوزیشن دی گئی ہے۔ وہ مرد کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اس لئے اسے مرد کی مرضی کے مطابق چلنا ہوگا۔ معاشرہ میں اس کا اپنا کوئی مقام نہیں حتیٰ کہ اس کا تعارف بھی اس کی اپنی ذات سے نہیں ہوتا۔ وہ زید کی بیٹی، بکر کی بیوی یا عمر کی ماں کی حیثیت سے متعارف ہوتی ہے۔ وہ نہ کسی جائیداد کی مالک ہو سکتی ہے اور نہ ہی مرد کی کمائی میں صاحب اختیار۔ وہ باپ، خاوند یا بیٹے کی دولت یا جائیداد سے بطور استحقاق کچھ نہیں لے سکتی۔ اسے کچھ دیا جائے گا تو بطور خیرات دیا جائے گا۔ کنیادان ہندو معاشرہ کا ستم ہے۔ اس دھرم کی رو سے، وہ اپنا خاوند آپ منتخب نہیں کر سکتی، باپ اسے جس کے پلے جی چاہے باندھ دے۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی شادی اس کے بالغ ہونے سے پہلے کر دی جائے۔ یہ شادی، مستقل بندھن ہوگا جو کسی حالت میں ٹوٹ نہیں سکتا۔ حتیٰ کہ خاوند کی موت کے بعد بھی، وہ عورت اسی کی بیوی رہے گی۔ اسے یا تو خاوند کی چتا میں جل کر مرجانا ہوگا۔ اور یا ساری عمر بیوگی کی حالت میں زندگی بسر کرنا ہے۔

عورت کے متعلق یہ نظریات صدیوں سے چلے آ رہے ہیں اور قریب قریب دنیا کے ہر حصے میں رائج ہیں (دیا

لے ہندوؤں نے اب ان قدیم عقائد و مسالک کو بدل ڈالا ہے۔ لیکن یہ کچھ انہوں نے اپنے مذہب کو چھوڑ کر کیا ہے۔ ان کے مذہب کی رو سے عورت کی پوزیشن وہی ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ عیسائی ممالک میں بھی اس باب میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ مذہب کو چھوڑ کر ہوئی ہیں۔

یوں کہتے کہ آج سے کچھ عرصہ پیشتر تک رائج تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورت اپنے متعلق خود یہ سمجھنے لگ گئی کہ دنیا میں اس کی اپنی حیثیت کچھ نہیں۔ وہ صرف مرد کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اس کا مقصد حیات یہ ہے کہ وہ مرد کی جنسی خواہشات کی تسکین کرے اور اس کی اولاد پیدا کرنے کا ذریعہ بنے۔ عورت کے دل میں اپنے متعلق یہ نظریہ کس قدر گہرائی تک پہنچ چکا ہے اس کا اندازہ اس سے لگائے کہ مغرب کی عورت اپنے آپ کو بالکل آزاد سمجھتی ہے اس کا تصور یہ ہے کہ وہ کسی میدان میں مرد سے پیچھے نہیں۔ وہ مرد کے تابع نہیں۔ وہ ہر اس تصور سے بغاوت کرتی ہے جس میں اس احساس کا شائبہ تک بھی پایا جائے کہ وہ مرد سے فرو تر ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح مرد کی نگاہوں میں وجہ جاذبیت (ATTRACTIVE) بن کر رہے۔ اس کا تمام سامان زیبائش و آرائش اس کے فروغ حسن اور نمائش جسم کے متنوع طرق و اسالیب اس کا انداز گفتار، اس کی طرز رفتار، اس کے لباس کی تراش و خراش۔ غرضیکہ اس کی ہر نقل و حرکت اور وضع قطع کے پیچھے یہ جذبہ کار فرما ہوتا ہے کہ وہ مرد کی نگاہوں میں زیادہ سے زیادہ جاذب ہو سکے۔ آپ نے دیکھا کہ (بظاہر) مرد سے سرکش اور آزاد ہونے کے باوجود عورت کے قلب کی گہرائیوں میں یہ عقیدہ ابھی تک جاگزیں ہے کہ وہ مرد کے لئے پیدا کی گئی ہے اس باب میں بلکہ زمانہ بہالت کی عورت، عصر تہذیب کی دختر سے زیادہ سمجھدار تھی۔ وہ مرد کی خواہشات کی تسکین کا ذریعہ بنتی تھی تو (کم از کم) کمانے کی مشقت سے تو فارغ تھی۔ یہ خود کماتی ہے اور اپنی کمائی کا بیشتر حصہ مرد کا کھلونا بننے میں صرف کر دیتی ہے۔ یہ پوری کوشش کرتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح مرد کے دام نگاہ میں گرفتار رہے، اور اس کے باوجود اپنے آپ کو اس فریب میں رکھتی ہے کہ میں مرد کے چنگل سے آزاد ہوں۔ یہ سب غیر شعوری طور پر، اسی نظریہ اور عقیدہ کا اثر ہے جو ہزار ہا سال سے عورت کے رگ و پے میں سرایت کئے چلا آ رہا ہے۔



قرآن آیا اور اس نے عورت کے متعلق ان تمام نظریات و معتقدات کو باطل قرار دے دیا جو صدیوں سے مرد نے پھیلا رکھے تھے۔ انسانی تاریخ میں یہ بہت بڑی انقلابی آواز تھی۔ اس نے کہا کہ یہ غلط ہے کہ خدا نے مرد کو پیدا کیا اور عورت کو مرد کی پسلی سے پیدا ہوئی۔ یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ قرآن کی رو سے یہ نظریہ صحیح نہیں کہ نوع انسان کی ابتدا اس طرح ہوئی ہے کہ خدا نے کسی نہ کسی طرح ایک مرد (یا ایک جوڑے) کو پیدا کر دیا اور ان سے پھر نسل انسانی کا سلسلہ آگے چل پڑا۔ قرآن بتاتا ہے کہ زندگی اپنے مختلف ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی، بیگر انسان تک پہنچی ہے۔ اس کی ابتداء ایک جرثومہ حیات LIFE CELL سے ہوئی۔

اس میں زرمادہ کا امتیاز نہیں تھا۔ پھر وہ جوش نموسے دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک حصہ نر کے امتیازات لئے ہوئے (SPERMATAZOOON) اور دوسرا مادہ کے خصائص کا حامل (OVUM)۔ ان دونوں کے امتزاج سے پیدائش کا سلسلہ بذریعہ تولید آگے چلا۔ انسانی بچہ (لڑکی اور لڑکا) کی پیدائش بھی اسی طرح عمل میں آتی ہے۔ اس لئے یہ غلط ہے کہ پہلے مرد بنا دیا گیا اور اس کی پسلی سے عورت نکلی۔ اس کا اعلان ہے کہ "أَلَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ" اللہ وہ ہے جس نے تمہیں ایک جرنومہ حیات سے پیدا کیا۔ "وَخَلَقَ مِنْهَا نَرًا وَنَحْوَ" اور اسی ایک جرنومہ (کو دو حصوں میں شق کر کے اس) سے اس کا جوڑا پیدا کر دیا اور بَنَتْ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً" (۴/۱) اور ان دونوں کے امتزاج سے مردوں اور عورتوں کی بڑی تعداد دنیا میں پھیلا دی۔ اس سے ظاہر ہے کہ پیدائش کے اعتبار سے مرد اور عورت میں سے کسی کو ایک دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں۔

عورت اور مرد کی تخلیق

اس کے بعد قرآن نے اس عقیدہ کی بھی تردید کی کہ جنت میں آدم کی لغزش کا موجب عورت ہوئی تھی۔ اس نے کہا کہ مرد اور عورت دونوں میں صحیح راستے پر چلنے اور اس سے بہک جانے کا امکان یکساں طور پر موجود ہے۔ یہ دونوں لغزش کر سکتے ہیں۔ "فَأَنزَلْنَا لَهُمَا الشَّيْطَانَ عَنْهَا" (۲/۳۶) اس لئے یہ سمجھنا غلط ہے کہ دنیا میں گناہ کی ذمہ دار عورت ہے۔ مرد بالکل معصوم ہے۔

پھر اس نے کہا کہ افزائش نسل انسانی کے ضمن میں پروردگرم یہ تجویز کیا گیا ہے کہ مرد اور عورت دونوں کے باہمی تعاون سے یہ سلسلہ آگے چلتا ہے۔ نہ تنہا مرد اس کے لئے کفایت کرتا ہے نہ تنہا عورت۔ جو چیزیں اس طرح مل کر کسی ایک مقصد کو پورا کریں انہیں ایک دوسرے کا زوج (COMPLEMENTARY) کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے مرد اور عورت ایک دوسرے کے زوج ہیں۔ ان میں سے بعض خصوصیات مرد کو دی گئی ہیں اور عورت ان سے محروم ہے۔ بعض عورت کو دی گئی ہیں اور مرد ان سے بہرہ ور نہیں۔ اس لئے ایک کو دوسرے پر فضیلت حاصل ہے۔ "فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ" (۲/۳۳)۔ غور کیجئے۔ قرآن نے یہ نہیں کہا کہ مرد کو عورت پر فضیلت دی گئی ہے یا عورت کو مرد پر فوقیت حاصل ہے۔ بعض خصوصیات کے لحاظ سے مرد کو عورت پر اور دوسری خصوصیات کے اعتبار سے عورت کو مرد پر اور فطرت کا پروردگرم ان دونوں کی رفاقت سے پورا ہوتا ہے۔ مرد اور عورت کی یہ امتیازی خصوصیات صرف حیاتیاتی (BIOLOGICAL) ہیں۔ جہاں تک انسانی صلاحیتوں کا تعلق ہے، وہ دونوں کو یکساں طور پر حاصل ہیں۔ مرد نے عورت کو ہزار ہا سال سے ان مواقع و ذرائع سے محروم رکھا جن سے اس

کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی، اور پھر یہ فتویٰ صادر کر دیا کہ عورت ہوتی ہی ناقص العقل ہے۔ یہ غلط ہے۔ انہیں یکساں مواقع دیجئے اور پھر دیکھئے کہ یہ دونوں کس طرح کارگہ حیات میں دوش بدوش چلتے ہیں۔

یکساں صلاحیتیں

قرآن نے اعلان کیا ہے کہ

إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَنَاتِ وَالْقَنَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَشِيعِينَ وَالْخَشِيعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّامِتِينَ وَالصَّامِتَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا (۳۳/۳۵)

اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ قوانین خداوندی کی اطاعت کر سکیں تو عورتوں میں بھی اس کی صلاحیت ہے۔ (الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ)۔ اگر مرد اس جماعت کے رکن بن سکتے ہیں جو ان قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہوئے امن عالم کی ذمہ دار بنتی ہے، تو عورتیں بھی اس کی رکن بن سکتی ہیں (الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ)۔ اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنی استعداد کو اس طرح سنبھال کر رکھیں کہ اس کا استعمال خدائی پروگرام کے مطابق ہو، تو یہی صلاحیت عورتوں میں بھی ہے (وَالْقَنَاتِ وَالْقَنَاتِ)۔ اگر مرد اپنے دعوتے ایمان کو سچ کر دکھانے کے قابل ہیں تو عورتیں بھی اس کی اہل ہیں (وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ)۔ اگر مرد ثابت قدم رہ سکتے ہیں تو عورتیں بھی ایسا کر سکتی ہیں (وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ)۔ اگر مرد اس خصوصیت کے حامل ہو سکتے ہیں کہ جوں جوں ان کی صلاحیتیں نشوونما پاتی جائیں وہ قوانین خداوندی کے سامنے اور زیادہ جھکتے جائیں تو یہی خصوصیت عورتوں کو بھی حاصل ہے (وَالْخَشِيعِينَ وَالْخَشِيعَاتِ)۔ اگر مردوں میں ایثار کا مادہ ہے تو عورتوں میں بھی ہے (وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ)۔ اگر مرد اپنے آپ پر ایسا کنٹرول رکھ سکتے ہیں کہ جہاں سے انہیں روکا جائے وہ رُک جائیں تو عورتیں بھی ایسا کر سکتی ہیں (وَالصَّامِتِينَ وَالصَّامِتَاتِ)۔ اگر مرد اپنے جنسی میلانات کو ضوابط کی پابندی میں رکھ سکتے ہیں تو عورتیں بھی ایسا کر سکتی ہیں (وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ)۔ اگر مرد قانون خداوندی کو سمجھنے اور اسے ہر وقت اپنے سامنے رکھنے کے اہل ہیں تو عورتیں بھی اس کی اہل ہیں (وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ)۔ جب یہ صلاحیتیں دونوں میں یکساں طور پر موجود ہیں تو ان کے نتائج بھی دونوں کے لئے یکساں طور پر موجود ہونے چاہئیں۔ فلہذا، نظام خداوندی (اسلامی معاشرہ) میں دونوں کے لئے حفاظت کا سامان اور اجر عظیم ہے (أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا)۔ دوسرے مقام پر مومن عورتوں کی خصوصیت سلیحت بھی بتائی گئی ہے (۶۶/۵) یعنی سیاحت کرنے والیاں بمقابلہ سیاحت کرنے والے مردوں کے۔ (النَّسَاءِ يَحْتَوْنَ ۹/۱۱۲)۔

آپ قرآن کریم کی ان تصریحات پر غور کریں اور پھر دیکھیں کہ زندگی کا کون سا گوشہ ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ مرد میں تو اس کی صلاحیت موجود ہے لیکن عورت میں نہیں۔ مرد تو یہ کچھ کر سکتا ہے لیکن عورت نہیں بن سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے کہہ دیا کہ مرد اور عورت دونوں کے صلاحیت بخش اعمال یکساں طور پر تمیز نہیں ہوں گے۔ وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ نَقِيرًا ۝ (۳۱/۱۲۳)۔ حتیٰ کہ اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ جو کچھ مرد کمائے گا وہ اس کا حصہ ہوگا۔ جو کچھ عورت کمائے گی وہ اس کا حصہ ہوگا۔ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبْنَ ﴿۳۲﴾ (۳۱/۳۲)

امورِ مملکت اور عورت | قرآن کریم کی تعلیم سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ قرآن کریم نے اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" بتایا ہے (۲۲/۳۱)۔ اور اس فریضہ کے متعلق کہل ہے کہ وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۹/۷۱) مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ امورِ مملکت کی سرانجام دہی میں عورتیں برابر کی شریک ہیں۔

قطع نظر ان تصریحات کے ایک اصولی بات کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ قرآن کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ پیدائش کے اعتبار سے انسان اور انسان میں تمیز نہیں کی جاسکتی۔ اس کی تعلیم کی پوری عمارت اسی بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پیدائش کے اعتبار سے برہمن اور شودر میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ وہ جھوٹی پٹری میں جنم لینے والے بچے اور محل میں پیدا ہونے والے میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھتا۔ اس اصول کو سامنے رکھ کر دیکھئے کہ ایک شخص کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے اور ایک لڑکی۔ اس باب میں نہ لڑکے کی کوئی کاریگری ہے جس کی وجہ سے وہ لڑکا بن گیا۔ نہ لڑکی کا کوئی جرم کہ وہ لڑکی پیدا ہوئی۔ اب اگر اس اصول کو صحیح تصور کر لیا جائے کہ لڑکی لڑکے سے (یا عورت مرد سے) فروتر ہوتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ ہم پیدائش کے اعتبار سے انسانوں کی ایک جنس کو افضل اور دوسری کو کمتر تسلیم کرتے ہیں۔ اور ان میں یہ فرق ایسا ہے جسے کمتر فریق (یعنی عورت) لاکھ کوشش کرنے کے باوجود مٹا نہیں سکتی۔ آپ سوچتے کہ اس غلط تصور کی رو سے کہ مرد کو محض مرد ہونے کی جہت سے عورت پر فضیلت حاصل ہے، اسلام کی بلند ترین تعلیم کس طرح جو بنیاد سے اکھڑ کر رہ جاتی ہے۔ یہ تصور ہمارا بیدار کردہ ہے۔ قرآن کا دامن اس سے پاک ہے۔

حیوان کے بچے کو ماں (یا ماں باپ کی طرف سے) صرف جسمانی پرورش کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی تربیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جسمانی پرورش کے بعد وہ خود وہ کچھ بن جاتا ہے جو کچھ بننے کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ بگری کا بچہ بگری۔ شیر کا بچہ شیر۔ لیکن انسانی بچہ کو انسان بننے کے لئے 'جسمانی پرورش کے علاوہ' تربیت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تربیت گھر کے ماحول میں ہو سکتی ہے۔ یہ ہے وہ ضرورت جس کے لئے قرآن 'عائلی زندگی' (FAMILY LIFE) کو بڑی

عائلی زندگی کی اہمیت اہمیت دیتا ہے۔ یہ حقیقت بادی تعقیق بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ جسے ہم معاشرہ کہتے ہیں وہ "گھر" ہی کی پھیلی ہوئی شکل کا نام ہے۔ صبح کے وقت گھر پھیل کر معاشرہ بن جاتے ہیں۔ اور رات کو معاشرہ سمٹ کر گھروں میں محدود ہو جاتا ہے۔ عربی زبان میں قوم کے لئے امت کا لفظ آتا ہے۔ قرآن کریم جس قسم کی قوم (جماعتِ مومنین) متشکل کرنا چاہتا ہے اس کے لئے بھی اس نے امت ہی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ امت کا لفظ اُگڑ سے بنا ہے جس کے معنی "ماں" ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امت کی تعمیر آغوشِ مادر میں ہوتی ہے۔ اسی لئے وہ گھر کو نمونہ بنانا چاہتا ہے اس معاشرہ کا جسے وہ نوعِ انسان کے لئے جنتِ ارضی قرار دیتا ہے۔

فکر و نظر کی ہم آہنگی گھر کو جنت بنانے کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ میاں بیوی میں فکر و نظر اور خیالات و نظریات کی کامل ہم آہنگی ہو۔ وہ کھلے الفاظ میں کہتا ہے کہ نظریات زندگی کے تضاد کے ساتھ شادی کرنا، گھر کو جہنم بنانا ہے (۲/۲۲۱)۔ اس کے برعکس، نظریات و معتقدات کی ہم آہنگی سے گھر جنت بن جاتا ہے (۲/۲۲۱)۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ عورت اور مرد کو اپنے ساتھی کے انتخاب کا پورا پورا حق حاصل ہو۔ اس لئے قرآن مردوں سے کہتا ہے کہ وہ اپنی پسند کی عورتوں سے شادی کریں (۴/۳)۔ اور عورتوں کے متعلق کہتا ہے کہ مرد ان کے زبردستی مالک نہ بن جایا کریں (۴/۱۹)۔ ان حالات میں نابالغ لڑکے یا لڑکی کی شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہذا قرآن کی رُو سے نکاح نام ہے ایک بالغ مرد اور بالغ عورت کے برضا و رغبت، اپنی پسند کے مطابق، باہمی معاہدہ کا کہ ہم ایک دوسرے کے رفیق بن کر، سکون اور محبت اور ہم آہنگی و یک نگہی کی زندگی بسر کریں گے (۳۰/۲۱) اور اس طرح معاشرہ میں ایسا خوشگوار ماحول پیدا کریں گے جس میں پرورش پا کر ہماری آئندہ نسل متوازن شخصیت کی حامل اور شرفِ انسانیت کی پیکر بنے۔

تقسیم کار چونکہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، گھر کی وحدت (UNIT) میں تقسیم کار کے اصول کی رُو سے عورت کے وقت کا بیشتر حصہ اولاد کی پرورش اور تربیت میں صرف ہو جاتا ہے اس لئے

اکتسابِ رزق کی بنیادی ذمہ داری مرد کے سر ہوگی۔ اس کے لئے قرآن میں ہے کہ **الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ** (۴/۳۴) عورتوں کے لئے سامانِ زیست مہیا کرنے کی ذمہ داری مردوں پر ہے۔ واضح رہے کہ اس سے یہ مراد نہیں کہ عورت اکتسابِ رزق کر ہی نہیں سکتی جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، قرآن نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ جو کچھ عورت کمائے اس کی وہ خود مالک ہوتی ہے۔ (۴/۳۲)۔ مردوں کو عورتوں کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذمہ دار قرار دینے سے مفہوم یہ ہے کہ گھر کے نظم و نسق میں چونکہ عورت کا بیشتر وقت بچوں کی پرورش اور تربیت میں صرف ہو جاتا ہے اور مرد اس سے فارغ ہوتا ہے، اس لئے حصولِ معاش، بنیادی طور پر مرد کا فریضہ ہے۔ جہاں تک میاں بیوی کے حقوق اور فرائض کا تعلق ہے، قرآن نے **حقوق و فرائض** دونوں کو یکساں پوزیشن دی ہے۔ اس باب میں اس نے ایک ایسا اصول بیان کیا ہے جو اپنے اختصار اور جامعیت کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ **وَلَهُنَّ مِثْلُ** **الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ** (۲/۲۲۸) قاعدے اور قانون کے لحاظ سے عورتوں کی ذمہ داریاں اتنی ہی ہیں جتنے ان کے حقوق ہیں۔ باقی رہے میاں بیوی کے باہمی تعلقات، سو اس کے لئے بھی قرآن نے اسی قسم کا جامع اور مختصر اصول بیان کر دیا ہے۔ جب کہا کہ **هُنَّ لِيَسَاءُنَّ لَكُمْ وَ أَنْتُمْ لِيَسَاءُنَّ لَهُنَّ** (۲/۱۸۷) ”تم ایک دوسرے کے لئے بمنزلہ لباس کے ہو جس کا بدن کے ساتھ ایسا گہرا اور براہِ راست تعلق ہوتا ہے کہ کوئی اور چیز ان کے درمیان حائل نہیں ہو سکتی۔“

قرآن نے نکاح کو باہمی معاہدے سے تعبیر کیا ہے جو فریقین کی دلی رضامندی سے استوار ہوتا ہے (۴/۲۱) وہ تاکید کرتا ہے کہ اس معاہدے سے پہلے اچھی طرح دیکھ بھال کر لینی چاہیے اور ہر ممکن طریقے سے اس کا اطمینان کو لینا چاہیے کہ یہ معاہدہ عمر بھر تک بہ حسن و خوبی نبھ جائے گا۔ اس کے بعد وہ ایسی ہدایات دیتا ہے جن کی رو سے یہ معاہدہ میاں بیوی کی ازدواجی زندگی میں پختہ سے پختہ تر ہوتا چلا جائے۔ لیکن اس کے باوجود، قرآن حقائق سے آنکھ نہیں چراتا۔ وہ تسلیم کرتا ہے کہ اس قدر اختیاط اور تاکید کے باوجود، ایسی صورت پیدا ہو سکتی ہے کہ فریقین میں اختلاف پیدا ہو جائے۔ ایسی حالت میں، وہ معاشرہ کی ذمہ داری قرار دیتا ہے کہ وہ ان کے باہمی اختلافات مٹانے کی پوری پوری کوشش کرے۔ اس کے لئے وہ تجویز کرتا ہے کہ فریقین کے نمائندگان پر مشتمل ایک مصالحتی بورڈ بٹھایا جائے جو ان کے اختلافات

لے قرآن نے کہا ہے کہ صرف ایک بات میں مرد کا حق فائق ہے اور وہ یہ کہ طلاق کی صورت میں عورت کو نکاحِ ثانی کے لئے کچھ وقت تک انتظار کرنا پڑتا ہے (بصورتِ عدت کہا جاتا ہے) اور مرد کے لئے انتظار کی ضرورت نہیں۔ (۲/۲۲۸)

کو رفع کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گی (۴/۲۵)۔ لیکن اگر ان کی کوشش ناکام رہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچیں کہ ان میاں بیوی میں نباہ کی کوئی صورت نہیں رہی، تو پھر ان کے معاہدہ نکاح کو منقطع کر دیا جائے۔ اسے طلاق کہتے ہیں۔



چونکہ قرآن میاں بیوی میں فکر و نظر کی ہم آہنگی اور ان کے تعلقات میں محبت و سکون کی شیرینی کو بنیادی شرط قرار دیتا ہے اس لئے اس میں ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسلام کا عام اصول وحدت ازدواج (MONOGAMY) ہے۔ لیکن وہ اس باب میں بعض ناگزیر حالات سے چشم پوشی نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ بعض حادثات کی وجہ سے (مثلاً جنگ کی وجہ سے) ایسے ہنگامی حالات پیدا ہو سکتے ہیں جن میں بیوہ عورتوں (ان کے ساتھ یتیم بچوں) اور بالغ لڑکیوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو جائے کہ وحدت ازدواج کے اصول کے مطابق ان کے لئے شادی کا امکان نہ ہو۔ ایسے حالات میں معاشرہ میں جو جنسی فوضویت پھیل سکتی ہے وہ ظاہر ہے قرآن کہتا ہے کہ اس قسم کے ہنگامی حالات پر قابو پانے کے لئے، وحدت ازدواج کے اصول میں استثناء کی جا سکتی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ **وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقِطُوا فِي الْيَسْمِيْنَ فَإِنْ كُنْتُمْ مَاطَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَ ثَلَاثَ وَ مِثْلَ بَعْ (۴/۳)** ”اگر تمہیں اس کا اندیشہ ہو کہ تم یتیم بچوں اور ان عورتوں کا مسئلہ جنہیں خاوند نہ مل سکتا ہو، منصفانہ طور پر حل نہ کر سکو گے، تو تمہیں اجازت ہے کہ تم ان عورتوں میں سے حسب پسند دو، تین تین، چار چار تک سے شادی کر لو (یعنی جس حد تک اس ہنگامی ضرورت کا تقاضا ہو) یاد رہے کہ وہ مسلمان عورتیں جو بیوہ ہو جائیں یا ان کی عمر شادی کے قابل ہو جائے اور ان کی ازدواجی زندگی کے لئے مسلمان مرد موجود نہ ہوں، معاشرہ کے لئے ایک ضروری مسئلہ (PROBLEM) بن جائیں گی۔ اس لئے کہ مسلمان عورت غیر مسلم سے شادی کر ہی نہیں سکتی۔ اسے مسلمانوں کے اندر ہی شادی کرنی ہوگی۔ اور وحدت ازدواج کے اصول کے ماتحت اس کی گنجائش نہ ہوگی۔ اس غیر معمولی (ABNORMAL) صورت حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے قرآن نے یہ حل تجویز کیا ہے۔ لیکن اس کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ ان لوگوں اور ان کے یتیم بچوں کے ساتھ عدل کیا جائے۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر اس کی بھی اجازت نہیں۔ **فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاجِدًا (۴/۳)**۔

لے چونکہ اس کتاب میں دین کے صرف اصول بیان کئے جا رہے ہیں اس لئے ان کی جزئیات کی تفصیلی بحث نہیں دی گئی۔ عالمی زندگی سے متعلق تفصیلی احکام مبری کتاب ”ظاہرہ کے نام خطوط“ میں ملیں گے۔

”اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم عدل قائم نہیں رکھ سکو گے، تو پھر اس کی اجازت نہیں۔ پھر وہی وحدت ازدواج کا اصول برقرار رہے گا۔ عدل کے لئے بنیادی شرط یہ ہوگی کہ پہلی بیوی (اور کسی کے پہلی بیوی نہ ہو تو جن عورتوں سے شادی کرنا چاہتا ہے وہ) اس پر رضامند ہوں۔ اگر وہ رضامند نہ ہوں گی تو عدل ناممکن ہو جائے گا۔ گھر جہنم بن جائے گا۔

قرآن کریم میں بیک وقت، ایک سے زیادہ بیوی کے متعلق یہی ایک آیت ہے۔ لہذا ان حالات کے علاوہ اور کسی صورت اور کسی مقصد کے لئے بھی ایک سے زیادہ بیوی کی اجازت نہیں۔

ایک اہم حقیقت | تعدد ازدواج کے سلسلہ میں ایک اہم حقیقت کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ ہمارے گھروں میں جوان بنیں، بیٹیاں یا اور ایسے رشتے کی عورتیں موجود ہوتی ہیں جن سے نکاح جائز نہیں۔ ہم ان جوان لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ دن رات گھلے ملے رہتے ہیں۔ لیکن ان مردوں یا عورتوں کے دل میں جنسی جذبہ کا شائبہ تک بھی پیدا نہیں ہوتا۔ اس ماحول میں زندگی کامل عفت و عصمت کی گزرتی ہے۔ اس دائرہ کے اندر جوان لڑکیوں اور غیر شادی شدہ عورتوں کو ان لڑکوں یا مردوں کی طرف سے پورا پورا اطمینان ہوتا ہے۔ انہیں ان کی طرف سے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لئے کہ یہ وہ دائرہ ہے جس میں ایک دوسرے سے نکاح جائز نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جس قدر یہ دائرہ وسیع ہوگا اسی قدر معاشرہ میں جنسی امن و عافیت ہوگی اور اسی قدر عورتوں کو مردوں کی طرف سے سکون اور اطمینان حاصل ہوگا۔

جب وحدت ازدواج کو بطور اصول تسلیم کر لیا جائے، تو جب ایک مرد کسی عورت سے شادی کر لے، اس کے بعد اس بیوی کی موجودگی میں دنیا کی ہر عورت سے اس مرد کا نکاح ناجائز قرار پاتا ہے۔ اس سے آپ دیکھئے کہ وہ دائرہ کس قدر وسیع ہو گیا جس میں جنسی امن و عافیت کی فضا عام ہوتی ہے اور جس میں عورتوں کو مردوں کی طرف سے کامل اطمینان اور بے خوفی ہوتی ہے (واضح ہے کہ ہم اس معاشرہ کا ذکر رہے ہیں جس میں زنا کو حرام قرار دیا گیا ہو) اس میں (مرد کی شادی کے بعد) نہ کوئی عورت اس مرد کی طرف اس خیال سے دیکھ سکتی ہے کہ یہ مجھ سے شادی کر لے۔ نہ وہ مرد کسی عورت پر اس خیال سے نظر ڈال سکتا ہے کہ وہ اس سے شادی کر لے۔ علاوہ بریں یہ بھی دیکھئے کہ اس شخص کی بیوی بھی کس قدر اطمینان کی زندگی بسر کرے گی۔ اسے معلوم ہے کہ اس کی موجودگی میں اس کا خاوند کسی عورت کے متعلق یہ دھیان بھی نہیں کر سکتا کہ وہ اس سے شادی کر لے گا۔ نہ ہی وہ کسی سے ناجائز تعلق پیدا کر سکتا ہے۔

لیکن اگر معاشرہ میں تعددِ ازدواج کی کھلی چھٹی ہو تو اس سے امن و سکون کی یہ ساری فضا، دھڑکنوں اور کاہشوں کا جہنم اور شوک اور شبہات کا دوزخ بن جاتی ہے۔ اس مرد کی بیوی کو ہر وقت دھڑکانگاہتا ہے کہ نہ معلوم یہ کس وقت دوسری بیوی لے آئے۔ جس عورت کا جی چاہے وہ اس مرد کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش میں لگ سکتی ہے کہ وہ اسے اپنی بیوی بنا لے۔ مرد، ہر عورت کی طرف جاذب نگاہ سے دیکھ سکتا ہے کیونکہ اس عورت کو اپنے نکاح میں لے آنا نہ کوئی جرم ہے نہ گناہ۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس فرق سے معاشرہ کا نقشہ کیا سے کیا بن جاتا ہے؟

قرآن کریم نے زنا کو حرام قرار دے کر اور وحدتِ ازدواج کو بطور اصول مقرر کر کے معاشرہ کی ان تمام خرابیوں کو جڑ بنیاد سے اکھیر دیا جن کی رُو سے عورت ہر مرد سے سہمی سہمی رہتی ہے۔ اس سے سکون اور اطمینان کی جنت بدوش فضا پیدا کر دی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مخصوص حالات میں تعددِ ازدواج کی ضرورت کو تسلیم کر کے معاشرہ کو ان تباہیوں سے بھی محفوظ کر لیا جن میں اس وقت یورپ اس بڑی طرح گھرا ہوا ہے۔

نزدول قرآن کے وقت دنیا کی قریب قریب ہر قوم میں غلامی کا رواج تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کی بنیادی تعلیمِ تکریم و مساواتِ انسانیہ ہے۔ وہ اسے مستقل قدر قرار دیتا ہے جس سے کسی صورت میں بھی انحراف نہیں کیا جاسکتا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں وہ غلامی جیسی انسانیت سوز لعنت کو کس طرح جائز اور روا قرار دے سکتا تھا۔ اس زمانے میں جنگ کے قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنایا کرتے تھے۔ قرآن کریم نے جنگ کے قیدیوں کے متعلق حکم دے دیا کہ انہیں بہر حال چھوڑنا ہوگا۔ **فَمَا مَّا مَّا بَعْدُ** **غلام اور لونڈیاں** | **دَائِمًا خِدَاءً** (۲۴/۴)۔ خواہ فدیہ لے کر یا خواہ احسان رکھ کر۔ اور جب تک وہ قیدیوں کی حیثیت سے تمہارے پاس رہیں گے ان سے انسانیت کا سلوک کیا جائے گا۔ کیونکہ جماعتِ مومنین تکریمِ آدمیت کی مستقل قدر کے خلاف کسی حالت میں بھی کچھ نہیں کر سکتی۔ یوں قرآن نے غلامی کا دروازہ بند کر دیا۔

لیکن اُس وقت عربوں کے معاشرہ میں غلام اور لونڈیوں کی بھرمار تھی۔ اگر قرآن انہیں فوراً نکال دینے کا حکم دے دیتا تو معاشرہ کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ اس لئے اس نے ایسے احکام و ضوابط دے دیے جن سے رفتہ رفتہ وہ تمام غلام اور لونڈیاں یا آزاد ہو جائیں یا مسلمانوں کے افرادِ خاندان بن جائیں۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں "مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ" کا ذکر آتا ہے ان سے مراد وہ غلام اور لونڈیاں ہیں جو اُس وقت وہاں کے معاشرہ میں موجود تھے۔ لہذا ان کے آزاد ہو جانے یا معاشرہ میں جذب ہو جانے کے بعد قرآن کی رُو سے غلاموں اور لونڈیوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تصور قرآن کی بنیادی تسلیم کے خلاف ہے۔

مرد اور عورت کے باہمی تعلقات کے سلسلہ میں 'قرآن کریم نے جو سب سے بڑا انقلابی تصور پیش کیا وہ جنسیات سے متعلق ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ کہنے کو تو انسان ہی کہتا ہے کہ میاں بیوی کا جنسی اختلاط، اولاد پیدا کرنے کے لئے ہوتا ہے، لیکن یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اس تعلق سے اولیں مقصود حفظِ نفس ہوتا ہے۔ عورت کو مرد نے اپنی جنسی خواہش کی تسکین کا ذریعہ سمجھ اور بنا رکھا ہے، اور شادی سے مقصود یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس تسکینِ نفس کو قانونی یا معاشرتی جواز حاصل ہو جائے۔ اس تصور نے کہ جنسی اختلاط سے مقصود حفظِ نفس ہے، تاریخِ انسانیت میں جس قدر تباہیاں پیدا کی ہیں، ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ زرا اور زمین کی طرح، زن بھی انسان کے لئے ایک مسئلہ (PROBLEM) بن گئی ہے، اور مبنی رہے گی جب تک انسان، جنسیت کے متعلق صحیح نظریہ قائم نہیں کر لے گا قرآن نے جنسیت کے متعلق صحیح نظریہ پیش کیا ہے۔

آپ حیوانات میں دیکھئے۔ جنسی اختلاط سے مقصد افزائشِ نسل ہوتا ہے۔ حفظِ نفس نہیں ہوتا۔ دیگر امور کی طرح، اس کا کنٹرول بھی فطرت نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ حیوانات میں جنسی خواہش صرف اس وقت بیدار ہوتی ہے جب فطرت کے مقرر کردہ پروگرام کے مطابق استقرارِ حمل کا وقت آتا ہے۔ جب یہ مقصد پورا ہو جاتا ہے تو زرمادہ دونوں میں یہ جذبہ خاموش ہو جاتا ہے۔ انہیں اس پر اختیار ہوتا ہے کہ لے سے جب جی چاہے از خود بیدار کر لیں۔ نہ اس پر قابو کہ اس کے بیدار ہونے کے بعد اس کی تسکین نہ کریں، ان کے سلسلہ میں، غالب کے الفاظ میں، یہ وہ آتش ہے کہ لگائے نہ لگے، اور بجھائے نہ بنے

حیوانات کی طرح انسانوں میں بھی، افزائشِ نسل کا ذریعہ جنسی اختلاط ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جنسی اختلاط کا تعلق انسان کی طبعی زندگی سے ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، انسان اور دیگر حیوانات میں فرق یہ ہے کہ حیوانات مجبور پیدا کئے گئے ہیں اور انسان، صاحب اختیار و ارادہ ہے۔ انسان اور کتا دونوں جانتے ہیں کہ سکھیا ان کے لئے موجبِ ہلاکت ہے۔ کتا اپنی مرضی سے کبھی سکھیا نہیں کھاتا اس لئے کہ اسے اس کا اختیار ہی نہیں دیا گیا کہ وہ اپنی مرضی سے جس چیز کو چاہے کھالے اور جس سے جی چاہے پرہیز کرے لیکن انسان، اپنی مرضی سے سکھیا کھا کر خود کشی کر سکتا ہے۔ انسان کو اسی قسم کا اختیار، جنسی اختلاط کے بارے میں بھی دیا گیا ہے۔

انسان کا صاحب اختیار و ارادہ ہونا، اس کے لئے ہزار نفع بخشوں کا باعث ہے۔ لیکن دوسری طرف، اس کا یہی اختیار، اس کے لئے ہلاکت اور تباہی کا موجب بھی ہے۔ کتے کی یہ مجبوری کہ وہ سکھیا کھا نہیں سکتا، اسے ہلاکت سے

تو محفوظ رکھتی ہے، لیکن اس سے وہ سکھیا کے بے شمار فوائد سے بھی محروم رہ جاتا ہے۔ انسان اگر سکھیا قانونِ فطرت کے مطابق استعمال کرے تو اس سے بہت سے فائدے حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن یہ اگر اسے قانونِ فطرت کے خلاف استعمال کرے تو سکھیا اس کی ہلاکت کا موجب بن جاتا ہے۔ یعنی انسانی اختیار و ارادہ کا صحیح استعمال اس کے حق میں موجبِ رحمت ہوتا ہے اور اس کا غلط استعمال باعثِ ہلاکت۔

جنسی اختلاط کے معاملہ میں حیوانات کو مجبور پیدا کرنے سے ان کی نسل کے مسئلہ کو فطرت نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ وہ فطرت کے پردگرم کے مطابق بچے پیدا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ وہ نہ اس میں کمی کر سکتے ہیں نہ بیشی۔ وہ اس زمانے میں جسے فطرت نے ان کے لئے متعین کیا ہے، نہ اختلاط (فلہذا استقرارِ حمل) سے رُک سکتے ہیں اور نہ ہی اس زمانے کے علاوہ دیگر اوقات میں اختلاط کر سکتے ہیں۔ لیکن فطرت نے انسان کو اس بارے میں بھی آزادی دی ہے کہ وہ اپنی مصلحت کے مطابق افزائشِ نسل پر خود کنٹرول رکھے یعنی جتنے بچے پیدا کرنا چاہے کرے۔ اس سے زیادہ پیدا کرنے پر اپنے آپ کو مجبور نہ پاتے۔

اسے اختیار تو دیا گیا تھا اس مقصد کے لئے، لیکن اس نے جنسی اختلاط کو ذریعہ سمجھ لیا اپنے حظِ نفس کا۔ پھر اس سلسلہ میں وہ تباہیاں مچائیں کہ تو بہ بھلی! اس نے جنسیات کو اس کے لئے ایسا مسئلہ (PROBLEM) بنا دیا جس کا کوئی حل ہی اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ انسانی اختیار و ارادہ کا غلط استعمال، اس کے لئے کیا کیا مشکلات پیدا کر دیتا ہے، اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے اس سے موزوں تر مثال نہیں پیش کی جاسکتی۔ پہلے اس نے اپنی غلطی اور جذبات پرستی کے ہاتھوں، فطرت کے ایسے سادہ سے پردگرم کو اپنے لئے ایک مسئلہ بنا لیا اور پھر اس مسئلہ کے حل کی تلاش میں ایسے ایسے الجھاؤ پیدا کئے کہ الف لیلہ کے شاہزادہ کی طرح ان "بھول بھلیاں" میں ہمیشہ کے لئے کھو کر رہ گیا۔ حتیٰ کہ فریڈ اور اس کے مکتب فکر نے یہاں تک کہہ دیا کہ جنسیات وہ محور ہے جس کے گرد انسان کی ساری دنیا گردش کرتی ہے، حتیٰ کہ ماں اور بچہ کی باہمی کشش اور اس کے ذہن کے تراشیدہ "خدا" اور بندے کا تعلق بھی، اس کے جنسی تاثرات ہی کا رہن منت ہے۔ اسی سلسلہ میں یہ نظریہ پیدا کیا گیا کہ جنسی جذبہ بھوک اور پیاس کی طرح، طبیعی تقاضا ہے جس کی تسکین نہایت ضروری ہے۔ اگر اس تقاضے کو دبا دیا جائے تو اس سے ہزار خرابیاں (اور اعصابی بیماریاں) پیدا ہوتی ہیں اور اسے جس قدر زیادہ کھل کھیلنے کا موقع دیا جائے، اسی قدر انسانی شعور کی گرہیں کھلتی ہیں۔ حالانکہ یہ حقیقت بالکل بدیہی ہے کہ جنسی تقاضا، بھوک اور پیاس کی طرح طبیعی نہیں، مثلاً آپ

پیدائش پر کنٹرول

عجیب مصیبت

جنسی جذبہ یعنی تقاضا نہیں

کسی کام میں منہمک بیٹھے ہوں۔ جب جسم کو پانی کی ضرورت محسوس ہوگی تو پیاس کا احساس بیدار ہونا شروع ہو جائے گا۔ شروع شروع میں یہ احساس نحیف سا ہوگا۔ لیکن اگر آپ پانی نہیں پئیں گے تو اس کی شدت بڑھنا شروع ہو جائے گی اور رفتہ رفتہ اس حد تک بڑھ جائے گی کہ آپ کے لئے کام کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اگر آپ اس پر بھی پانی نہیں پئیں گے تو بیمار ہو جائیں گے اور آخر الامر آپ کی موت واقع ہو جائے گی۔ اسے کہتے ہیں "طبیعی تقاضا" اس کے برعکس جنسی تقاضا کا یہ عالم ہے کہ وہ کبھی بیدار نہیں ہوتا، جب تک آپ خود اپنے خیال سے اسے بیدار نہ کریں۔ اسے خیال سے بیدار کرنا پڑتا ہے اور خیال ہی سے وہ سرد بھی ہو سکتا ہے۔ اور یہ بھی غلط ہے کہ اگر اس تقاضا کی تسکین نہ کی جائے تو انسان بیمار ہو جاتا ہے اور آخر الامر اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ کتنے ہی لوگ میں جنہوں نے تمام عمر اس تقاضا کی تسکین نہیں کی اور اس کے باوجود ان کی صحت پر کوئی مضر اثر نہیں پڑا۔ مضر اثر پڑتا تو ایک طرف ان کی صحت اور زیادہ اچھی ہوتی ہے۔ اس کا مضر اثر اس وقت پڑتا ہے جب آپ اپنے خیالات کے ذریعے بار بار اس احساس کو بیدار کرتے رہیں۔ اگر آپ کے خیالات اس طرف نہ جائیں تو اس سے انسانی صحت اور خیالات پر بڑا خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ اس کی تائید میں بڑے بڑے ڈاکٹروں اور نفسیات اور جنسیات کے ماہروں کی شہادت موجود ہیں۔ اور سب سے بڑی شہادت تو انسان کا خود اپنا تجربہ ہے جس کا جی چاہے اسے کر کے دیکھ لے۔ شرط یہ ہے کہ اپنے خیالات کو اس طرف نہ آنے دے۔

لہذا، جنسی جذبہ طبیعیاتی تقاضا (PHYSICAL NECESSITY) نہیں نفسیاتی محرک (PSYCHOLOGICAL URGE)

ہے جسے انسان خود بیدار کرتا ہے۔ اگر یہ اسے اپنے ریڈیو گرام کے مطابق، افزائش نسل کے لئے بیدار کرتا ہے،

تو اس کا نتیجہ خود اس کے اور انسانیت کے لئے منفعت بخش ہوتا ہے۔ اور اگر اسے محض حفظ نفس کے لئے بیدار کرتا، اور اس کی تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے تو اس سے یہ نفسیاتی محرک ہے۔

انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی تباہیاں آتی ہیں۔ اور انسان کبھی نہیں سوچتا کہ وہ اتنی سی وقتی لذت کی کتنی بڑی قیمت ادا کر رہا ہے۔ غذا کا مقصد جسم کی پرورش ہے۔ اس کی لذت ثانوی چیز ہے جو شخص محض لذت کی خاطر کھائے اور اپنی صحت تباہ کرنا چلا جائے، اسے پاگل نہیں تو اور کیا کہا جائے گا۔ اسی طرح، جنسی اختلاط کا مقصد افزائش نسل ہے۔ لذت ثانوی چیز ہے۔ جو شخص محض لذت کی خاطر جنسی اختلاط کی طرف جائے اور اس طرح اپنے لئے اور عالم انسانیت کے لئے ہزار قسم کی پیچیدگیاں پیدا کر کے معاشرہ کو جہنم بنا جاتا ہے، اس کی دیوانگی میں بھی کیا شبہ ہو سکتا ہے! لیکن اس کا کیا علاج کہ انسان نے ہزار ہا سال سے یہ غلط روش اختیار کر کے اس دیوانگی کو کمال ہوش سمجھ رکھا ہے۔ اور اس کا خمیازہ بھی بھگت رہا ہے۔

قرآن کریم نے انسان کے اس (خود پیدا کردہ) مشکل ترین مسئلہ کا حل چار لفظوں میں پیش کر دیا جب کہا کہ نَسَاءُ لَكُمْ حَرَّتٌ لَكُمْ فَأَتُوا حَرَثَكُمْ أَوْ شِئْتُمْ (۲/۲۲۳) ”تمہاری عورتیں تمہارے لئے بمنزلہ کھیتی کے ہیں۔ تم اپنی کھیتی میں اپنے پروگرام کے مطابق آؤ۔ یہاں کھیتی کی مثال نے بات بالکل واضح کر دی۔ کسان کھیتی میں اس وقت تخم ریزی کرتا ہے جب اسے فصل پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔ وہ محض جی بہلانے کی خاطر بل نہیں چلاتا۔ نہ بیج بکھرتا ہے۔ لہذا، میاں بیوی کے جنسی اختلاط سے مقصد اولاد پیدا کرنا ہے۔ نہ کہ حصول لذت۔ جنسی اختلاط ہونا ہی اس وقت چاہیے جب اولاد پیدا کرنا مقصود ہو۔ اور اولاد اپنے پروگرام کے مطابق پیدا کرنی چاہیے۔ باقی رہا جنسی جذبہ کا طبعی تقاضا کی طرح نہ ہونا، سو قرآن نے اسے بھی واضح کر دیا۔ کھانے پینے کے معاملہ میں اس نے بعض چیز کو حرام قرار دیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اگر کبھی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ کچھ اور کھانے کا نہ ملے اور تمہاری حالت اضطراری ہو جائے تو اس وقت اجازت ہے کہ تم حرام چیزوں کو بقدر ضرورت کھاؤ (۲/۱۷۳)۔ اس کے برعکس

اضطراری حالت

جنسی جذبہ کے سلسلہ میں کہا ہے کہ وَ لَيْسَتْ حَفِيفِ الدِّينِ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا (۲۲/۲۳) ”جو لوگ نکاح کا سامان نہ پائیں، انہیں چاہیے کہ وہ ضبط نفس سے کام لیں“ یعنی قرآن نے کھانے پینے کے معاملہ میں تو اضطراری حالت کو تسلیم کیا ہے، لیکن جنسی تقاضے کے سلسلے میں اسے تسلیم نہیں کیا۔ اس لئے کہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، جنسی جذبہ طبعی تقاضا نہیں محض نفسی تحریک ہے جس کا بیدار کرنا انسان کے اپنے خیالات پر منحصر ہے۔ اور جو بات انسان کے اپنے اختیار کی ہو اس میں اضطراری حالت کا کیا سوال؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے زنا کو حرام قرار دیا ہے اور کسی حالت میں بھی اس کی اجازت نہیں دی۔ اس کے نزدیک یہ جرم بڑا سنگین ہے جس کی سزا سخت ہے۔ مغربی معاشرہ میں اگر ایک بالغ

زنا حرام ہے

(غیر شادی شدہ) جوڑا، بلا نکاح، باہمی رضامندی سے جنسی اختلاط کر لیتا ہے تو اسے جرم قرار نہیں دیا جاتا۔ لیکن قرآن اسے بھی جرم ٹھہراتا ہے۔ اس لئے کہ زنا کا محرک جذبہ حصول لذت ہوتا ہے اولاد پیدا کرنا نہیں ہوتا۔ مغرب میں مذکورہ بالا شکل میں اگر لڑکی کو حمل قرار پا جائے اور وہ جوڑا اس کے بعد شادی کرنے کو اس بچے کو قانوناً جائز تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ (ان کے نزدیک) ایسی صورت میں، اختلاط کا مقصد خالی حصول لذت نہیں رہتا۔ پیدائش اولاد بھی اس میں آجاتی ہے۔ یعنی ان کے نزدیک بھی، محض حصول لذت کی خاطر جنسی اختلاط میں، اور اس اختلاط میں جس کا نتیجہ اولاد ہو، فرق ہوتا ہے۔ قرآن اسے بھی زنا قرار دیتا ہے کیونکہ اس میں درحقیقت مقصد حصول لذت ہی تھا۔ یہ محض ایک حادثہ تھا جس کی وجہ سے حمل قرار پا گیا۔ اس کے نزدیک نکاح سے مفہوم ایسا معاہدہ ہے جس کی رو سے ایک جوڑا، باہمی رفاقت کی زندگی بسر کرنے کا معاہدہ کرتا ہے۔ اس رفاقت میں ایسی نسل کی افزائش بھی آجاتی ہے جو صحیح تربیت پا کر

شرفِ انسانیّت کی اہل قرار پائے۔ وہ ایسے اختلاط کو جس میں مادہٴ تولید کو محض "بہا دیا جائے" مقصودِ نکاح کے خلاف قرار دیتا ہے۔ (۴/۲۲۱)

اس وقت دنیا ایک ایسے مسئلہ سے دوچار ہے جو اپنی اہمیت کے اعتبار سے کسی صورت میں بھی "ایٹم بم" کے خطرہ سے کم نہیں۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ دنیا کی آبادی اس تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ اندیشہ ہے کہ کچھ وقت کے بعد زمین کی پیداوار کھانے والوں کے لئے کافی نہیں ہو سکے گی۔ دنیا کی مختلف حکومتیں پیداوار بڑھانے کے سلسلہ میں بھی بہت کچھ کر رہی ہیں لیکن اندازہ یہی ہے کہ پیداوار میں اضافہ کی رفتار آبادی کی رفتار کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے سوچا یہ گیا ہے کہ آبادی کے بے تحاشا بڑھنے کی روک تھام کی جائے۔ اس مقصد کے لئے مانع حمل ادویات و آلات ایجاد کئے جا رہے ہیں اور نوجوان عورتوں اور مردوں کو ان کے استعمال پر آمادہ کیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ تدابیر کما حقہ کامیاب نہیں ہو رہی ہیں۔ ایک تو یہ ہر حالت میں موثر ثابت نہیں ہوتیں۔ دوسرے ان پر خرچ بہت آتا ہے۔ پھر ان کے دور رس نتائج و عواقب کے متعلق طبی دنیا ابھی تک کسی حتمی فیصلہ پر نہیں پہنچی جس کی وجہ سے ان کی تائید و تردید میں بہت کچھ کہا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور اس کے ساتھ آبادی برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ اس سوال نے دنیا کے اربابِ فکر و نظر کے لئے عجیب پریشانی پیدا کر رکھی ہے۔

لیکن آپ نے غور کیا ہے کہ اس پریشانی کی بنیادی وجہ کیا ہے؟ جنسی اختلاط کے متعلق یہ نظریہ کہ اس کا مقصد حصولِ لذت ہے۔ مانع حمل تدابیر پیش کرنے اور ان پر عمل کرنے والے دونوں یہ چاہتے ہیں کہ جنسی اختلاط سے حظِ نفس تو حاصل ہو جائے لیکن اولاد پیدا نہ ہو۔ جب تک انسان اپنے اس غلط نظریہ میں تبدیلی نہیں پیدا کرے گا اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل کبھی نہیں مل سکے گا۔ یعنی یہ تبدیلی کہ، جنسی اختلاط ہونا ہی اس وقت چاہئے جب اولاد پیدا کرنا مقصود ہو۔ اگر یہ نظریہ اختیار کر لیا جائے تو نہ صرف آبادی کے مسئلہ کا اطمینان بخش حل مل جائے گا بلکہ "عورت" سے متعلق اور بہت سے مسائل بھی حل ہو جائیں گے۔

چونکہ جنسی اختلاط سے متعلق غلط نظریہ قرنہا قرن سے متواتر چلا آ رہا ہے اس لئے اس میں تبدیلی بظاہر مشکل نظر آتی ہے۔ لیکن یہ ناممکن نہیں۔ وہ کون سا نظریہ ہے جس میں صحیح تعلیم و تربیت سے تبدیلی نہیں پیدا کی جاسکتی؟ اس وقت بھی دنیا کی ہر قوم اور ہر قبیلہ میں جنسی اختلاط کے سلسلہ میں کوئی نہ کوئی پابندی ضرور ملے گی جس پر غیر شعوری طور پر عمل ہو رہا ہوگا۔ مثلاً یہ کہ بہن اور بھائی میں ازدواجی رشتہ نہیں ہو سکتا، یا ماہواری ایام کے دوران میاں بیوی میں جنسی اختلاط جائز نہیں۔ ان ضوابط کی غیر شعوری طور پر پابندی اس لئے ہو رہی ہے کہ یہ باتیں بچوں کی تعلیم

تربیت میں داخل ہیں۔ اسی طرح اگر یہ نظریہ بھی تعلیم و تربیت میں داخل ہو جائے کہ جنسی اختلاط صرف افزائش نسل کے لئے ہے، تو دو چار نسلوں کے بعد اس پابندی پر بھی غیر شعوری طور پر عمل ہونا شروع ہو جائے گا۔ بالخصوص اس لئے کہ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، جنسی جذبہ بیدار ہی خیالات کے تابع ہوتا ہے۔ لہذا، جنسیات سے متعلق کسی نظریہ میں اصلاح یا تبدیلی کے لئے، خیالات میں اصلاح یا تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

تعلیم و تربیت کی رُو سے اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ معاشرہ میں ایسی فضا پیدا کی جائے جس میں نوجوانوں کے خیالات از خود جنسیات کی طرف منتقل نہ ہوتے چلے جائیں۔ جنسیات کے متعلق موجودہ غلط نظریہ کا نتیجہ یہ ہے کہ ساری فضا ایسے جرائم سے بھر پور رہتی ہے جو جنسی جذبہ کی بیداری کے لئے زبردست محرک ہوتے ہیں۔ عورتوں میں جذبہ نمائش حسن اور اس کے لئے متنوع طرق و اسالیب اور قسم قسم کے مواقع و تقاریب، بیباک جنسی لٹریچر، اور سینما کی فلمیں، پست درجہ کے عشیقہ گانے، سب سے بڑا کہ خود زندگی کے متعلق یہ تصور کہ انسانی زندگی بس طبعی زندگی ہے۔ حیوانی سطح سے اوپر کوئی اور سطح نہیں۔ نہ ہی کوئی ایسی مستقل اقدار ہیں جن کا تحفظ وجہ شرف انسانیت ہے۔ ان مختلف عناصر کا مجموعی اثر یہ ہے کہ نوجوانوں کو اپنے خیالات پر کنٹرول ہی نہیں رہتا۔ اور جب خیالات پر کنٹرول نہ ہو تو جنسیات پر کیا کنٹرول ہو گا؟

قرآن کریم ایسا جامع پروگرام تجویز کرتا ہے جس کے مطابق عمل کرنے سے انسان کے نظریات و تصورات اور خیالات و معتقدات میں صحیح تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے اور معاشرہ کی فضا ان جرائم سے پاک اور صاف رہتی ہے جو جذبات میں غلط تحریکات کا موجب بنتے ہیں۔ مثلاً

(۱) وہ زندگی کے متعلق یہ بنیادی تصور دیتا ہے کہ زندگی حیوانی سطح کی نہیں۔ اس سے بلند، انسانی سطح کی ہے۔

جس کی نشوونما ان مستقل اقدار کے تحفظ سے ہوتی ہے جو وحی کے ذریعے عطا ہوئی ہیں۔ جفا^ط عصمت بھی ایک مستقل قدر ہے۔

قرآنی تصورات

(۲) وہ عورت کے دل سے یہ غلط تصور نکالتا ہے کہ وہ مرد کے لئے پیدا کی گئی ہے اس لئے اس کا مقصد حیات

صرف یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح مرد کی نگاہوں میں جاذب بنی رہے۔ وہ اسے بتاتا ہے کہ اس کی الگ، جداگانہ، منفرد حیثیت ہے اور اس کی زندگی کا منہتی بھی وہی ہے جو مرد کی زندگی کا ہے۔ انسان ہونے کی بہت سے مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں۔ ان میں فرق صرف ان طبعی خصوصیات کا ہے جو افزائش نسل کے سلسلہ میں عورت کے لئے ضروری ہیں۔

SEX AND CULTURE میں بڑے سلیقہ سے پیش کیا ہے۔ وہ اپنی کتاب کے دیباچہ میں لکھتا ہے۔
اپنی تحقیقات کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ انسانوں کا کوئی گروہ ہو اس کی تمدنی
سطح کا انحصار دو چیزوں پر ہے۔ ایک ان لوگوں کا نظام اور دوسرے وہ توانائی جو ان حدود و قیود کی
بنیاد پر حاصل ہوتی ہے جو اس گروہ نے جنسی تعلقات پر عائد کر رکھی ہوں۔ (P-XIV)
وہ آگے چل کر لکھتا ہے:-

اگر کسی قوم کی تاریخ میں آپ دیکھیں کہ کس وقت اس کی تمدنی سطح بلند ہو گئی تھی یا نیچے گر گئی تھی تو تحقیق
سے معلوم ہو گا کہ اس قوم نے اپنے جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کی تھی جس کا نتیجہ اس کی تمدنی سطح
کی بلندی یا پستی تھا۔ (صفحہ ۳۰۲)
وہ اسی قبائل کی تمدنی سطح کے مطالعہ کے بعد جن نتائج پر پہنچا ہے وہ حسب ذیل ہیں:-
(i) جن قبائل نے شادی سے قبل زمانے میں جنسی تعلقات کی کھلی آزادی دے رکھی تھی وہ تمدن کی پست ترین سطح
پر تھے۔

(ii) جن قبائل میں زمانہ قبل از نکاح میں جنسی تعلقات پر پھوڑی بہت پابندیاں عائد کی گئیں وہ تمدنی سطح کے
درمیانی درجے پر تھے۔

(iii) تمدن کی بلند ترین سطح پر صرف وہ قبائل تھے جو شادی کے وقت عفت و بکارت کا شدت سے تقاضا کرتے
تھے اور زمانہ قبل از نکاح میں جنسی تعلق کو جرم قرار دیتے تھے۔ (صفحہ ۳۰۰ : ۳۲۵)

ان نتائج کو پیش کرنے کے سلسلہ میں وہ لکھتا ہے کہ
نفسیاتی تحقیق سے ظاہر ہے کہ جنسی تعلقات پر حدود اور پابندیاں عائد کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم میں
وقت فکر و عمل بہت بڑھ جاتی ہے۔ نیز محاسبہ خویش کی صلاحیت بھی۔ (صفحہ ۳۱۶)

اس کے برعکس

جو قوم اپنے مردوں اور عورتوں کو آزاد چھوڑے کہ وہ جنسی خواہشات کی تسکین جس طرح جی چاہے کر لیں ان میں
فکر و عمل کی قوتیں مفقود ہو جاتی ہیں چنانچہ رومیوں نے ایسا ہی کیا۔ وہ حیوانوں کی طرح بلا قیود جنسی جذبات کی تسکین
کر لیا کرتے تھے نتیجہ یہ کہ ان کے پاس کسی اور کام کے لئے توانائی ہی باقی نہ رہی۔ (صفحہ ۳۰۸)

وہ اپنی کتاب کا خانہ ان الفاظ پر کرتا ہے:-

اگر کوئی معاشرہ چاہتا ہے کہ اس کی تخلیقی توانائیاں مدتِ مدید تک، بلکہ ابدالآباد تک قائم اور آگے بڑھتی رہیں تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے اپنی تخلیق نو کرے۔ یعنی پہلے اپنے مردوں اور عورتوں کو قانوناً مساوات دے اور پھر اپنے معاشرتی اور معاشی نظام میں اس قسم کی تبدیلیاں کرے جن سے معاشرہ میں جنسی اختلاف کے مواقع ایک مدتِ مدید تک، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، کم از کم حد تک محدود رہیں۔ اس طرح معاشرہ کا رُخ ثقافتی اور تمدنی ارتقار کی طرف مڑ جائے گا۔ اس کی روایات شاندار ماضی اور درخشندہ مستقبل کی حامل ہوں گی۔ وہ تمدن تہذیب کے اس بلند مقام تک پہنچ جائے گا جس پر آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔ اور انسانی توانائیاں اس کی ان روایات کو ایسے انداز سے صیقل کرتی جائیں گی جو اس وقت ہمارے حیطہ ادراک میں بھی نہیں آ سکتا۔

(صفحہ ۴۳۲)

قرآن کریم، عورت کو معاشرہ میں صحیح مساواتی مقام دے کر، جنسی تعلقات پر ایسی پابندیاں عائد کرتا ہے جن سے انسانی معاشرہ ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے، بلند سے بلند تر سطح تک پہنچتا چلا جاتا ہے۔ (۸۳/۱۹)

